انجمن اساتذہ حیدرآباد دکن کا

سہ ماہی رسالہ

حیدرآباد ٹیچر

مرتبہ

سید ندیم الحسن رضوی بی اے

دفتر انجمن اساتذہ بلدہ واقع صدر مہتممی تعلیمات سے شائع ہوا

مطبوعہ دار الطبع سرکار عالی

اعتذار

عین وقت پر ایک ناگہانی دشواری اور مجبوری
کی وجہ سے اشاعت ہذا میں بعض اہم مضامین غور و
تنقیح طلب رہ گئے۔ اس قسم کے تلخ واقعات موقت الشیوع
رسائل کو عموماً پیش آیا کرتے ہیں جو ہر طرح قابل نظر اندازی ہیں

مدیر

شبیہ اقدس و اعلیٰ حضور سلطان العلوم خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ

سال و فال و مال و حال و اصل و نسل و بخت و تخت:

بادت اندر ہر دو گیتی بر قرار و بر دوام
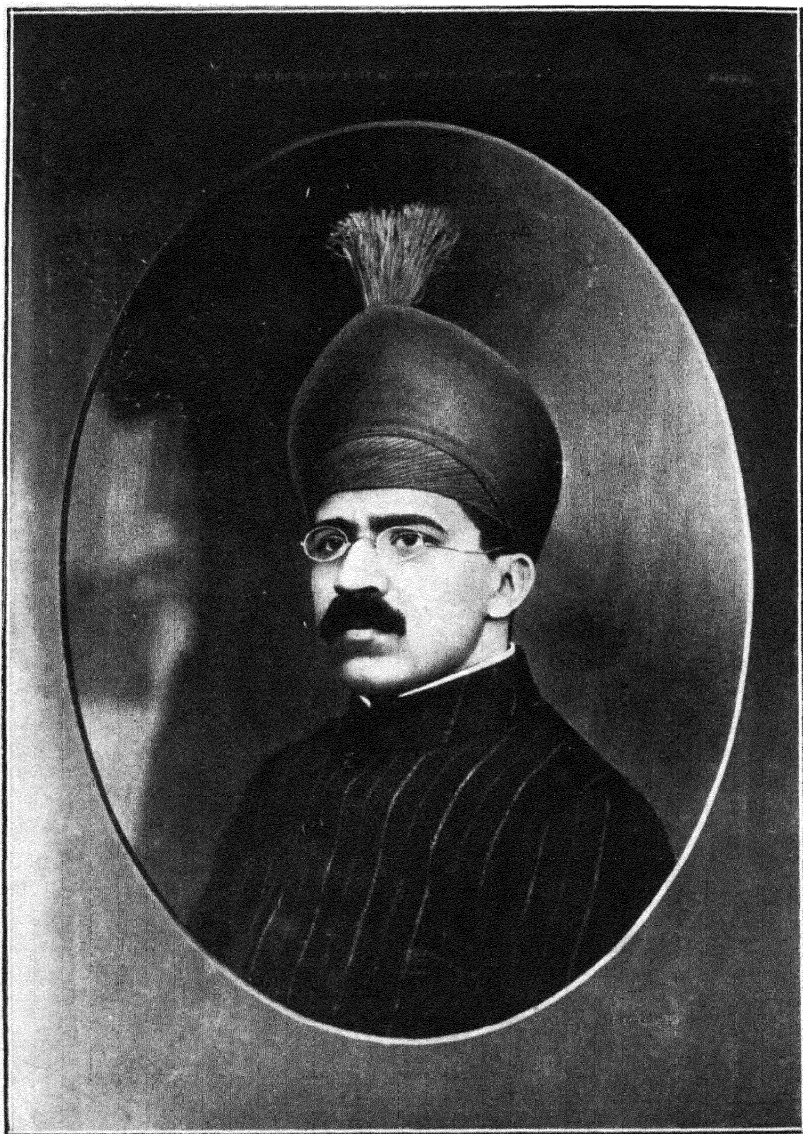
سال خرم، فال نیکو، مال وافر، حال خوش،

اصل ثابت، نسل باقی، تخت عالی، بخت رام

آمین یا الٰہ العالمین

عثمان علی بفر شهی بی همال باد
روشن بہ رای ثاقب او هر کمال باد

مسرور باد طرب اعوان او مدام
بدخواه ملک روسیه و پایمال باد

آنانکه زو عوائد آمال بسته اند
انجام کار جمله بحسن و مآل باد

لب تشنگان بزم امل را بدور او
سیراب تمام ز جام زلال باد

سرسبز باد ملک بیمن حمایتش
وز همتش عروس جهان را جمال باد

پیشینیان او همه ممتاز بوده اند
فرزندان شاه فزون از خیال باد

دادار دار دولتش صد و سی سال برقرار
وز دست او تقاطر ابر نوال باد

تاثیر خاکسار چه آرد بجز دعا
یارب جهان نثار شه خوش خصال باد

نایم الحسن تاثیر

عطیہ

(نواب مسعود جنگ بہادر بی۔ اے (آکسن) بیرسٹرایٹ لا ناظم تعلیمات ممالک محروسہ سرکار عالی)

بہترین طریقہ کسی قوم کے درجۂ فضل و کمال کی تحقیق کا یہ ہے کہ اُس نے اپنے بےکس و بےبس افراد یعنی لڑکوں، عورتوں اور معذروں کی بہتری کے واسطے جو کچھ کیا ہے اسے معلوم کرلیا جائے لیکن اگر ہندوستان پر ہم اس اُصول کا اطلاق کریں تو مجھے اندیشہ ہے کہ دنیا کے فاضل اقوام میں جو درجہ ہمارا قرار پائیگا وہ کچھ زیادہ وقیع نہوگا!

میں تو اس طبقے سے ہوں جسکا ایقان ہے کہ آج ہندوستان میں کوئی شخص ان افراد سے بڑھ کر ملک کو نفع نہیں پہنچا رہا ہے جنہوں نے معلمی کے شریف پیشہ کو اپنا شعار بنایا ہے اسلئے کہ نوخیز نسلوں کی سیرت کے ڈھالنے کا اہم کام سوسائٹی کیطرف سے اگر کسی کو تفویض کیا گیا ہے تو وہ اساتذہ ہی ہیں چنانچہ فی الحقیقت دنیا کے دیگر ممالک کیطرح ہمارے ملک میں بھی طبقۂ اساتذہ پر من حیث الجماعت ایک بڑی بھاری زبردست ذمہ داری عائد ہوتی ہے؛ دیکھنا یہ ہے کہ کیونکر یہ حضرات اس ذمہ داری سے کمال وعزت کیساتھ عہدہ برآ ہوسکتے ہیں۔

کئی برس کا تذکرہ ہے کہ میں ایک مدرسہ کا صدر تھا اور روزانہ طلبہ سے سابقہ رہا کرتا تھا، اس زمانہ میں بطور ایک ذاتی تجربہ کے مجھے اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑا کہ جس امر پر میں خود بہ پوری پوری دسترس نہیں رکھتا اسے طلبہ تک پہونچانا میرے امکان سے خارج ہے، یہ حقیقت جسمانی اور روحانی دونوں امور پر یکساں صادق آتی ہے، مجھ پر منکشف ہوا کہ اگر طلبہ کو قوی کرنا مقصود ہے تو پہلے میرا قوی ہونا ضرور ہے اور اگر میں چاہتا ہوں کہ اُن میں حب وطن پیدا ہو تو میرا محبّ وطن ہونا لازمی ہے۔

یوں مجھے اس نہایت ہی اہم عمل کا وقوف ہوا جو معلمین کی شخصی سیرت اور جذبات سے اُن ہستیوں پر مترتّب ہوتا ہے، جو طلبہ کی حیثیت سے اُنسے متعلق رہتی ہیں۔

پس اولین فرض ایک معلم کا جو اپنی خدمت کمال کے ساتھ انجام دینا چاہتا ہے اس کی تحقیق کرنا ہے کہ جن نقائص کو وہ طلبہ کی سیرت سے رفع کرنے کی کوشش کرتا ہے، آیا خود اپنے وجود سے انکو مرتفع کرنے میں وہ کامیاب ہوا ہے؟ تاوقتیکہ یہ نہ ہو، وہ بندشیں جو معلم کو متعلمین سے مربوط رکھتی ہیں، اسی قدر ڈھیلی اور فضول رہیں گی، جسقدر ہمارے ملک کے اکثر مدارس میں مجھے اندیشہ ہے کہ اسوقت موجود ہیں۔

زمانۂ قدیم میں جبکہ "چیلا" اپنے "گرو" کے گھر کے ایک فرد کی حیثیت سے رہتا تھا معلم کو بہ نسبت آجکل کے بہت زیادہ فرصت ملتی تھی کہ وہ طلبہ کو صرف ادبی تعلیم ہی نہیں،

بلکہ ان کی سیرت کے ڈہالنے کا ناگزیر کام بھی انجام دے لیکن فی زماننا گو معلم کو وقت
تو قلیل ملتا ہے مگر اس کے مفوضہ فرض کی اہمیت علی حالہ ہے! اس صورت میں
اس کے لئے چارۂ کار کیا ہے؟ میں اسکا یہ جواب دونگا کہ اسکو چاہئے کہ جن اوصاف
وجذبات کی بالیدگی وہ اپنے طلبہ میں چاہتا ہے ان کو اولاً اپنے اندر اس شکل
میں نشو و نمو دے کہ مقابلتاً وہ قدیم "گرو" کے اوصاف سے قوی تر ہوں یا جائے کہ
عقیدہ کی طاقت جس پر کل علم قائم کی بنیاد ہے اور خلوص کی قوت جو انسانی تعلقات
سے کذب و ریا کو قطعی فنا کر دیتی ہے اس کے لئے بدرقۂ عمل ہوں یہی امور ہیں جنمیں
ہمارے اساتذہ کو ان متعدد مسائل کا حل ملیگا جن سے وہ آج دوچار ہیں۔

دی حیدرآباد ٹیچر

(از جناب مولوی سید علی اکبر صاحب۔ صدر مہتمم تعلیمات بلدہ وضلع اطراف بلدہ)

انجمن اساتذہ بلدہ کو قائم ہو کر سوا سال سے زیادہ عرصہ ہوتا ہے۔ اس کے قیام کی غرض وغایت یہ تھی کہ بلدہ کے مختلف مدارس کے اساتذہ میں اتحاد عمل پیدا کیا جائے اور تعلیمی امور میں ان کو تبادلۂ خیالات اور ایک دوسرے کے تجربوں سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملے۔ انجمن سے جو توقعات وابستہ کی گئی تھیں وہ بتدریج پوری ہوتی جارہی ہیں

اصول نیز فن تعلیم سے واقفیت مدرس کیلئے ایک اساسی ضرورت ہے۔ لیکن ہمارے ہاں کے مدارس میں ٹرینڈ اساتذہ کے مقابلہ میں غیر ٹرینڈ اساتذہ کی تعداد بہت زیادہ ہے، انجمن اساتذہ کے ذریعے سے نہ صرف غیر ٹرینڈ مدرسین کو ان کے پیشہ کے متعلق مفید معلومات حاصل ہوتی ہیں بلکہ ٹرینڈ مدرسین کو بھی اپنی معلومات تازہ رکھنے کا موقع ملتا ہے اور اسطرح سے مدارس میں طرز تعلیم کی اصلاح میں بہت بڑی مدد ملتی ہے مزید براں اساتذہ میں اتفاق پیدا کرکے انجمن انکی قوت، پوزیشن اور اثر کو ترقی دینے کا ایک زبردست آلہ بن سکتی ہے۔

اسوقت تک انجمن کا کام نہایت خاموشی سے ہوتا رہا حتی کہ انجمن کی شاخوں
میں کسی شاخ کو یہہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا کہ دوسری شاخون میں کیا کام ہورہا ہے اس لئے
ہر شاخ کی کارروائیوں سے جملہ اراکین و دیگر اشخاص کو جو تعلیمی امور سے دلچسپی رکھتے ہیں با خبر رکھنے
اور ملک کی مختلف مفید تعلیمی تحریکوں کو باہم مربوط کرنے کیلئے یہ رسالہ جاری کیا گیا ہے
ہمکو پوری امید ہے کہ اس رسالہ کے اجرا کے بعد انجمن کا دائرہ اثر پہلے سے زیادہ
وسیع اور مفید ہو جائیگا۔

تعلیمی دیانت

از سید ندیم الحسن رضوی. بی۔ اے۔ (عثمانی)

ایک صحیح اور باقاعدہ معلمانہ کریکٹر میں جو شے سب سے زیادہ اہم ہوتی ہے وہ "دیانت" ہے جس میں صداقت، خلوص، فرض شناسی اور ایثار نفس کی عمدہ صفات شامل ہیں، وہ ہستی جو کافی طور پر معلمانہ دیانت کا احساس نہیں کرتی، یا اسکو پورے طور پر عمل میں نہیں لاتی کبھی معلمی کے عظیم اور مہتم بالشان فرائض کا بار نہیں اٹھا سکتی ہر چند معاملات کے اعتبار سے ہر فرد انسانی دیانت پر عامل ہونے کا ادعا رکھتا ہے لیکن معلمانہ حیثیت سے یہ صفت نہایت قیمتی اور بیش بہا ہوتی ہے، حتیٰ کہ آجکل بھی جبکہ فن معلمی نے اپنے قدیم روایات اور امتیاز کو تلف کر دیا ہے جہاں کہیں بھی یہ صفت کسی صورت اور کسی مقدار میں جلوہ نما ہے، وہاں تعلیم نے اپنے حقیقی مقصد کو حاصل کر لیا ہے۔

فن معلمی کو جو تعلق دیانت کے ساتھ ہے اسکی تفصیل سے پیشتر دیانت کے مقصود کا واضح کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ تدین کا بہترین پہلو یہ ہے کہ معلم اپنے فرائض کو بہ احسن وجوہ انجام دے اور محض درس و تدریس ہی نہیں بلکہ اپنے ہر فعل کو

دیانت کے لحاظ سے دوسروں کیلئے ایک کامل نمونہ بنانے کی کوشش کرے تاکہ اوروں کو
اسکی پیروی کا شوق ہو معلمانہ فرائض کی کماحقہ انجام دہی کیلئے دیانت کی جسقدر ضرورت
ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ کیونکہ گروہ اساتذہ پر ایک پوری قوم۔ نسل اور عہد
کی کامل تربیت اور درستی کی ذمہ داری ہوتی ہے جسکا اسکو خاص لحاظ رکھنا پڑتا ہے
تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ طلبہ قابل لائق، نیک رویہ اور تندرست و توانا بنیں،
بڑے ہوکر عملی دنیا میں ثابت قدم ہوں اور قومی و ملکی افراد بن سکیں مگر اکثر دیکھا جاتا ہے کہ
محض کامیابی امتحان کو تعلیم کی غایت سمجھ لیا گیا ہے اور طلبہ کے دماغ اور اخلاق
کو ایسی تربیت نہیں دیجاتی کہ وہ آئندہ چلکر دنیاوی جدوجہد میں کامیابی حاصل کریں
اور قوم و ملک کے کام آئیں۔ اس نقص کا سب سے بڑا سبب "معلمانہ کیریکٹر" کی عدم
موجودگی ہے جس کا اثر راست متعلمین کے کیریکٹر پر پڑتا ہے! اور ان دونوں کیریکٹروں کا
مشترکہ نقص تعلیم کے مقاصد حاصل نہیں ہونے دیتا۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہمارے معلمین،
متعلمین کے اخلاق کو نہ صرف انسانی بلکہ قومی حیثیت سے اعلیٰ اور پختہ بنانے کی
طرف کماحقہ توجہ نہیں فرماتے، حالانکہ یہ انکا سب سے ضروری اور اہم فرض ہے۔
ان کے متعلمین کے سامنے بجز ڈگری یا طلب ملازمت کے کوئی دوسری غایت
تعلیم پانے کی نہیں ہوتی۔ تعلیم کی غایت اس سے کہیں بلند ہے اور ہمارا فرض ہے کہ
تعلیم کی حقیقی غایت اور آئیڈیل کو ہر وقت طلبہ کے پیش نظر رکھیں اور محض مقررہ
نصاب کے پڑھا دینے پر اکتفا نہ کریں بلکہ ہر ممکنہ طریقہ سے ان کی عام معلومات

میں وسعت پیدا کرنے کی کوشش کریں اور اطوار اور صحت کی درستی کا خیال رکھیں۔
متعدد امور ایسے ہیں جن کو ایک معلم جماعت کے اندر ہی انجام دے سکتا ہے
مثلاً وقت کی پابندی، سبق کی طرف توجہ، آداب درجہ کا لحاظ، جماعت کی حاضری؛
مگر جماعت کے باہر بھی نہایت اہم فرائض اس کے ذمہ باقی رہ جاتے ہیں جن کی
نسبت قانوناً در واجاً تو غالباً کوئی گرفت نہیں کیجا سکتی مگر اخلاقاً اور مذہباً ان فرائض
کا انجام نہ دینا درحقیقت تعلیم کے جملہ مقاصد کو فوت کر دیتا ہے، طلبہ کی اخلاقی حالت
کا معائنہ، ان کی عام معاشرت کا لحاظ، ان کے خیالات و رجحانات کو ایک صحیح
راستے پر لگا دینا، ان کے رویہ کے متعلق تحقیقات اور اسی قسم کے دیگر امور ایسے
ہیں جن کا سرانجام بخوبی کسی طرح جماعت کے اندر نہیں ہو سکتا

ہندوستان کی قدیم معلمانہ شخصیت نہایت متدین اور صفات مذکورہ کی جامع
ہوتی تھی وہ لوگ فن معلمی اور تحصیل علم کو نہایت مقدس و محترم خیال کرتے تھے اور اس کو
ذریعۂ تجارت یا ذریعۂ آمدنی بنانے کا خیال بھی ان کو نہیں پیدا ہوتا تھا، وہ مجسم عمل ہوا
ہوتے تھے اور حاضر و غائب اپنی معلمانہ سیرت کو نہایت سختی کے ساتھ ملحوظ رکھتے تھے
طلبہ میں بہترین انسانی اور قومی خصائل پیدا کر دینا اپنی زندگی کا مقصد خیال کرتے
اپنے متعلمین میں خفیف سا بھی اخلاقی عیب پا یا جانا ان کو زندگی سے بیزار کر دیتا تھا،
خلاصہ یہ ہے کہ معلمانہ حیثیت سے دیانت پر پورا پورا عمل کرتے تھے اور طلبہ پر بھی
فطرتاً اسکا اثر نہایت ہی عمدہ پڑتا تھا، اور اگرچہ اس زمانہ میں مدرسین کی تربیت

ڈریننگ) کا کوئی مخصوص انتظام نہ تھا تاہم وہ اپنی دلچسپی اور ہمدردی اور تعلیمی تدبن کی وجہ سے بہ نسبت آجکل کے مدرسین کے عموماً بہتر نتایج پیدا کرتے تھے۔

بہرکیف معلمانہ دیانت کا تقاضہ ہے کہ ہم نہایت خلوص، صدق، جوش اور ایثار و بے نفسی کے ساتھ اپنے فرائیض کو ہاتھ میں لیں، ہمارے پیش نظر بجز اس کے اور کوئی مقصد نہ ہو کہ متعلمین کے مطمح نظر کو بلند اور ان کی سیرت کو نہایت اعلی بنا دیں، ہماری ہر حرکت اور عمل اسی کے حصول کی طرف ایک اور قدم ہو، طلبہ کی دماغی تربیت و ترقی کو اپنی محنت کا بہترین ثمر سمجھیں اور ان کے سنوارنے میں اپنی ہستی کو اسقدر محو کر دیں کہ جبتک مقصد تعلیم پورا پورا نہ حاصل ہو جائے اپنے کو ادائیگی فرائض سے قاصر سمجھتے رہیں۔

معلمانہ ضمیر کا اقتضا یہ ہے کہ ہم تدریس سے پہلے اسباق کی طیاری نہایت مکمل کرلیں اور بہ وقت تعلیم ہمہ تن دلچسپی کے ساتھ تعلیم دیں جس کے بغیر طلبہ پر وہ اثر ہرگز نہیں پڑ سکتا جو غایت درس ہے۔ نیز طلبہ کی معلومات میں غیر معمولی اضافہ کیا جائے، متعدد دیگر تحریکات مثلاً فن تقریر یا اجتماعی طور پر طلبہ میں کسی کام کے متعلق سرگرمی پیدا کرنے کی بنیاد رکھی جائے، ان کے والدین سے اس غرض کے مدنظر ربط ضبط بڑھایا جائے کہ ان کی صحت، رویہ اور عام اخلاقی حالت اور صحبت کے متعلق مفصل معلومات حاصل ہو تاکہ ان کی نسبت ایک صحیح رائے قائم کرنے کا موقع ملے علاوہ بریں والدین کو بھی ان کی بہبودی کے لئے حسب ضرورت مسلسل

توجہ دلائی جائے جس کے بغیر تعلیم کا تکملہ نہیں ہوسکتا۔ یہ خیال کہ ہمارا فرض اسکول کی پابندئ قواعد کے ساتھ ہی ختم ہوجاتا ہے قابل ترمیم ہے! تاوقتیکہ طلبہ کی بہبودی کی غرض سے ان کے سرپرستوں کے ساتھ اتحاد عمل نہ کیا جائے گا اور تاوقتیکہ تعلیم و تدریس کو منشائے ملازمت سمجھنے کے بجائے منشائے زندگی نہ قرار دیا جائیگا ہمارے ملک کی حالت تعلیم کے لحاظ سے کوئی عمدہ نتیجہ نہیں پیدا کرسکتی۔

حقیقی معنوں میں معلم بننے کے لئے بہت ضروری ہے کہ طلبہ کے ساتھ کھیلوں اور پلے گراونڈ پر مساویانہ شریک رہ کر ان کی سوسائٹی کا آزاد اور بے تکلف پہلو دیکھنے کی کوشش کیجائے تاکہ ان کے عام رجحانات اور کمزوریوں کا پتہ لگ سکے جس سے انکی ہر قسم کی اصلاح ممکن ہو، طلبہ کے ہر قول اور فعل پر نہایت سختی کے ساتھ ایک مخصوص معیار کے مطابق تنقید کیجائے مذہبی پابندی میں کسی قسم کا تساہل جائز نہ رکھا جائے اور ادنیٰ سی اخلاقی کمزوری کا بھی پورا پورا تدارک کیا جائے اس کے علاوہ غیر مستطیع اور آوارہ بچوں کی تعلیم کا بند و بست نہایت ضروری سمجھا جائے۔

تعلیمی دیانت کو پورے طور پر ملحوظ رکھنے کے بعد ہی ہم علانیہ اس کا احساس کرینگے کہ ایک معلم کسقدر عظیم الشان شخصیت کیسی اہم طاقت اور کتنا زبردست اثر رکھتا ہے! اس کا ادنیٰ نتیجہ یہ ہوگا کہ جتنی تحریکیں طلبہ کی بھلائی کے لئے اسوقت منتشر طور پر جاری ہیں مثلاً بوائے اسکاوٹ، ورزش جسمانی، قومی تعلیم وغیرہ وہ سب بہ یک وقت، ایک ہی عمل کا نتیجہ قرار پاکر باہم مربوط ہوجائینگی اور پیشۂ معلمی کو وہی وقار اور

تقدس حاصل ہو جائے گا جو علم و فضل کے اعتبار سے اس پیشہ کے روایات کا رکن رکین رہا ہے اور جو مختلف وجوہ کی بنا پر ہم میں سے بتدریج اسطرح زائل ہو گیا تھا کہ نہ ہم کو احساس رہا تھا کہ ہمارے پیشہ کی روح نکل چکی ہے اور نہ عزت و وقار کو اسکی اطلاع تھی کہ پیشۂ علمی میری شرکت کے بغیر قالب بے روح ہے ۔

مخاطبات

مولوی سید محمد مرتضیٰ صاحب مرحوم کا سانحۂ وفات ملک کا بہت بڑا علمی حادثہ ہے جو پچھلے دنوں واقع ہوا ۔ اس زمانۂ قحط الرجال میں مرحوم کی ہستی ملک کی تعلیمی تحریکوں کی سرسبزی کے لئے بسا غنیمت تھی اور ہم کو اُس ذات سے بڑی بڑی امیدیں تھیں جس کو موت نے یکایک ہم سے جدا کر لیا اس غم والم میں اگر کوئی صدائے تسلی سنائی دیتی ہے تو وہ ، وہ پیغامات اور مجالس تعزیت ہیں جو ملک کے اطراف و جوانب سے مرحوم کے متعلق شایع ہوئے جن سے ایک طرف اگر عام بیداری و احساس کا پتہ چلتا ہے تو دوسری طرف ملک میں اکابر کی قدرشناسی کا بھی کافی ثبوت ملتا ہے !

انجمن اساتذہ کی مختلف شاخوں کو آیندہ سے جلسوں اور تقریروں کی سہ ماہی رپورٹ جنرل سکریٹری کے پاس روانہ کرنی چاہیے تاکہ رسالۂ ہذا کی سہ ماہی اشاعت میں ان کے متعلق اندراجات ہوسکیں۔ رپورٹیں اختصار کے ساتھ لکھی جائیں اور ان کے ساتھ ایسی تقاریر بھی منسلک کیجائیں جو معتمد صاحب شاخ متعلقہ کی رائے میں قابل اشاعت ہوں۔ نیز ہر بحث کے متعلق اراکین جلسہ عام طور سے جس نتیجہ پر پہنچیں اس کا اور نمونہ کے اسباق کا ذکر بھی ضرور کیا جائے۔

گزشتہ حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس سالانہ کے موقع پر نواب مرزا یار جنگ بہادر میر مجلس کا خطبۂ صدارت کئی پہلوؤں سے نہایت اہم ہے جس میں متعدد تعلیمی مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ سب سے پہلے تعلیمی پالیسی کی بنیاد تین باتوں پر رکھی گئی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ تعلیم ایسی دی جانی چاہئے جس سے کسب معیشت میں سہولت ہو، موجودہ معیار بلند تر معیار قایم ہو جائے اور ہم کو اپنے ہمسایوں کے ساتھ امن و سکون اور خوشی سے زندگی بسر کرنے کا موقع ملے فی الحقیقت اس تقسیم میں کسب معیشت کے سوال کو مقدم رکھا جانا نہایت ضروری تھا کیونکہ حصول معاش کی طرف سے بیفکری ہو جانے کے بعد ہی بہ اطمینان دوسرے امور کیطرف توجہ کیجا سکتی ہے ہر چند کسب معیشت کی نیت سے حصول علم ہمارے قدیم تعلیمی روایات کے برعکس ہے تاہم موجودہ حالات کے لحاظ سے بہت کچھ مجبوریاں پیدا ہو گئی ہیں جن کی وجہ سے اس قدیم نظریہ کو بدلنا

ضروری ہے۔

اکتساب معاش کے مد نظر موجودہ تعلیم دو قسموں پر منقسم کی گئی ہے۔ دیہی تعلیم اور شہری تعلیم۔ دیہی تعلیم کے ضمن میں اہل دیہات کو ہل چلانے میں مشغول رکھنا ملک کی بہبودی کے لئے ضروری ثابت کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ دیہی آبادی کو اس کے آبائی فن میں مصروف رکھنا بہت مناسب ہے مگر اس کے ساتھ کچھ نہ کچھ ایسی تعلیم بھی دیجانی چاہئے جو ان لوگوں کو خود ان کے پیشہ کے متعلق زیادہ واقف بنا سکے، زراعت کی ترقی بغیر کافی تعلیم کے نہیں ہوسکتی اور چونکہ بقول معزز مقرر کے آبادی کا کثیر حصہ اہل دیہات پر مشتمل ہے اس لئے نہائت احتیاط اور پورے غور کے ساتھ ان لوگوں کی مخصوص تعلیم کا انتظام ہونا چاہئے جس کا اثر یہ ہو کہ وہ اتفاقات زمانہ مثلاً ژالہ باری، بارش کی غیر معمولی کمی یا زیادتی نیز وبا اور امراض مویشی وغیرہ کا سنجیدگی سے مقابلہ کر سکیں اور اپنی منفعت کے پہلو سوچ سکیں۔

شہری تعلیم کے ضمن میں جناب صدر نے مدارس کی تین منزلیں قرار دی ہیں تحتانیہ یعنے ایلیمنٹری وابتدائی، فوقانیہ یعنے ہائی اسکول، جامعہ یعنے یونیورسٹی۔ اس تقسیم میں غالباً سہو سے ایک تعلیمی منزل یعنے منزل وسطانیہ جو ہائی اسکول کی تعلیم کا ایک لازمی زینہ ہے ترک ہوگئی ہے۔

بہرکیف شہری تعلیم کے اس عظیم الشان مسئلہ پر کہ تعلیم مذکور محض ملازمت کی غرض سے حاصل کیجاتی ہے اس خطبہ میں کافی بحث کیگئی ہے اور شہری تعلیم کے

افسوس ناک نتیجہ کو جس کی وجہ سے فارغ التحصیل طلبہ ملازمت کو اپنا نصب العین بنا لیتے ہیں اور ملازمت نہ ملنے کی صورت میں سوسائٹی کا عضو معطل بنکر رہ جاتے ہیں بتلاتے ہوئے اور اس ضمن میں اپنے دردناک تجربہ کا اظہار کرتے ہوئے معزز مقرر نے اسکا بھی وہی دفعیہ تجویز کیا ہے جو مختلف صورتوں میں پیشتر بھی ہمارے سامنے آچکا ہے یعنے دستکاری اور صنعت وحرفت کی تعلیم کافی طور پر رائج کرنا اور ملازمت کے خیال کو طلبہ کے دماغ سے نکالنا۔ ہم کو اس سے کامل اتفاق ہے اس لئے کہ ملازمت کا شوق بہرصورت اصلاح طلب ہے جس سے تعلیم کا اصل مقصد بالکل فوت ہوجاتا ہے جس کے لحاظ سے اس امر کی ازبس ضرورت ہے کہ زراعت۔ تجارت اور صنعت وحرفت وغیرہ کے ذریعہ سے وسائل معاش کو وسعت دی جائے لیکن معزز مقرر کی یہ رائے کہ "ادبی اور صنعتی تعلیم کے مصارف کا پلہ باہم ادھر سے ادھر بدل دیا جائے" ناقابل عمل معلوم ہوتی ہے اسلئے کہ اسطرح کے ناگہانی انقلاب سے ادبی اور صنعتی دونوں تعلیم کے مقاصد خلط ملط اور تلف ہو جانے کا اندیشہ ہے فی الوقت ابتدائی تعلیم نہایت ضروری ہے خصوصاً جبکہ قابل تعلیم اطفال کی ایسی کثیر تعداد بیشتر سے موجود ہے جو زیر تعلیم نہیں ہے پس سب سے بڑی ضرورت جو تمام دیگر ضرورتوں پر مقدم ہے ابتدائی تعلیم کی توسیع و اشاعت ہے جس کے بغیر ملک کے کسی فرد میں کوئی صلاحیت نہیں پیدا ہوسکتی۔

البتہ تعلیم صنعت وحرفت کے لئے مصارف کا سوال نہایت اہم ہے۔ ابتک جو کچھ صنعت وحرفت پر صرف کیا جاتا رہا وہ بقول معزز مقرر صاحب کے مقابلتاً

ضرورت سے بہت کم رہا مگر اس کے انتظام کے لئے بجائے پلہ ادھر سے ادھر کر دینے کے جس سے رجعت عمل (Re-action) پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے' یہ زیادہ مناسب ہوگا کہ فی الوقت مدارس صنعت و حرفت کے قیام کے بعد اسکی کوشش کیجائے کہ ان کے مصارف کا بیشتر حصہ خود ان کی آمدنی سے پیدا کر لیا جائے' ابتداءً ایسے مدارس کے لئے مصارف کی ضرورت یقینی ہے مگر وہ اسطرح رفع کیجا سکتی ہے کہ عام و مروجہ اعلیٰ تعلیم کے مصارف میں کمی کر دیجائے اور جو رقم اسطرح بچ جائے وہ مدارس مذکور کے قیام میں صرف کیجائے اس لئے کہ اعلیٰ تعلیم بجز اُن افراد کے جو فی الحقیقت کوئی علمی رجحان اور کمال رکھتے ہوں' ہر طالبعلم کے لئے رسماً قایم کر دینا بالکل بیکار ہے چنانچہ یوروپ کے ترقی یافتہ ممالک میں بھی گو ابتدائی تعلیم کو ہر فرد ملک کے لئے لازمی سمجھا جاتا ہے مگر اعلیٰ تعلیم کا حلقہ اصولاً نہایت محدود کر دیا گیا ہے اور گورنمنٹ اسپر مقابلتاً کم صرف کرتی ہے' کیا وجہ ہے کہ ہمارے ملک میں' درانحالیکہ ضرورت بھی ہے' اس اصول کی پیروی میں اعلیٰ تعلیم کو مخصوص محدود نہ کر دیا جائے۔ اس سے صنعتی مدارس کے لئے ایک حد تک گنجائش نکل سکتی ہے'

اس ضمن میں یہ نکتہ بھی فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ محض صنعتی مدارس کا قائم کر دینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ' خود صنعت و حرفت کی ترقی اور مختلف مصنوعات کے کارخانوں کا قیام لازمات سے ہے ورنہ کسب معیشت اور بیکاری کی جو دقت اسوقت قائم ہے وہ بدستور باقی رہے گی۔

فوقانی اور جامعاتی تعلیم کے فرق کے ضمن میں معزز مقرر کی یہ رائے نہایت صائب ہے کہ فوقانی منزل میں کسی پیشہ کی تعلیم کو لازمی کر دیا جائے، یہاں بھی ثانوی اور فوقانی تعلیم کو غالباً سہو سے باہم مترادف کر دیا گیا ہے حالانکہ ان دونوں مدارج تعلیم میں عام و خاص کا فرق ہے، بہرصورت اس خصوص میں طالبعلم کے رحجان کا لحاظ رکھنا نہایت ضروری ہے ورنہ ہمارا مقصد کلیتہً فوت ہو جائے گا کسب معیشت کا مسئلہ حل کرنے میں یہ خیال رکھنا چاہئے کہ تعلیم کی حقیقی غایت فوت نہ ہونے پائے یا محض پیشہ ورانہ زندگی ہی تعلیم کا عام معیار قرار نہ پا جائے نیز جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے یونیورسٹی کی تعلیم میں صرف ایسے طلبہ کو حصہ لینا چاہئے جو اسکی صلاحیت رکھتے ہوں اور جن کو کسی مخصوص فن یا علم کی مہارت و کمال کے لئے طیار کیا جاتا ہو۔

شہری تعلیم کے شمول میں صنعت و حرفت کی ابتدائی تعلیم کا تذکرہ کرتے ہوئے معزز مقرر نے مشورتاً لندن کے بورڈ آف ایجوکیشن سنہ ۱۹۱۰ء اور کونٹی کونسل سنہ ۱۹۱۲ء کا کچھ اقتباس دیکر ہندوستان کے مدارس کے لئے بھی صنعتی تعلیم کو جبری کر دینا مناسب سمجھا ہے، بیشک اس قسم کی تعلیم کو ابتدائی تعلیم کے نصاب میں شامل کرنا نہایت مفید ہے مگر اس ضمن میں دستکاری اور صنعت و حرفت کے بین فرق کو نظر انداز کر دیا گیا ہے، دستکاری (مینول ٹرننگ) کا منشاء یہ ہے کہ طلبہ کی آنکھ اور ہاتھ میں چستی و مہارت پیدا ہو اور ابتدا ہی سے وہ دستی کام کے عادی ہو جائیں، اسمیں دلچسپی لیں اور بجائے معیوب سمجھنے کے باعث عزت خیال کریں جس کا راست نتیجہ

یہ ہوگا کہ عام طور پر صنعتی تعلیم کا مذاق پیدا ہو جائے گا اور آیندہ صنعت و حرفت
کی تعلیم میں سہولتیں نمایاں ہو جائیں گی چنانچہ شہری تعلیم کے تحتانی، اور ایک حد تک
وسطانی نصاب میں دیگر مضامین کے ساتھ صرف دستکاری کو شریک کیا جا سکتا ہے،
لیکن صنعتی تعلیم کے لئے مختص الفن مدارس کی شدید ضرورت ہے صرف مدارس وسطانیہ
و فوقانیہ میں صنعتی تعلیم کا انتظام مفید نہیں ہوگا البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ صنعتی مدارس
قائم کئے جائیں اور تعلیم صنعت و حرفت کے ساتھ ساتھ ان میں حسب ضرورت
ادبی تعلیم بھی دیجائے تاکہ صنعت و حرفت کے اصول اور اختراع و ترقی کے پہلو طلبہ
کے ذہن میں آسکیں، ہماری رائے میں ان طلبہ کے لئے جو فوقانی تعلیم کے بعد ہی
دنیا میں قدم رکھنا چاہتے ہیں ازبس ضروری ہے کہ فوقانی نصاب کے اختیاری
مضامین کے دائرہ میں ایسے مضامیں ضرور داخل کئے جائیں جو طالبعلم کو فوقانی
منزل طے کرنے کے بعد ہی پیشہ کے انتخاب اور ان کو کامیاب شہری بننے میں
مدد دیں، اس غرض کے لئے تجارت یا کیمیائے عملی وغیرہ کا شامل نصاب کر دینا مناسب ہوگا
مسئلہ تعلیم نسوان کے متعلق جو کچھ معزز مقرر نے فرمایا نہایت درست ہے،
اگر غور سے دیکھا جائے تو تعلیم ذکور کے مقابلہ میں تعلیم اناث کا مسئلہ کہیں زیادہ
اہم اور نازک ہے، طالبات کا نصاب لڑکوں کے نصاب سے بالکل جدا ہونا چاہئے
ہر چند کہ فی الحال فوقانی منزل تک موجودہ نصاب میں اسکا لحاظ رکھا گیا ہے
بر ایں ہمہ مزید ترمیم کی بہت گنجائش ہے اس لئے کہ ابتدائی خرابیاں جو ہمارے

طلباء کے نصاب میں شروع تعلیم سے داخل ہوگئیں (جن میں تعلیم کا انگریزی زبان زبان میں دیا جانا بھی شامل ہے) اب تک اپنے نتائج اور اثرات دکھلا رہی ہیں لہذا بہت ضروری ہے کہ مدارس فوقانیہ نسوانیہ میں اس کا خاص لحاظ رکھا جائے کہ ذریعۂ تعلیم اردو ہو۔

اپنے دوسرے خیال کے تحت میں معزز مقرر نے ملکی زبان میں تعلیم کے متعلق جن درخشاں خیالات کا اظہار فرمایا ہے وہ درحقیقت قوم و ملک کے جذبات کی عین ترجمانی ہے، اصولاً زبان ہی کا مسئلہ بنیادی مسئلہ ہے اور آج اتنا زمانہ گذر جانے کے بعد بھی تعلیم کی ناکامی کا اصلی باعث یہی ہے کہ ابتدا ہی سے غیر زبان میں تعلیم دیجانے لگی، اگر اب بھی زبان کے مسئلہ کی خاطر خواہ اصلاح ہو جائے تو ہم کہتے ہیں کہ ننانوے فیصدی تعلیمی نقائص قطعاً دور ہو جائیں گے، آگے چلکر جسمانی تربیت کے ضمن میں معزز مقرر نے اسکولوں میں فوجی تعلیم کا لازمی کر دیا جانا مناسب خیال فرمایا ہے، بلاشک جسمانی تربیت دماغی تربیت کی جڑ ہے لیکن جسمانی تربیت بغیر فوجی تعلیم کے بھی ممکن ہے ۔ علاوہ بریں یہ امر بھی ظاہر ہے کہ موجودہ حالات کے دیکھتے ہوئے فوجی تعلیم میں طرح طرح کی عملی دقتیں ہیں اور اس کے لازمی کر دیئے جانے کی صورت میں اس پر عمل کرنا ہی مشکل ہوگا البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ موجود جسمانی تربیت کو اس طرح ترقی دیدیجائے کہ اس سے بہ وجہ احسن وہ منشاء پورا ہو جائے جو اسکول میں فوجی تعلیم سے متصور ہے۔

اس کے بعد امور متعلقہ دارالاقامہ پر معزز مقرر نے بحث فرمائی ہے، بورڈنگ لائف کے برکات ظاہر ہیں، ہماری مشرقی روایات کے لحاظ سے تو مسجدوں کے حجرے بورڈنگ لائف کا پورا نمونہ تھے لیکن اسوقت لفظ طالب علم کا مفہوم بالکل دوسرا تھا آجکل ہمارے سامنے بورڈنگ لائف کا کوئی مفید نمونہ اور معیار نہیں ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ غیر ترتیب یافتہ بچے جو مختلف مقامات سے مختلف ماحول کا اثر لئے ہوئے ایک جگہ مجتمع ہو جاتے ہیں وہ بجائے اس کے کہ قومی اور علمی کیریکٹر کا نمونہ بنیں محض تقلید پر اُتر آتے ہیں اور ان کی سیرتوں میں خامیاں رہ جاتی ہیں، ہمارے ہاں دارالاقاموں کی قلت ہے اور صحیح ملکی اصول پر دارالاقاموں کے قیام کی ضرورت ہے

اپنے تیسرے خیال کے ضمن میں معزز مقرر نے ہند و مسلم اتحاد کے عظیم الشان مسئلہ پر تعلیمی پہلو سے بحث کی ہے، واقعہ یہ ہے کہ یہ مسئلہ اسقدر سیاسی نہیں ہے جتنا تعلیمی ہے لیکن رفتہ رفتہ سیاسی ہوتا جارہا ہے، اس شمول میں معلمانہ مساوات اور طلبہ میں اتحاد داخوت کے لئے ایک ابتدائی معاہدہ اور تحریر کا مشورہ دیا گیا ہے ہماری رائے میں لڑکی یا لڑکے کو آغاز تعلیم سے اگر کسی خاص اقرار و الفاظ کا پابند کیا جاتا رہا تو قطع نظر اس کے کہ رفتہ رفتہ اس اقرار کے مخالف پہلو پر بھی اس کی نظر پڑے گی، بار بار ایک ہی اقرار کو دہرانے کی وجہ سے اس کی حقیقی روح بالکل زائل ہو جائے گی، اس کے لئے بہترین چیز موقع کی تلاش ہے: اگر ماحول اور فضا کی مناسبت

کے لحاظ سے اتحاد کی خوبیاں ذہن نشین کیجائینگی تو اس کا اثر طلبہ کے دلوں پر کسی
باقاعدہ اور لفظی اقرار سے کہیں زیادہ پڑیگا، علاوہ بریں یہ ضروری ہے کہ خود مدرسین
اپنے برتاؤ کے ذریعہ سے طلبہ کے سامنے حقیقی اتحاد و اخوت کا نمونہ پیش کریں جس کا
اثر طلبہ کے قلوب پر ابتدا ہی سے ایسا زبردست ہو کہ وہ اپنی عملی زندگی میں اپنے اساتذہ
کی کامل پیروی کریں اور کسی مزید اتحاد کی تبلیغ کی ضرورت باقی نہ رہے۔

اختتام پر معزز صدر نے تمام دنیا میں ایک بین الجامعاتی تجویز کا ذکر کیا ہے اسکی
اہمیت ظاہر ہے، نوع انسان کی بہت بڑی خوش قسمتی ہوگی اگر رنگ، قوم، زبان
اور مذہب کے موانعات و تعصبات سے قطع نظر کرکے ایک پشت میں بھی یہ تجاویز
عمل میں آجائیں اور تعلیم کا نصب العین ایک مشترک سطح پر لایا جاسکے۔

آخر میں ہم یہ لکھنا چاہتے ہیں کہ خطبۂ مذکور ہر حیثیت سے نہایت جامع اور فائدہ بخش
و قابل دید ہے اور جس محنت و جانکاہی سے طیار کیا گیا ہے۔ وہ قابل ستائش ہے
ہمارے ملک میں اس قسم کے خیالات کی جیسے کہ خطبہ میں ظاہر کئے گئے ہیں نہایت
ضرورت ہے، معزز مقرر نے حتے الامکان تعلیم کا کوئی پہلو نظر انداز نہیں فرمایا ہے
اور ملکی ضروریات اور مقتضیات کے لحاظ سے ہر امر پر نہایت روشن خیالی اور وسعت
کے ساتھ نظر ڈالی ہے جس کی بناء پر یہ لکھنا پڑتا ہے کہ ملک کے مذاکرات تعلیمی کی
تاریخ میں یہ اپنی قسم کا غالباً پہلا ہی خطبہ ہے جو ہماری ایجوکیشنل کانفرنس کی کوششوں اور
نواب مرزا یار جنگ بہادر کے قابل دماغ سے ہمارے سامنے آیا ہے۔

ہم کو افسوس ہے کہ عدم گنجائش کی وجہ سے اس نمبر میں بجز رپورٹ کے اور کوئی تقریر انجمن اساتذہ کے جلسوں کی نہ شایع کیجا سکی آیندہ اشاعت میں اس کی تلافی ہو سکیگی۔ اس کی ساتھ ہی ہم قارئین و مقررین کو اس امر کی طرف بھی توجہ دلانا چاہتے ہیں کہ رسالہ میں عموماً اسی معیار کے مضامین شایع کئے جائینگے جس کا نمونہ اشاعت ہذا کی صورت میں ناظرین کے سامنے ہے، اقتباسی اور ترجماتی یا مال مضامین کا اندراج نہ صرف ضوابط رسالہ کے خلاف ہے بلکہ ہمارے ناظرین کی عمیق دلچسپی بھی غالباً اس کو پسند نہ کرے۔

انجمن کی رپورٹ

اوائل امرداد ۱۳۳۳ف میں دفتر صدر مہتممی تعلیمات بلدہ میں مفاد اساتذہ کے مد نظر ایک کمیٹی منعقد ہوئی جس میں انجمن اساتذہ کا قیام ضروری سمجھا گیا چنانچہ ۱۹ امرداد ۱۳۳۳ف کو بشمول پرنسپل صاحبان دارالعلوم و نارمل اسکول بلدہ و صدر مدرسین صاحبان مدارس وسطانیہ شاہی وغیرہ جملہ چودہ حضرات کے سامنے مسودہ قواعد انجمن پاس ہوا اور ۲۸ امرداد ۱۳۳۳ف کو بغرض منظوری صدر میں بھیجا گیا جسکی منظوری بذریعہ مراسلہ نشان (۳۵۷) مورخہ ۱۹ اردے ماہ الہی ۱۳۳۴ف محکمہ سرکار سے صادر ہوئی چنانچہ قواعد طبع ہوئے اور انجمن کا افتتاحی جلسہ ۷ اسفندار ۱۳۳۴ف کو مدرسہ وسطانیہ رزیڈنسی میں زیر صدارت جناب مولوی سید علی اکبر صاحب بی۔ اے۔ صدر مہتمم تعلیمات مستقر بلدہ منعقد ہوا جناب مولوی احمد حسین خاں نقشبند بی۔ اے پرنسپل مدرسہ دارالعلوم نے مقاصد انجمن پر بزبان انگریزی روشنی ڈالی اور جناب صدر جلسہ نے اہمیت و ضرورت انجمن پر بزبان اردو نہایت صراحت سے تقریر فرمائی۔

آغاز انجمن کے وقت (۱۰) مراکز قرار دئے گئے تھے مگر ختم ۱۳۳۴ف پر بلحاظ ضرورت اضافہ ہوکر حسب ذیل (۱۵) مرکز قائم ہوئے۔

(۱) مدرسۂ فوقانیہ عثمانیہ دارالعلوم (۲) مدرسہ وسطانیہ شاہ علی بنڈہ (۳) مدرسۂ وسطانیہ دارالشفاء (۴) مدرسہ وسطانیہ رزیڈنسی (۵) مدرسہ فوقانیہ نامپلی (۶) مدرسۂ وسطانیہ

گولکنڈہ ۔ (۷) مدرسہ وسطانیہ شاہ گنج ۔ (۸) مدرسہ تعلیم المعلمین بلدہ ۔ (۹)
مدرسہ فوقانیہ انگریزی چادرگھاٹ ۔ (۱۰) مدرسہ وسطانیہ گوشہ محل (۱۱)
مدرسہ وسطانیہ مستعد پورہ ۔ (۱۲) مدرسہ وسطانیہ چنچلگوڑہ ۔ (۱۳) آ۔ وی اسکول بلارم
(۱۴) اسلامیہ ہائی اسکول سکندرآباد ۔ (۱۵) محبوب کالج سکندرآباد ۔

چونکہ ازروئے قواعد جملہ مدارس شاہی امدادی و لوکلفنڈ واقع بلدہ کے مدرسین کیلئے
اس انجمن کی رکنیت لازمی ہے، اس لئے جملہ اراکین انجمن کی تعداد ایکہزار سے زیادہ ہے
اور سن ابتدائے بہمن لغایتہ آخر آبان ۱۳۳۴ف جملہ چندہ وصول شدہ سے ضروری
مصارف کی ادائی کے بعد ختم سال پر مبلغ (۱۴/۶/ہر) روپیہ سکہ عثمانیہ سلک موجود تھی
ہر شاخ اور معتمد عمومی اور خزانچی صاحب کے دفتروں کے حسابات کی تنقیح بذریعہ دو مستند
اراکین انجمن کرائی گئی ۔

۱۳۳۴ف کے لئے علاوہ ان حضرات کے جو بحیثیت عہدہ رکن انتظامی ہیں
جناب صدر مدرس صاحب مدرسہ دیوک وردھنی و جناب منگیشور راؤ صاحب مددگار
مدرسہ آل سینٹس اور جناب صدر مدرس صاحب گرامر اسکول و صدر مدرس صاحب
مدرسہ مفید الانام رکن انتظامی منتخب ہوئے ۔

جناب مولوی احمد حسین خاں صاحب بی ۔ اے پرنسپل دارالعلوم اور جناب
پرنسپل صاحب مدرسہ تعلیم المعلمین نائب میر مجلس اور سید محمد شریف صاحب مشہدی
معتمد عمومی منتخب ہوئے ۔

۱۳۲۵ف کے لئے علاوہ اراکین انتظامی بحیثیت عہدہ کے جناب مینگلشوراؤ صاحب

مددگار مدرسہ آل سنیٹس وجناب صدر مدرس صاحب مدرسہ مفید الانام اور ... صاحب

رکن مدرسہ آل سنیٹس اور جناب ریورنڈ ڈ والی سنفرم پرنسپل گرامر اسکول رکن انتظامی منتخب ہوئے

جناب ایم ملکپتھال صاحب پرنسپل چادرگھاٹ ہائی اسکول اور جناب مولوی احمد حسین خان صاحب

پرنسپل مدرسہ فوقانیہ دارالعلوم بلدہ نائب میر مجلس اور سید محمد شریف صاحب مشہدی معتمد عمومی

مقرر ہوئے اواخر ۱۳۳۴ف میں حسب ذیل موازنہ انجمن مقرر کیا گیا جس کا نفاذ آذر ۱۳۳۵ف

سے کیا گیا :-

آمدنی	جملہ آمدنی سالانہ تقریباً [illegible] روپیہ سکہ عثمانیہ
خرچ	(۱) صادر سال تمام (۱۶) دفاتر بحساب [illegible] سالانہ ایک دفتر سے

ششماہی جملہ سالانہ [illegible]

۲- الاونس اہلکار دفتر صدر مہتممی [illegible] سالانہ

۳- چپراسی دفتر معتمد عمومی [illegible]

۴- (۱۶) چپراسیان شاخہائے انجمن بحساب [illegible] سالانہ فی کس [illegible] سالانہ

جملہ سالانہ [illegible]

۵- برائے مصارف کانفرنس جملہ آمدنی کا (۲۵) فیصدی یا سالانہ : [illegible]

۶- برائے مصارف اجرائی میگزین برائے ابتدائی دو سال سالانہ : [illegible]

مد محفوظ .... سالانہ [illegible]

جملہ .... [illegible]

ختم سال پر مصارف مقررہ میں سے جو رقم بچ رہے گی وہ بھی مد محفوظ میں منتقل ہوگی
چنانچہ ۳۴ف سنہ کی سال مندرجہ صدر (۱۲۸۲ روپیہ) مد محفوظ میں منتقل کیگئی ہے ۔

قیام انجمن سے ابتک جس قدر ماہواری جلسے قرار پائے ہیں ان کی تفصیل حسب ذیل ہے

ماہ فروردی ۱۳۳۴ف سنہ "مدرس کے فرایض و ذمہ داریاں"

" اردی بہشت ۱۳۳۴ف سنہ "مقصد تعلیم"

" خورداد
" تیر
" امرداد

بوجہ تعطیل ماہ صیام و موسم گرما و امتحانات سالانہ کوئی جلسہ نہیں ہوا ۔

" شہریور ۱۳۳۴ف سنہ "تعلیم تاریخ معہ نمونہ کا سبق: ماہ مذکور میں شاخ چادرگھاٹ ہائی اسکول میں اس مضمون پر مسٹر ہنمنت راؤ پروفیسر نظام کالج کا لکچر ہوا تھا

ماہ مہر ۱۳۳۴ف سنہ "سزا"

" آبان " "انتظام جماعت"

" آذر ۱۳۳۵ف سنہ "طلبہ سے تحریری کام لینے کا طریقہ"

" دے ۱۳۳۵ف سنہ "جغرافیہ کی تعلیم معہ سبق نمونہ"

" بہمن ۱۳۳۵ف سنہ "ورزش جسمانی کے تعلیمی فوائد"

" اسفندار ۱۳۳۵ف سنہ "حساب کا روزمرہ کے کاروبار سے تعلق"

ماہ فروردی ۱۳۳۵ف - "مضمون نویسی کی تعلیم"

" اردی بہشت ۱۳۳۵ف "تعلیم حفظان صحت" بوجہ قرب ماہ صیام ماہ اردی بہشت ۱۳۳۵ف کا جلسہ ملتوی کیا گیا، شاخ چادرگھاٹ ہائی اسکول نے بوائے سکاؤٹنگ پر مسٹر کامٹ کے ایک لکچر کا خاص انتظام کیا۔ سالانہ کانفرنس اور اس کے ساتھ نمائش تعلیمی کا انعقاد، عرس کوہ شریف کی تعطیلات میں تجویز ہوا تھا مگر حضرت منجھلی صاحبزادی صاحبہ کی وفات حسرت آیات کی وجہ سے ملتوی کر کے تعطیلات عید الضحیٰ میں منعقد کرنے کا تصفیہ ہوا ہے جس کے متعلق انتظامات ہو رہے ہیں

مراسلات

(کشکول تجارب)

(از جناب مولوی ریاض الدین خان صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ٹی صدر مدرس مدرسہ وسطانیہ گوشہ محل)

میں سمجھتا ہوں کہ ہر صدر مدرس کو مختلف داخلی و خارجی مشکلات سے سابقہ پڑتا ہے اور اکثر ایسے انتظامی مسائل پیش آتے ہیں جنکے حل کرنے میں دل و دماغ اور وقت صرف ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے میری رائے میں مناسب ہوگا اگر رسالہ ہذا کے ذریعہ سے عنوان مذکور کے تحت میں اس قسم کے ذاتی تجربات بنظر واقفیت و استفادہ شایع ہوتے رہیں۔ اسمیں شک نہیں کہ فن تعلیم کے متعلق بکثرت نظریات و تجربات بہ آسانی دستیاب ہو سکتے ہیں مگر یہ عموماً غیر ممالک کی کتابوں کے تراجم کا نتیجہ ہوتے ہیں اور اکثر و بیشتر ہمارے ماحول سے موافقت نہ رکھنے کی وجہ سے ممکن ہے کہ عملاً کچھہ زیادہ مفید ثابت نہو۔ لیکن عنوان مذکور کے تحت میں جو مضامین درج ہونگے وہ ملک کے مقامی ماحول کے لحاظ سے زیادہ نتیجہ خیز ہوں گے مجھے امید ہے کہ اس تجویز میں دلچسپی لیجائیگی۔

انجمن اساتذہ مستقر بلدہ حیدرآباد دکن

کی

پہلی سالانہ کانفرنس

بصدارت عالیجناب نواب حیدر نواز جنگ بہادر صدر المہام فینانس سرکار عالی

بمقام سٹی کالج حسب ذیل تاریخوں میں منعقد ہوگی۔

اجلاس اول ۔ پنجشنبہ ۱۹ امرداد ۱۳۳۵ف افتتاح نمائش تعلیمی کے بعد یونے دس بجے صبح سے ساڑھے بارہ بجے تک ہوگا اس میں عالیجناب صدر نشین صاحب کی افتتاحی تقریر اور مولوی سید مرتضیٰ صاحب مرحوم کی بے وقت وفات پر اظہار افسوس کی تحریک کے بعد ایک مدارس کو اصول حفظان صحت کے مطابق تعمیر کرنے اور مدارس کے معائنہ طبی کے متعلق تحریکیں پیش کی جاوینگی

اجلاس دوم پنجشنبہ ۱۵ امرداد ۱۳۳۵ف سہ پہر ۲ بجے سے ۴ بجے تک ۔

ڈالٹن کے طریقۂ تعلیم پر جناب مولوی محمد عثمان صاحب بی اے اول مددگار نارمل اسکول بلدہ) اور حفظ اطفال پر جناب مولوی سید محمد حسین صاحب بی ۔ اے نائب ناظم تعلیمات (کی تقریروں کے علاوہ ہائی اسکول لیونگ سرٹیفکیٹ کے نصاب کی اصلاح اور

امتحانات ہائی اسکول لیونگ سرٹیفکیٹ و عثمانیہ میٹرک کے ممتحنین و ماڈرے ٹرس (موازنین) میں مدرسین کی کافی تعداد کو شریک کرنیکی تحریکین پیش ہونگی: ۵ سے ۶ بجے تک اسکاوٹ کا اجتماع (Scout Rally) ہوگا بعدازان عالیجناب نواب مسعود جنگ بہادر ناظم تعلیمات جاپان پر بذریعہ میجک لینٹرن لیکچر دینگے۔

اجلاس سوم۔ جمعہ ۲۰ امرداد ۱۳۳۵ف ۹ تا ۱۱ ساعت تعلیم اخلاق اور نظم و نسق مدرسہ وغیرہ پر تقریروں کے علاوہ مڈل کے نصاب میں تبدیلی کرنے کی تحریک پیش کی جائیگی۔

اجلاس چہارم۔ جمعہ ۲۰ امرداد ۱۳۳۵ف ۲ تا ۳ ساعت جغرافیہ کی تعلیم، تعلیم ورزش جسمانی کے متعلق تقریرین اور عثمانیہ میٹرک کی مدت تعلیم بجائے دو سال کے تین سال مقرر کرنے کی تحریک پیش ہوگی اس کے بعد تقسیم انعامات نمائش، عالیجناب صدر نشین صاحب کی آخری تقریر اور شکریہ و دعا۔ فقط

(از معتمد عمومی صاحب انجمن)

Obituary

At the time when we go to the press we hear of the sad death of Nawab Imadul Mulk Bahadur. We hope to publish a life sketch of the late lamented scholar and statesman in our next issue.

The First Annual Conference of The Teachers' Association

THE 1st Annual Conference of the Teachers' Association, Hyderabad-Deccan, will be held at the City Collegiate School on the 24th and 25th June, 1926 under the presidentship of Nawab Hydar Nawaz Jung Bahadur, Sadrul Moham, Finance. The programme includes a lantern lecture on Japan by Nawab Masood Jung Bahadur, Director of Public Instruction; a lecture on Child Welfare by Mr. Syed Mohamed Husain, Deputy-Director; a lecture on Physical Education by Mr. S. M. Hadi, Director of Physical Education and resolutions recommending a three years' course for the Osmania Matriculation Examination; modifications in the High School Leaving Certificate course and the Middle School curriculum.

MOHAMMAD SHARIF,

General-Secretary.

Divisional Inspector of Schools, who presided on the occasion, emphasised the need for preparation of lessons on the part of the teacher and explained the value and importance of the use of maps, black-board illustrations, pictures and coins for making the subject vivid and interesting to the boys.

Residency. "The Advantages of Physical Training" attracted a large number of members on the 30th Bahman. It was unanimously agreed that Drill and Games have a very valuable place on the School time-table for the physical and moral development of our boys. At the meeting on the 29th Isfandar, the subject discussed was "The Relation of Arithmetic with Daily Life." Much more could be done for the popularity amongst boys of this very important subject by a proper and more sympathetic attention to it in the lower standards.

Shah-ali-Banda. Comparisons between the physical Education of the East and the West were made during the discussion on "Physical Culture" at this branch. A good case was made out for the national and inexpensive games of India as aids towards physical development.

"Written Work" was also discussed and the exactness that writing makes and develops was stressed by more than one speaker.

Shahganj. Some difficulty was early experienced in obtaining lecturers and speakers; but thanks to the energies of the Secretary, Mr. S. Fakhrul Hasan, nine meetings were successfully carried through. Speeches in verse on the topics discussed have become a feature of the branch. We recommend the notion to other versifiers.

Three more branches, *viz.*, Chanchalgudda, Gosha Mahal and Mustaidpura have come into existence quite recently. We trust that the Local Secretaries concerned will try and make them a success.

been given to the branch by Mr. Ahmed Husain Khan, Mr. Shareef-ul-Hasan Burney and Mr. Shastri.

Darusshifa. A map prepared by the students of the Government High School was a special feature of the model lesson given by Mr. Riazuddin Ali in Bahman on the "Vegetable Produce of India." The usefulness of map-making by the students themselves was very successfully demonstrated.

Golconda. The year's work included lectures on "Teaching", "History" "Geography" and "Physical Culture." We commend the noble sentiments expressed by a lecturer at this branch to all teachers. "The aims of Education should be," he said, "to develop brain faculties, to make a man religious and pure in ideas, and a fit servant of his nation."

Islamiah High School. Eight meetings of the branch took place during the year. All were well attended. The subject that created most interest was on "Rewards and Punishments."

Mahboob College. In all ten meetings have been held beginning on February 25th 1925 when Mr. L. Edwards, B.A., Principal, Wesleyan High School, spoke on "The Duties and Responsibilities of a Teacher" and office bearers for the year were elected. At a later meeting when the subject was "The Teaching of Geography", Mr. K. Ayar, B.A. gave a model lesson on "Tundras and Animal Life." The meetings have been well attended and are rousing interest.

Nampalli High School. This branch has been doing excellent work. The attendance at all the meetings has been satisfactory. Model Lessons were given on the teaching of history, arithmetic and geography. The most successful meeting was the one at which the subject of teaching of history was discussed. Mr. Syed Ali Akbar

Branch Reports.

ALL the branches of the association report an interesting year's work. We regret that lack of space compels us to condense the reports as here.

Asafia. This young branch has made a fine start. "Arithmetic in Relation to Daily Life" was discussed at its first meeting. Excellent contributions to the discussion were delivered in Urdu and in English.

Bolarum. In spite of many draw-backs in the beginning, the year's work, on the whole, was quite successful. An appeal by the Secretary to the Central Association for access to a good reference library, and a plea for closer co-operation between the branches of the Association, speak well for the enthusiasm of the members.

Chaderghat. Mr. Abdul Latif of the Jagirdars' College delivered an instructive lecture on the "The Teaching of Geography" on the 10th Bahman. The lecturer pleaded for a more comprehensive lesson such as is given in Western countries at the present time. Professor Qazi Muhammad Husain of the Osmania University lectured on "The Teaching of Mathematics" at the Isfandar meeting. His advice was excellent, but subsequent speakers pointed out that it was a big handicap to have to keep one eye on ideals and the other on examination results.

Dar-ul-uloom. "Geography", "Physical Training" and "Arithmetic" were enthusiastically discussed at the meetings of the above branch. Very generous service has

Different Types of Boys.

There are four types of boys—the bright, the slow, the dull, the shirker. It is difficult to treat them individually, though A and B assignments or what is called the differentiated assignments may be of some help. This system has been described in the Twentyfourth Yearbook. It is in vogue at Wisconsin High School.

(*To be continued.*)

first introduced some pupils ran away before the daily session of the school was over. " To remedy this defect, " says Mr. Collins, " No penal measures really were taken. The culprits soon stopped it when they found it did not pay. At first they thought they would get new assignments every month, whether they finished the old assignment or not. When they found they did not, they gave up leaving early. Some teachers got out a departure register only for those who were behind with their work. Such boys could leave any time. But they had to enter the time of their departure, so that later it could be pointed out if necessary that their habitual early departure was responsible for their being in arrears."

DIFFICULTIES EXPERIENCED

Assignments.

1. *The Reproduction.* No good work can be done unless assignments are printed and distributed. Hence hectographed assignments are proposed to be discontinued at Armenitola.

2. *The Construction.* Teachers not experienced find it difficult to draw up assignments. This difficulty may be removed by standardised printed assignments. The value of the assignments is increased by arrangements for self-correction. If there is no provision for self-correction the amount of written work to be corrected by the teacher will be inordinately large. The remedy is a set of answers to exercises printed and distributed. The danger of copying may be removed partly by supervision and checked by monthly tests : The difficulty of correction of written work is a problem which has not yet been solved at Armenitola.

The existing text-books are not found suitable for working the plan.

(2) *Absence of Cram.* It is not always true. The average pupil gives very little time to the subject he likes least and just crams the thing he needs to.

(3) *Spirit of Co-operation.* There seems to be very little of this between pupils and pupils, though there is co-operation between pupils and teachers. At Armenitola duel desks are used, so two pupils are always together and this makes co-operation or partnership between pupils so much emphasised by McMunn possible. " Not only are there duel desks," says Mr. Collins, " but they are grouped so that 4 or 6 boys can co-operate and study-together, also a less number." There must be some arrangements under which backward pupils may obtain help from their bright friends.

(4) *Good Discipline.* Mere quietness and show of work do not ensure discipline for which there is so much scope in the Dalton plan. But as the sense of responsibility develops through the correct enjoyment of freedom allowed, discipline is bound to improve. This is ensured by good assignments. They secure interest to work and devotion to it. Discipline must improve with these conditions. Mr. Collins observes, "The Dalton Plan encourages self-discipline. There is little need for the other kind, as boys have freedom. I think, discipline is a much over-valued thing. Discipline is needed when numbers have to act under orders of a superior. The greater the number the stricter the discipline. In the class system discipline was absolutely essential. The success was in proportion to the discipline just as in an army. Discipline is necessary for an army. Military discipline is generally regarded as very good. But if there was no army, there would be no need of the discipline for the individual. Soldiers who are models in the army are the weakest individuals when they leave it. Self-discipline is the thing and the Dalton method developes this. There is little need for class discipline ". At Armenitola when the scheme was

the boys. It's nearly very little trouble for them to mark up their own. The reason we don't use them is (1) They are expensive. We have not got the money. These graphs must be fairly strong cards, and they must be printed and ruled. (2) We did not like to leave the responsibility on the boys till we discovered how far they were trustworthy. When after a year or so a proper atmosphere is created, we shall probably entrust boys with their own. At first the risk was too great. I don't refer to every boy but to a certain number."

(5) Test is indispensable. On no account should a pupil be allowed to begin the next month's contract without finishing the one in hand and without having it passed by the tutor. Sloppy work, if rejected, must have to be done over again.

(6) Formal lessons are useful and should not be discontinued altogether.

(7) The parents and guardians of pupils should be kept in touch with the useful features of the plan so that their sympathy may be ensured for the success of the plan. At Armenitola the Headmaster has met parental objections. But these are the results of misunderstandings. Objections are reduced to a minimum and support obtained in an increasing degree through parent-teacher meetings, lectures and articles in newspapers.

(8) "The right method", "the right atmosphere" and "the right attitude" (sympathy, patience and a smile in failure as also in success) are essential. The right method implies a class-room technique which ensures more supervision and less talk.

Criticism of Certain Advantages claimed.

(1) *Development of Initiative.* Not true for all pupils, because a pupil can be dishonest if he chooses to. There is no scope for competition, a strong incentive, though it is not an unmixed blessing.

Results and Possibilities.

Nothing can yet be said with accuracy about the results and possibilities of the experiment, but the following points seem to emerge from it so far :

(1) The school follows a mixed Time-table, that is, Dalton for the top four classes and traditional class methods for the lower four classes. But the Dalton seems to be popular for the following reasons :—

(*i*) the measure of freedom it allows ;
(*ii*) the domination of masters it eliminates ;
(*iii*) the extent to which it enables the pupils to advance at their own rate ;
(*iv*) the activity it ensures to the pupils ;
(*v*) the new spirit it introduces without scrapping the old machinery.

The comparative results of the Half Yearly Examinations under the traditional and Dalton schemes with the same set of pupils seem to be in favour of the latter.

(2) Much depends upon the specialists. Their whole-hearted interest and co-operation are the first essential for the success of the plan. It cannot be denied that the scheme is a strain on honest workers.

(3) The most difficult thing is to prepare assignments. These should prove of interest to pupils and should be so designed as to be finished in the time allotted. Constant modifications in the light of experience must always be made. The individual pupils must progress from task to task instead of term to term.

(4) The record system must be simple and not complicated and the task of keeping the record should at least at the initial stage of the experiment devolve upon teachers and not pupils. Miss Parkhursts' graphs are too many and too complicated. Mr. Collins makes the following remarks about graphs at Armenitola, " I think it is slightly too strong to say the graphs overburden

optional subjects the classes are very small. The Pandit takes Bengali in the morning and Sanskrit in the afternoon. There are very few boys reading Persian in the school, so the Maulvi has very little to do.

It will be evident from the work of the specialists that they take the extra subject in their special laboratory. Thus boys move to him to his Laboratory for the extra subject, though there is a laboratory for that subject in charge of some other teacher. For example, the Geography teacher takes English in his Geography Laboratory.

Assignments.

The Contract is for a month or for 95 hours covered by periods of 35 minutes to 50 minutes through 45 minutes. The monthly contract in each subject is divided into units to be done in the fixed time. A unit of work roughly corresponds to what a pupil is likely to do daily in a subject. A pupil must have to finish his assignment before he is allowed to proceed to the next. The units imply actual working days ; absence is not counted.

Checks.

There are simple devices called Checks or graphs to measure up pupils' work. These Checks or graphs give an idea of progress of the pupils and the pupils themselves can visualise their positions. It is for the specialists to fill these graphs. The pupils are not entrusted with this work. The graphs serve as incentives.

Tests.

There are arrangements for monthly tests which are compulsory. A member of the staff of the College sets Tests and corrects them. These tests are of course based upon monthly contract sheets.

Thus for these subjects $9\frac{1}{2}$ hours are available every week for *Free-study.*

Division III. 3·30—4 P.M. Reserved for formal lessons and drill for five days a week.

Thus there is provision for Free study of $23\frac{3}{4}$ hours every week. Formal lessons are notified when need is felt for them.

At the West Green School, Tottenham, as in other Dalton schools, ordinarily allocation of time is made to different subjects. Thus at the West Green school 15 hours are devoted to Free study three hours a day, for five days a week. The time is thus distributed—

English	..	9 hours
Mathematics	..	3 do
History, Geography, Drawing.	..	3 do (one hour for each subject.)
Total	..	15 hours.

This allocation, it is pointed out, is of value as showing the importance of subjects and giving the idea of subject values to children. But at Armenitola distribution of time is not made subject by subject, because, as Miss Parkhurst points out, the "Time-set" should not be put in the hands of pupils for fear of depriving them of the opportunity of learning to budget their time to better advantage.

Laboratories and Specialists.

Each laboratory is in charge of a specialist. This teacher takes his special subject of the Dalton classes and in addition one optional subject. Thus the teacher of English takes Hygiene, the teacher of Mathematics additional Mathematics (the same subject in this case). The teacher of Geography however takes the English of one class in the morning and his special subject in the afternoon. It should however be remembered that for

the old forms in accordance with the new spirit. The main point that has been kept in view in carrying out the investigation is to instruct children *en masse* and at the same time reach each individual effectively.

Organisation.

The first top four classes VII-X have been Daltonised in—

(1) English Literature and Formal English,
(2) Mathematics,
(3) Vernacular,
(4) History,
(5) Geography and
The Optional subjects allowed in the Matriculation.

The Time-Table.

The Plan does not really abolish the time-table for classes retained, but it does not for this reason follow it rigidly. Enough freedom is allowed within certain definite limits. Thus for *Free Study* the following distribution is available.

The daily session of the school has three divisions—

Division I for English, Mathematics and Vernacular. For six days of the week.

(*a*) Mondays to Thursday : 10–45 to 1–15 or 2½ hours divided into *three* periods of 50′ each.

(*b*) Fridays : 10–45 to 12–30 or 1 hr.–45′ minutes divided into two periods.

(*c*) Saturdays : 10–45 to 1–15 or 2½ hours divided into three periods of 50′ each.

Thus for these subjects 14¼ hours are available every week for *Free Study*.

Division II for History, Geography and Optional subjects. For six days of the week.

Mondays to Fridays 1·45—3·30 or 1 hour, 45′ minutes divided into *two* periods.

Saturday 1·45—2·30 or 45 minutes.

The Dalton Laboratory Plan at Armenitola, Government High School, Dacca

BY

G. BHATTACHARYA,

Professor, Training College, Dacca.

History.

THE Plan as described below has been in operation for about 9 months. It has been modified and adapted to suit the condition of the School and the city. It was tentatively tried in 1924 in a part of the school to ascertain its suitability for Bengal schools and to discover its strong and weak points. The present experiment is based upon the results of observations carried out in 1924.

The scheme is based upon the principle of auto-education. This auto-education is not to be confused with self-government in schools by Courts and Councils so much emphasised by Emancipationists. The principle of auto-education or self-determination in this case only touches the intellectual side principally. "The scheme of formal Self-government," says Dr. O'Brien, "with the paraphernalia of Chairman, Secretary, etc. will be rendered useless, if not unnecessary, where the healthy mind of the young child grows up in a right environment in an atmosphere of intellectual freedom with the wise co-operation of the teachers." Thus the Plan tries to do without scrapping the old machinery as much as possible. It merely puts the old machinery to new uses or re-shapes

are interested in the cause of education, and that it will not be long before public interest in the movement for adult education is sufficiently awakened to enable the Education Department to formulate a definite scheme and put it into force.

ment, it will not be possible to organise it with any reasonable chance of success. The monetary sacrifice involved will not really be so great as it appears at first sight, because, as I have already explained, the expenditure will be comparatively small. There is, however another sacrifice demanded of the educated classes, for they will be called upon to supplement by lectures the instruction given in the adult schools. I feel sure that there is no lack of public-spirited men in Hyderabad who will be prepared to give a little of their time occasionally for such social service. The co-operation of University students may also be enlisted for this purpose, especially during the vacations. It will be more difficult to find lecturers for the adult schools in the villages. But nearly all the important villages are visited frequently by touring officers, who may be asked to give talks to the pupils attending the local adult school on matters which are likely to be useful and instructive to them. The supply of a magic lantern to each adult school is out of the question; but there should be one in the office of each Inspector of Schools, who should use it in all the adult schools which he visits in the course of his touring work.

The establishment of a small library with a reading room attached in every important village and in each locality of a big town is essential for the success of the scheme under consideration. Without a library, the pupils, who have passed out of an adult school, will not get an opportunity of continuing their reading, and will consequently run the risk of relapsing into illiteracy. A library will also help them to improve the knowledge which they have already acquired, while the reading-room with a supply of newspapers will keep them in touch with the current events of their own and of other countries.

I trust that the suggestions which I have ventured to offer above will be carefully considered by all those who

thus imposed on them are taken into account in determining the number of periods for which they have to teach during the day. In exceptional cases, an allowance not exceeding Rs. 60 per annum is paid to them. Aided, municipal and Local Fund schools are also encouraged by Government by means of additional grants and contributions to open classes for adults. Finally, a large number of night schools have been established, mostly in rural areas, under the auspices of the Co-operative Credit Societies. One of these societies is reported to have gone so far as to resolve that any member who remains illiterate at the end of two years will cease to belong to the society.

Adult Education in H.E.H. the Nizam's Dominions.

The adult education movement has hitherto received practically no attention in His Exalted Highness the Nizam's Dominions. A possible objection may here be raised that as the proportion of boys and girls under instruction to the male and female population of school-going age is only about 32 and 5 respectively, would it not be better to concentrate our efforts on the expansion of primary education for children? The urgency of the problem of educating those children who are being brought up in ignorance can hardly be over-stated. Its solution lies evidently in making primary education compulsory. But we need not postpone the introduction of adult education until there is a sufficient increase in the enrolment of the existing schools for boys and girls. In fact, as I have already indicated, the education of parents will itself lead to the universal education of the children.

Private enterprise in education is neither so common nor so successful in Hyderabad as in British India. On the other hand, in view of the requirements of the University and the existing schools, Government cannot bear the entire financial burden of adult education. Therefore, unless private individuals come forward to help the move-

be held, and literacy certificates may be granted to those who are successful.

In view of the appalling poverty of the masses in India generally and Hyderabad particularly, no fees should be levied from the pupils who attend an adult school. Such of them, however, as can afford to pay fees, may be induced to make voluntary contributions towards the general expenses of their school. These contributions will never be a substantial source of income. Nevertheless, it is possible to make the necessary arrangements for adult education without placing too heavy a financial burden either on the public or Government. The way to do this is as follows :—The hours of instruction for the pupils of an adult school will necessarily have to be in the evening, because during the day they will be engaged in earning their livelihood. Consequently, it will not be necessary to construct or rent a special house for such a school. The ordinary school building can very well serve for the purpose. Nor would the adults under instruction require separate furniture, as they can either sit on the floor, or, if need be, use the furniture of the school where their classes are conducted. Their requirements in regard to black-boards and teaching appliances can be met in a similar way. The lighting expenses will not be much, and may be defrayed either out of the contributions paid by the pupils or subscriptions received from other sources.

There is next the question of the teacher. In the Panjab where an adult class is attached to a Normal school, the teaching work is done by the students under training, so that they may, during the period of training, gain experience of teaching not only young children, but also adults. Classes for adults which are conducted in other Government schools are taught by members of the staff of those schools. Generally, the teachers give their services without remuneration, but the additional duties

give instruction to the former chiefly by means of play. Grown-up people require neither Froebel's gifts nor Montessori apparatus, but it is as necessary to make instruction interesting and attractive in their case as in the case of children. The teacher of adults, like the teacher of young children, should, therefore, make use of apt examples, illustrations and anecdotes to keep the attention alive. As regards text-books, books which have been written especially for young children cannot appeal to adults ; nor can the latter understand books in which educated adults are generally interested. Consequently there is a need for preparing special readers, which, from the point of view of language, would be as simple as the ordinary Primary school readers, but which would contain topics suitable for adults and, a far as possible, connected with their daily life and occupations. Such books have been written in Urdu in the Panjab. I have not had the opportunity of seeing them. But the conditions of life in the Panjab being different from those that obtain in the Deccan, I am afraid that these books would be no less unsuitable for our adults than are Munshi Gulab Singh's Urdu Readers for the boys and girls in our schools. Whether the scholars are children or grown-up people, their education should, as far as possible, be related to their environment. It is in view of this important principle that the Education Department has recently decided to prepare special readers for boys and girls who attend our schools. A similar plan will have to be followed for adults as soon as we are able to open a sufficient number of schools and classes for their education.

The experience of the educational officers in the Panjab is that with two hours daily for six days in the week, the average adult takes about six months to finish the course outlined above. The chief aim should be to put the pupils on the way to reading easy books and newspapers within this period. At its close, an easy test may

which separates the masses from the educated classes in India to-day. The last, and to my mind, the most important advantage of adult education is that after the parents themselves have been subjected to the process of education, they are certain to take more interest in the schooling of their children and also to bring them up under better conditions than they do at present. The education of adults is, therefore, necessary not only in their own interests, but in the interests of their children.

Curriculum, Method and Organisation.

What is generally understood by 'High' education is obviously out of the question for adults who have had little or no schooling at all. Nor would the ordinary curriculum of the Primary classes be suitable for adult schools, where subjects like Story-telling and Object-lessons would serve no useful purpose. Instruction should be confined to the three Rs, *i.e.* the elementary principles of reading and writing and the arithmetic of every-day life. But apart form this regular course of studies, weekly lectures should be organised with a view to giving the pupils the necessary information about all those matters on which their physical, social, economic and moral well-being depends and awakening in them a living and intelligent interest in their environment. The subjects that are likely to prove interesting and instructive to them are history, geography, hygiene,child-welfare, agriculture (in rural areas), local industries, cooperation, local administration and temperance. The lectures should, as far as possible, be illustrated by magic lantern slides ; while those who deliver them should take particular care to employ the simplest language they can, and under no circumstances, to talk above the intelligence of the pupils.

Needless to say, the method of teaching which is effective for young children cannot be suitable for adults. We

and write, what we have to aim at at first is an increase in the percentage of the literate population. It has been felt for a long time that India cannot make any political or economic advancement so long as the masses are steeped in ignorance. In recent years, therefore, education has been made free and compulsory in many parts of the country. But this measure, though useful in itself, is not an adequate weapon with which to fight the battle against illiteracy. At any rate, the removal of illiteracy by this method alone will take a very long time. Meanwhile, the problem has become pressing in British India owing to the introduction of the Montagu-Chelmsford Reforms. It is now being generally recognised that for the success of these reforms and the self government which, we all hope, will follow them, it is necessary that those who are given the franchise should know how to exercise it intelligently and be in a position to understand the interests of the country. For these reasons, the movement for educating the illiterate adult has received much attention in British India during the last five years, and schools and classes for adults have been opened in nearly all the provinces. But nowhere has his movement made such rapid progress as in the Panjab, where there are at present nearly 2,000 adult schools with a strength of over 50,000.

Advantages.

If facilities were provided for adult education, they would not only help those who have never received any education at all, but those who, owing to lack of opportunities of continuing their reading and writing, have relapsed into illiteracy soon after leaving school. Moreover, by attending lectures which, as will be explained later, form an essential part of the programme of adult education, adults who have received only elementary education in their younger days, will get an opportunity of improving their knowledge. The widening of the mental horizon of the masses thus brought about will tend to bridge the intellectual gulf

Adult Education

BY

SYED ALI AKBAR, B.A., (CANTAB.)
Divisonal Inspector of Schools, Hyderabad-Deccan.

The Aim of Adult Education.

BY Adult Education is meant the education of persons who have reached maturity after a period of scanty schooling or no schooling at all. In a country where literacy is universal the aim of the movement is to add to the information which people have already gained at school in their younger days. England, for example, has enjoyed the benefits of free and compulsory elementary education since 1870, with the consequence that to-day hardly any adult is illiterate in that country. The Adult Education movement in England, therefore, aims at " fitting each individual progressively not only for his personal, domestic and vocational duties, but, above all, for those duties of citizenship for which these earlier stages are training grounds." The enlightened public opinion which exists in England to-day and the patriotism and sense of duty which characterise the English people are due not only to the Elementary Education Act of 1870, but also to the Extension Lectures which the Universities of Oxford and Cambridge have provided annually for nearly half a century and the work done in recent years by the Workers' Educational Association, National Adult School Union, Y. M. C. A. and various other organisations.

On the other hand, in India, where only 12 per cent of the male and 10 per cent of the female population can read

skies of the north ; and perhaps, in part, it explains the subtle, delicate coloured line drawings of the East. The glories of Eastern art are her Architecture and Sculpture. It has been said that students of the history of art are fettered by the limitation of their Mediterranean outlook. The art of the East is only beginning to receive the attention it deserves. And that is all the more reason why something more should be done for the cultivation of taste and art appreciation in the schools. Show the boys the pictures of the glories of Agra and Ellora, of Gujrat, of Elephanta and Vellore. There are many omissions from this list, I know. It is merely suggestive. And points of any of the works of Donatello, Michael Angelo, Boticelli, Leonardo, Titian, Rembrandt, Corot and Turner, will give you a good start towards a representative western collection.

you will have collected by the end of a fortnight will suit as a beginning of your class-room beautiful. Too many should not be exhibited at once and some at least should be changed every week. It is most desirable to obtain glazed hinged frames to hold three or four of your exhibits at a time. In that way you will save them from being rubbed or from collecting dust.

Though the value of these home-made pictures is very high, from the point of view of teaching art appreciation, they must be supplemented by the best examples of national and foreign art that can be obtained. Just as we insist on putting the best samples of poetry and prose before our boys, so let us show them the best that the world has achieved in art. We must not crowd the walls, even with Master-pieces. They must be few and hung low. They are best seen flat against the wall with a grey or light-green back-ground. The middle of the picture should be on a level with the average eye level of the class. They too ought to be changed frequently. The habit of the Japanese art-lover who stores his treasures and enjoys them on his wall, one at a time, for a week or so has much to commend it. It is well to remember that boys get tired even of playing the same game too often.

It is not difficult to obtain a good collection of prints or photographs of the best art of the East and the West. There are certain great works that are great beyond dispute. It would be advisable to try and obtain copies of them and to know something about them. It is said that Europe has produced the greatest pictorial art of the world on account of the white brilliance of the sun in countries south of Spain. The same reason is given for the finer colour work of the Venetians than of the Florentines who taught them art. The more northern Venice had a finer colour perception. The same reason again is given for the excellence of Dutch and British Landscape paintings, where delicacy of tint is more observable under the misty

zest to this, and the ascent to printing quotations from favourite authors, on a card with a simple border, is easily made.

But in spite of all the education that may have gone through before, and in spite of all the encouragement you give the class, you are sure to find some failures. A well known art-master was once heard to say that any boy who can write, can draw. If that is so, drawing should present little difficulties to Indian boys used to writing the beautiful forms of Urdu, Tamil, or Telugu. But again, even in Indian schools it is not unusual to find some boys who can't write, nor in consequence draw. Can anything be done for them ? They can be set to work with geometrical instruments to make patterns Try them on graph paper joining the diagonals of alternate half-inch squares. Then come down to the next row, miss the first square and join the diagonals of the second and go on. The boys will soon recognise that they have been pattern making. In a short time the creative instinct that has been handicapped will come along, on crutches, so to speak. A new interest is aroused and the drawing lesson is never again dull. Let them pick out alternate squares or triangles or segments of circles as the case may be, with one or two colours and you will frequently be astonished to find that the boy who " could not draw to save his life " has a fine appreciation of colour. His difficulty is accurate drawing and keeping his colour within bounds, and he can manage to acquire those with practice. Encouragement is for many boys the greatest factor in the production of artistic work ; and with a little guidance, the best way for them to learn to draw is, to draw. It is really like learning to ride a bicycle. You mount again and again after your first and listen to the encouraging technicalities of your coach.

The most artistic of the accumulation of " Copies," " Object Drawings," " Letterings " or " Patterns " that

for the drawing of common objects. The mass of a plantain or of an orange, for instance, is readily gauged by the developed sense of touch. At first, it would be well to confine the medium of reproduction of "copies" and common objects to coloured chalks. Chalks are cleaner and there are manipulative difficulties about water-colours that had better be deferred.

The children might also be encouraged to attempt "Lettering." The new script writing has great artistic as well as educational value. The letters are so direct and simple! They are made up of straight lines and circles or parts of circles, without flourish or exaggeration. The capital letters are particularly interesting. They are singly line letters, copied from the incised lettering of ancient Roman monuments. They do what they are intended for, so excellently, and they are so beautifully balanced and varied in width, that they make a striking artistic appearance by their simplicity. Have you noticed that the cross-bar in Roman capital A is always below the middle of the letter? It looks firmer than if that bar was at or above the middle. The top loop B is always smaller than the lower one. There is more balance than if they were equal. C is a circle with a part of the circumference missing. The middle bar of E and of F is more than half-way up the height of each. It gives lightness to them by preventing the heavy flag on a short pole appearance, they would otherwise have. The lower line in the letter K, drops from the middle of the other converging sideline, and gives it the firmness and stance of a swordsman. The upper semi-circle of the letter S is smaller than the lower one and the same balance is maintained in the smallness of the top triangle of X as compared with the lower one. Much more could be said of the beauty of the other letters, but enough has been written to show that the alphabet is interesting. Most boys print their names in their books and script adds a new

towards an ideal in at least one phase of modern existence, and this largely due to educational influences of the recent years. Appreciation of the things of beauty, a desire to blend that which is useful with that which is artistic; that is the most striking feature of popular taste and responsive industry."

Teachers in Indian schools can also help in the pursuit of this ideal. It is true that you cannot alter the ugliness of your school building if it is ugly, but the interior decoration of it may well come under your influence. In this the class-teacher can help the art-master. He can talk about the coloured reproductions in the Readers; he can try and find out, for instance, why the Taj Mahal, a drawing of which is usually given in the Indian History books, is considered to be so beautiful and let the boys know. He can also get them interested in the fine pictures that adorn most of the school library books. He can stir up their imaginations by stories and composition writing.

But after all, it is the art-master that has the best chance of improving the boys' tastes. He can get them to make their own pictures for the beautifying of the class-room. The creative instinct is very strong in boys. They like making things. The first attempts at picture-making will be crude, but with a word of encouragement, you will soon get fairly good enlargements of the pictures in their books. Because boys have a strong creative instinct, it is well to remember that they are highly sensitive about their own creations. It is fatal to be too critical about such rudimentary art. For the purpose for which they are intended they are more valuable than "La Giaconda."

The previous free-arm work in the Infant's class, drawing and writing in sand trays and the sensory education in the lower standards, modelling and weaving, will give muscle control and a high degree of sensitiveness to the fingers of the children, and these two are invaluable

Art in the Class-room

BY

THE REV. FATHER PAUL RYAN,

Rector, All Saints' Institution, Hyderabad-Deccan.

A DEFINITION of art need not trouble us here. We simply want to make a plea for beauty in school; for more interest in the Drawing lesson; and for the development of some notions of taste and art appreciation. A beautiful school atmosphere can be created. Simplicity should be the key-note. Harmonious colours on the walls; lightness and grace in the furniture; and pictures; all help. The result on the face of it may seem unimportant; but the brightness of the class-room is usually reflected in the brightness and mental alertness of the class. It is even claimed that there is a moral up-lift about the beautiful class-room and that children who get used to the beautiful in school will become more observant and more sensible of the beauty that is everywhere in nature. "Beauty lies in harmony," says Dr. Montesorri, "and harmony is refinement." And that is why the value of what is called "colour-work" and "Hand and Eye Training" has long been recognised in schools. Another thing, it is an easier and more attractive method than the old one and the children are much happier in school. It is education through additional senses that were not called upon for help up to then. This attractive method has already produced a popular taste in art and a desire for the beautiful which did not exist generally fifty years ago. "It is a pleasure" says a modern writer, "to discern amongst the un-inspiring aspects of modern life, a persistent progression

English teachers and writers to buy this Etymological Dictionary. It does far more than define and trace; it sets the imagination at play. Of all my books it is the only one annotated on every page, and it is one of the last I could bear to lose.

(*To be continued.*)

The Latin *villa* meant a farm-house, with all its pleasing suggestions, and *villanus* meant a farm-servant. But we should not think of calling the helpers in our Summer villas *villains*.

Words have very surprising connections with geography. In our speech of today many old place-names are preserved like flies in amber.

The word bungalow comes from the Hindustani *bangalah,* the adjective of Bengal. When we buy a *bronze* flower vase we little think of Brundusinm, the modern Brindisi. As we *roam* about these hills we forget that the word comes from the action of pilgrims walking to Rome. When we eat a *peach* we never think of Persia. The top story of an English house is called an *attic,* from the Attic order of architecture. When we say as black as *jet* we are using the name of a town in Asia Minor, Gahai (Greek gagates, French Gaiete, Jajet, jact, jet).

But the most astonishing derivation of all is that of the word *brilliant.* No one could possibly guess it, not even if he were told that it is connected with *beryl.* The Latin and Greek were *Berullos, beryllus,* Arabic *billaur,* meaning *beryl.* These came from an Indian word *veluriya* (Sanskrit *vaidurya,* said to be formed from Vidura, a place in South India, supposed to be Bidar.)

When we speak of a brilliant speech, a brilliant success, we little think we are coming to Hyderabad for our illuminating adjective. And the Sanskrit change from Vidura to Vaidurya (as Siva to Saiva, Vishnu to Vaishnava) passing to *veluriya* in Prakrit and surviving in *beryl* is a striking instance of an ancient phonological change surviving in English.

There I think we must leave our examination of simple words, though it would be possible to continue indefinitely, so vast is the English language, so deep in its roots and so widespread in its wanderings. Again I advise all

unite to form the name for the great need of American people in summer.

The word *nice* has a rather surprising origin. It is one of the commonest of English adjectives now, meaning pleasant to the senses. Formerly it meant simple, foolish, and afterwards fastidious, which is almost present in the expression *a nice distinction*. It came from the Old French *nice* : simple, ignorant, and that from Latin *nescius* ignorant—*ne* : not and—*scius* is from *scire* to know from which comes our word *science*. Also connected by various transitions of thought are *skill*, *scale* (of a fish), *shell*, *shelf*.

But you would hardly have expected *nice* to be connected with *skilful*.

These facts which show the venerable nature of English words are recorded in our dictionaries. For a few rupees you can buy my old friend Prof. Skeat's Concise Etymological Dictionary of the English Language and there you can find many more curious words. For example, just as man has risen from forest and marsh to be a citizen, some words have grown grander down the ages. Many of our superlative words have this history.

Happy was once merely the adjective of *hap* : chance.

Ecstasy meant originally in Greek a standing outside.

The name Luther, which means so much to our missionary friends, meant in German a lute-player, and the word *lute* (Port. *alaude*) came from the Arabic *al*- the, and *ud* : wood or stick.

On the other hand some words have contracted in meaning. Jove or Jupiter (Greek : Zeus) was once the supreme God : now in English his divinity has departed from him and he remains chiefly in the exclamation *By Jove !* and the adjective *jovial*.

Now one of the most interesting and startling experiences of educated people is to realize for the first time the venerable nature of even the simplest and commonest words we are using every day. A small proportion of words, such as *mother*, *traffic*, *wonder* cannot be traced to their ultimate meaning, but the names of the most ordinary objects and events of daily and nightly use have the romance of distance, they are coloured by memories of the deep past, they lead us to far away regions.

It does not matter where we begin : whatever words we take we soon find that they are older than any buildings or any trees about us. Some of them, indeed, may be as old as human beings, though this is very doubtful.

What word is oftenest on our lips in the dog days ? A double word that you have taken from the English : Ice-cream.

> A sallow waiter brings me beans and pork.
> Outside there's a fury in the firmament.
> Ice-cream, of course, will follow ; and I'm content....
> O Babylon ! O Carthage ! O New York !
>
> *Siegfried Sassoon.*

Now we do not know much about the word *ice*. It is natural that it should have had a northern origin. In England and Germany the pronounciation is *ais*—but in the Scandinavian languages it is pronounced *is*.

But *cream* is a word with the loftiest connections. Can you guess the high word with which it is allied ?

Through the O. F. *cresme* (later créme) it goes back to Latin and Greek *chrisma ;* consecrated oil. Chrisma is the verbal noun of Greek *chrio* : I anoint, and *christos* was the past participle meaning anointed. Very few people know that *ice-cream* has any verbal connection with Christianity, or that some Northern speech and Greek

advertisements of text-books on English Composition and testimonials as to their value by eminent teachers written in such language and in such tone as to condemn them at the outset.

Plato writes, reporting Socrates :

'To use words wrongly and indefinitely is not merely an error in itself ; it also creates evil in the soul.'

The right voice of a man is to be heard in his words, and you know what Whitman said about the power of such a voice :

'Surely whoever speaks to me in the right voice, him or her I shall follow, as the water follows the moon, with fluid steps anywhere around the globe.'

Now today as a preliminary, I should like to do with you a little spade work in the soil of words. Joubert, the famous French epigrammatist, said :

'Like the fields, languages are enriched by digging ; to make them fruitful, when they are no longer virgin soil, we must dig deep.'

He may have meant by this one of two things.

The first is that people get into habits of using words in a superficial way without any recognition of their original force, and therefore we must examine the words we are using and see whether we are using them in the right way.

The second meaning Joubert may have intended to express is that with individual writers and periods the words and phrases in use tend to become atrophied,—to lose their real force because it is never exercised,—and so conventions and fashions of speech are established. In order to break away from these we must dig into the great treasure-mound of words; we must cast our nets into the ocean of words, so that we may replenish our vocabulary and give our speech and our writing a new vitality.

whether in word or deed or silence,—are symbols—that is, they have other meaning and value than those we set upon them from day to day. Biology bears this out ; there are reasons in past life for every mood or gesture, every disfigurement or turn of beauty which characterizes those about us.

In A. E. Housman's *A Shropshire Lad* there is a poem of a very unusual kind which illustrates this :

> Ages since the vanquished bled
> Round my mother's marriage-bed ;
> Couched upon her brother's grave
> The Saxon got me on the slave.
>
> In my heart it has not died,
> The war that sleeps on Severn side ;
> They cease not fighting, East and West,
> On the marches of my breast.

[*The river Severn forms a part of the boundary between Wales and England.*]

And believing this I am bound to believe that even the least things we do or think today will leave their result thousands of years after we are gone. That is, as Algernon Blackwood has weightedly shown us in his rather carelessly written but intensely impressive story, the noble allegory entitled *The Sacrifice*, all our moments are part of some great ritual in which we, with the rest of nature,—the trees, the winds, the stars and the eternities beyond,—are taking part, though we can never know in this life the full meaning of that ceremony.

Further, I regard a knowledge of words and their meaning and use as of the first importance in education, now more especially than ever before, for there never was such a time of carelessness in the use of language, chiefly by writers in newspapers and magazines. I have seen

Words

BY

PROF. E. E. SPEIGHT, B. A.

[Being the first of three lectures on Poetry recently delivered to a gathering of teachers from H.E.H. the Nizam's Dominions.]

FOR us teachers words and their combinations have supreme interest because they form the medium through which our life-work is carried on. Single words, groups of them, or languages as a whole, are organisms possessed of unrealizable latent energy. Shelley has said :

> 'A single word may be a spark of inextinguishable thought.'

And we must not be deterred by those who depreciate words in comparison with deeds, for we must remember what our poets, with full conviction, have expressed :

Words and deeds are quite indifferent modes of the divine energy. Words are also actions and actions are a kind of words. *Emerson.*

> Who will not honour noble numbers, when
> Verses outlive the bravest deeds of men ?
>
> *Herrick.*

> The song that moves a nation's heart
> Is in itself a deed. *Tennyson.*

The poet could not sing the heroic warrior, unless he himself were an heroic warrior too. *Carlyle.*

These words I believe in the more strongly because I feel sure that all our self-expression—all our utterances,

it has to be caught. And it can only be caught from the man who has it. That is why certificates, testimonials, 'qualifications,' are so futile, if, behind them, they have not the man of force and integrity, of love for the high, scorn of the base, of a lively sense of his duty towards his fellows, of the admission of the right of his Maker to expect from him his best." "Depend upon it," continued he, "the children in our schools will be taught. They are being taught, the one way or the other, every hour of the day. And when they are old they will not depart from it. A man may forget all that is written upon the parchment of his mind but that which is first written. That remains. The first impressionable years are few. In those the teacher may write what he will, and it will be ineradicable; but afterwards—no! Once the child has reached the self-conscious, the shy age, and the influence you have over him is fragmentary and wavering compared with that firm hold of yours in his first years' prime."

The Schoolmaster, (London).

"GOOD teachers are formed by thinking and doing, far more than by reading and talking." For the greatest danger to which one who has settled down to teaching is exposed is that of acquiescing too readily in stereotyped ways of presenting, examining and correcting lessons, and success will only come to those who, in addition to indefinable gifts of personality and a natural liveliness and sympathy, are perpetually re-examining themselves and their ways and attributing the "comparative" failure to their own deficiencies. Nothing is easier or more common than to explain and to excuse want of progress in a class by enlarging on defects of ignorance, lack of previous grounding, sheer stupidity or wilfulness or alien home influences, and, in eloquently pleading the force of such considerations it is conveniently forgotten that by transcending just such obstacles do good teachers prove their mettle."

The Month, Longmans,—London.

cal appreciation of "The Ode to the Nightingale" or secondhand renderings of imperfectly understood "criticism" of Shakespearean tragedies.
(*The Schoolmaster*, London ; "Our Scottish Letter").

A SERMON FOR TEACHERS

"TRAIN up a child," began the preacher, declaring that he should get no further this night, at all events. "What is training?" he asked. "Not just teaching ; you may teach a child all that can be crammed into the curriculum, and still leave him untrained. And what is education ? Not instruction. A man may be thoroughly versed in the sciences and philosophies and still be miserably uneducated." He defined education as a "stabilising of the mental, moral and spiritual being, which would result in character, intellectual honesty, and religious insight." He declared training to be an affair of character. "There are," he said, "too many 'clever' people in the world. What the world wants is 'good' people. You may instruct a boy in handwriting and he may become an expert forger ; you may teach science and its learners may turn to the skilled manufacture of poison gas. A man may have all the 'ologies' at his fingers' ends, on his tongue's tip, and still be undependable or a rogue. What is the greatest asset of the English ? It is character. And, unless the schools are producing character they are failures. This used to be the parents' duty ; it is still the parent's duty ; but to-day 75 per cent. of the parents do not care a hang what happens to their children. But the teachers care. They must ! And they do. But I do not think that the teachers, willing, cheerful, hardworking, conscientious though they are, I do not think that, even yet, they realise to the full the exact, the sublime loftiness of their high calling." "But," continued the preacher, "to come to bed-rock, how do you teach character ? Well, you can't teach character. Character cannot be taught ;

enter the School of Art; the would be engineer, the School of Engineering, the would be doctor, the School of Medicine, and so forth; from which the students whose aim was any of these professions in their higher stages, would, after a process of careful selection, pass on to the University. Preparation for Government Service would rank as a vocational training just like Law, or Medicine, for which special institutions would prepare......Now what I venture to suggest is that the University should investigate and decide what number of people, with what kind of education, conducted on what principles, are required for the country's need in these different branches of work and that it should see that adequate provision is made for the education to that extent of that number only; so that the rest, instead of wasting their money and time in crowding these schools, might stop at the essential stage and become productive members of society."

(*Nawab Hydar Nawaz Jung Bahadur, Convocation Address, Lahore.*)

THE TEACHING OF ENGLISH

Two notable speeches on this subject have recently been delivered. At Inverness the Secretary to the Scottish Education Department, Dr. George Macdonald, appealed earnestly for much greater attention to the teaching of English, especially to the writing of it. Incidentally he hinted that essay-writing was not an ideal method of teaching composition. Dr. Steel, the President of the Educational Institute of Scotland, advanced what is essentially the same argument when at Edinburgh he contended that "style" was efficiency in expression. These speeches are significant. There can be little doubt that we have been overdoing the "appreciation of literature" stunt, which *superseded* the old formal grammatical approach to English. It is infinitely better to be able to write workmanlike English than to pour out reams of rhapsodi-

Educational Notes

ESSENTIAL EDUCATION

"TAKE for example what is called at present the Primary stage, which is now concerned with the elementary education mainly of small children. Under our existing system, primary education, if it has any object beyond entitling a boy to be entered on the census rolls as a literate individual, serves merely to qualify him for the secondary school; that is, take him part of the way the end of which would make him a qualified clerk. Beyond that, primary education as such has no goal whatsoever. It seems to me, gentlemen, that this first and most important stage of education, which I should prefer to call Essential Education, ought to include all subjects which are of primary importance—subjects, the knowledge of which is useful to every citizen of the State, whatever trade, calling or profession he or she may choose to follow, as tending to increased efficiency or better citizenship. It would thus include most of the present Middle School education and something even of the present High School courses."

(*Nawab Hydar Nawaz Jung Bahadur, Convocation Address, Lahore.*)

FUNCTION OF UNIVERSITY

"ON the completion of the special course thus designed, the boy would either leave school altogether for the practice of agriculture or some trade, for which the primary education so organised might be regarded as his technical education, or he would enter on a special course directed towards the profession he has in view. Thus the would be artist, after the completion of the essential course, would

nothing less than a religious work that the teacher has here to do—a work to be approached in all sincerity of purpose. Sincerity in a teacher is a far more educative quality than brilliance.

For Muslims, education is a religious duty both for the teacher and the taught, and it must indeed be so for every thinking man; for if the bringing out of the personality, which is the soul of a human being, the training of his mind and body, his introduction to the wonders of creation and the lessons of human history is not a religious matter in the opinion of any man, then that man's religion must be a mere side-issue, quite apart from truth and life. The best instruction, because the most educative, in any subject is that which conveys the most general knowledge of a kind to enable the student's mind to connect that special subject with the whole of life; and the best education is that which prepares a man to go on improving in knowledge, wisdom and character, whatever his vocation, during his whole life, thus " leading out " the best that is in him, cultivating the soul. In the words of the Holy Quran

قد افلح من زكها وقد خاب من دسها

> " He is indeed successful who *causeth* it (the soul) to grow.
>
> And he is indeed a failure who stunteth and starveth it.

M. PICKTHALL.

from within. The leading out of what? The leading out of the soul, the individual personality, from darkness into light, securing it full scope for growth, exercise and improvement. The teacher in a school may be a highly competent instructor, but he can only be one factor in the education of the boy; to which parents, home surroundings, comrades, pastimes and desires alike contribute. That is why the men of old considered that it did not so much matter what a boy was taught provided that he was taught something hard enough to exercise and rouse his brain and regular enough to give his mind a sense of order. But the teacher, here in India, has a nearer responsibility, and very often is the dominant factor in the education of a boy.

In England the schoolmaster's part was considered to be merely mental training and good discipline. The parents and the home surroundings did the rest. Here the schoolmaster's part is greater and of higher responsibility, because the parents in a great majority of cases contribute nothing useful to the education of the boys, while the home surroundings are in many cases detrimental. I should like to see a Parents' Council, such as they have in Germany, sitting with the headmaster once a month and plotting for the student's welfare. The parents all too evidently need reminding of the responsibility which is theirs of right, and of the duties which they cannot honestly evade or delegate. As things are, the weight of responsibility for the whole education of the boy, as well as his instruction, is thrown upon the school-master whose duty should be only to give mental and physical training and maintain discipline. This makes the school-master's task more interesting, but also much more serious and delicate, since it largely depends on him whether the bulk of the literate subjects of His Exalted Highness the Nizam and citizens of this great State shall be loyal, capable and trusty men or shallow opportunists. It is

English and that it did not really matter what a boy was taught provided it was something fairly hard. We were never taught English grammar; we were told in so many words, that it did not exist, the so-called English grammar being only an attempt to apply the standards of the Latin grammar to the English language for the benefit of a class of people who were accustomed to bad English in their homes, and so stood in need of correction in that respect. The grammar schools of England, including the great "Public Schools," taught Latin and Greek, but never English grammar. Those ancient languages were given to the boys as something hard is put into the mouth of a teething infant; to try the teeth on, not to be devoured. The teeth, when tried, were for pure English use.

Similarly, one of the most enlightened men of Europe in the nineteenth century is credited with having said:

"No man can be said to have a fully cultivated mind who has not studied either ancient Greek or Arabic or Sanskrit," those languages being, in his opinion, the only three which really deserved the name of "learned languages." The study was for the cultivation of the mind rather than the acquisition of the language. This ideal of youthful education as a cultivation of the mind which, when cultivated, will become acquisitive and possibly productive on its own account rather than as an end and object in itself has largely given place, in these days of competitive examination, to the glorifying of a kind of instruction, which rather resembles the stuffing of a fowl for a specific purpose and against a given date, after which the fowl is done with and we hear no more of it. After the examination the boy's education is regarded as finished, though often it has hardly been begun.

Instruction and education are two different things. Instruction means the building in of something from without. Education means the leading out of something

of a teacher play in the lives of those who come into contact with him as his pupils.

The first duty, therefore, of a teacher who wishes to do his work efficiently is to be always examining himself to see whether he has succeeded in removing from his own life those defects which he is trying to remedy in the character of his students. Unless this is done the ties that bind the teacher to his students will continue to be as hollow and as meaningless as I am afraid they are in the majority of the schools of our country.

In the olden days, when a *chela* had to live almost as a member of the household of his *guru*, the teacher had more time at his disposal than he is allowed to-day, not only for transmitting literary knowledge to his pupils, but also for the more vital work of moulding their character. But though the time at the disposal of the teacher has been greatly shortened, yet the importance of the task entrusted to him remains as great as ever. What then is he to do ? My answer to the question is that he has to develop in himself, in a stronger form than the old *gurus* had done, those qualities and feelings which he desires to develop in his pupils. Strength of conviction, which is the basis of all lasting knowledge, and sincerity, which is the greatest destroyer of all that is false in human relations should be his watchwords. In these alone will be found the solution of the many problems with which our teachers are faced to-day.

MASOOD JUNG.

II

IN England in old days, boys who complained of Latin and Greek as a needless burden, used to be told that the study of those languages was the finest mental training, that they were necessary to a grammatical knowledge of

The Teacher's Part

I

ONE of the best ways in which the cultural position of a nation can be correctly gauged is by finding out what that nation is doing for those that are unable to help themselves—for its children, its women and its cripples. If this test is applied to us in India, I am afraid the position allotted to us amongst the cultured nations of the world will not be a very dignified one.

Now I am one of those who believe that in the India of to-day no body of men can do more good to their country than those engaged in the noble profession of teaching, for it is to the teachers that society has entrusted the important work of moulding the character of the rising generation. Thus, in our country, as indeed in all the countries of the world, the responsibility on the teachers as a class is a very heavy one. Let us see what is it that they can do to discharge it efficiently and honourably.

Many years ago, when I was the Headmaster of a school and had to come into daily contact with boys, the truth was forced upon me, as the result of my personal experience, that it was not possible for me to give to the boys that which I did not myself fully possess. This applied to things physical as well as to those spiritual. I discovered that if I wanted my students to be strong it was necessary for me to be strong, and that if I wanted them to love their mother-land it was necessary for me also to love my mother-land.

In this way I was made aware of the exceedingly important part which the personal character and feelings

where the material rewards are greater. But, emphatically, there is no profession of more weighty service to the State, the country and humanity ; there is no profession in which more unselfish devotion, patience and intelligence are required and generally found ; there is no profession more deserving of respect, and of respectful hearing than that of men who are earnestly working for the future of the country through the education of its youth. *The Hyderabad Teacher* is intended first of all for the teachers to be a place for the discussion of their aims and difficulties. But it also cannot fail to be of interest to everyone in these Dominions who cares for the great cause of education, which our sovereign has so much at heart. The magazine is beginning in a small way ; the space we can as yet afford is narrow. So we must advise contributors to make their contributions short and pithy, rather than diffuse—we have no room for lengthy dissertations—and to the point, which is the present need of education. We trust that it may prove of interest, and use to teachers, and may grow in time to be of real value to the State and public.

The Hyderabad Teacher

BY

M. PICKTHALL,

Principal, Chadderghat High School.

THE Hyderabad teacher has become a power in the land owing to the enlightened policy of His Exalted Highness by which education has advanced by leaps and bounds in these dominions in the last few years, but he has till now been inarticulate and isolated. By the formation of the Teachers' Association he has gained a corporate existence and now, by the foundation of this magazine, he has acquired a voice which will be heard throughout the country. There are problems of education which can be solved only by the authorities, but there are others, and a greater number, which the teachers alone are in a position clearly to understand, and which can therefore be solved only where the teacher's voice is heard. It is with a view to the discussion of such problems that it has been decided to found first the Hyderabad Teachers' Association, and now this magazine, designed to be the organ of the said association and therefore called *The Hyderabad Teacher*. In India, in old days, the teacher was paid no salary ; he was supported by gifts from the parents of his scholars ; but on the other hand, he was treated with immense respect and reverence. In these days he is paid a salary, but because the salary is generally small and it is the custom to judge everything by the standard of rupees, annas and pies, people nowadays are apt to regard the teaching profession as inferior to some other professions,

THE HYDERABAD TEACHER

CONTENTS

Vol. I.] Amardad 1335 Fasli [No. 1.

Under the Patronage of
Nawab Masood Jung Bahadur,
Director of Public Instruction

The Hyderabad Teacher

Quarterly Magazine of The Teachers' Association,

Hyderabad-Deccan

Editorial Staff :—

M. PICKTHALL
FATHER PAUL RYAN
SYED NADEEMUL HASAN

HYDERABAD-DECCAN
GOVERNMENT CENTRAL PRESS
1926

(رجسٹری شدہ سرکار عالی نمبر ۱۴۷)

حیدرآباد ٹیچر

انجمن اساتذہ حیدرآباد دکن کا سہ ماہی رسالہ

(مرتبہ)

سید ندیم الحسن تاثیر رضوی بی۔اے (عثمانیہ)

اعظم اسٹیم پریس چار مینار حیدرآباد میں طبع ہو کر دفتر انجمن اساتذہ واقع صدر مہتممی تعلیمات سے
شائع ہوا

غایات

(۱) طبقۂ اساتذہ کے احساس معلمی کو بیدار کرنا۔

(۲) طبقۂ اساتذہ کے مخصوص انفرادی تجربات معلمی کو شایع کرنا۔

(۳) فن معلمی پر نفسیاتی حیثیت سے نقد و نظر۔

(۴) انجمن اساتذہ کے مفید مضامین کی اشاعت۔

(۵) انجمن اساتذہ کے مقاصد و اغراض کو ملک کے طول و عرض میں مکمل طور پر پھیلانا۔

اصول

(۱) رسالہ کا نام "حیدرآباد ٹیچر" ہوگا اور ہر سہ ماہی پر صدر دفتر انجمن اساتذہ سے شایع ہوگا۔

(ب) رسالہ کی سالانہ قیمت بہ تفصیل ذیل ہوگی:-

(۱) اندرون ممالک محروسہ سرکار عالی: تے سکہ عثمانیہ سالانہ و ۱۲ر سکہ عثمانیہ فی نسخہ معہ محصول ڈاک

(۲) بیرون ممالک محروسہ سرکار عالی: تے سکہ انگریزی سالانہ و ۱۲ر سکہ انگریزی فی نسخہ علاوہ محصول ڈاک

(ج) رسالہ نصف انگریزی و نصف اردو ہوگا جس میں حسب صوابدید تغیر بھی ہو سکیگا۔

(د) صرف وہی مضامین درج ہو سکینگے جو تعلیم و تعلم سے متعلق ہوں اور جنمیں ملک کے مفاد تعلیمی کے لحاظ سے ندرت اور جدت ہو۔

(ہ) رسالہ کا حجم باعتبار مفاد و دلچسپی رہے گا رسالہ اپنے کو کسی خاص حجم کا پابند اس لئے نہیں کرتا کہ غیر مفید یا اقتباسی و ترجماتی مضامین کی بھرتی اس کا مقصد نہیں ہے۔

(و) اشتہارات کا نرخ حسب صفحہ (۴۰) اشاعت ہذا رہیگا۔

فہرست مضامین

جلد (۱) | بابتہ ماہ آبان ۱۳۳۵ف | نمبر (۲)

تصحیح تسامح

قارئین کرام اس امر کو نظر انداز نہ فرمائیں کہ مخاطبات کے ضمن میں صفحہ ۳ سطر ۴ کے شروع میں کلمہ "پہلی نشست" نیز صفحہ ۱۲ سطر ۱۶ کے شروع میں کلمہ "چوتھی نشست" سہو کتابت سے نظر انداز ہو گیا ہے جو اگرچہ نفس بحث پر اثر انداز نہیں ہے۔ تاہم ترتیبًا ہونا انسب تھا جس کی تلافی بذریعہ تصحیح ہذا کی جاتی ہے فقط

خاکسار

مدیر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مخاطبات
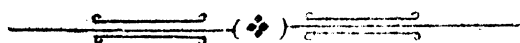
ہماری پہلی سالانہ کانفرنس

عام حالات انجمن اساتذہ بلدہ کی پہلی سالانہ کانفرنس کا انعقاد ۱۹ و ۲۰ ار امرداد ۱۳۳۵ف کو بمقام سٹی کالج عمل میں آیا۔ کثرت سامعین اور غیر معمولی دلچسپی و سرگرمی کے لحاظ سے یہ پہلی سالانہ کانفرنس نہایت کامیاب کہی جاسکتی ہے اور جن اہم اغراض کے مدنظر خود انجمن کی تاسیس اور اس کے بعد اسکا اجلاس عمل میں آیا تھا وہ بہمہ وجوہ جلسہ میں نمایاں رہے جس کا عملی اعتراف و اظہار جلسہ کی کارروائیوں اور ان تقریروں اور جوش وخروش سے ہوتا ہے جو مختلف تجاویز کی ضمن میں منجانب حاضرین عمیق دلچسپی کی صورت میں کی گئیں۔ بانیان جلسہ کی جو غایت

اس جلسہ سے تھی یعنی انجمن کے اغراض و مقاصد کا بحیثیت مجموعی اعلان اور انجمن کی حقیقی زندگی کی ملک میں اشاعت، بحمد اللہ یہ دونوں امور بوجہ احسن نہ صرف اندرون ملک بلکہ ایک حد تک بیرون ملک میں بھی انجام پائے اور ہم کو امید ہے کہ رسالۂ ہذا کی اشاعت کے بعد سے اور بھی اسمیں وسعت ہوتی جا رہی ہے۔ جلسہ کے انعقاد سے پیشتر تک انجمن محض نوجود تھی مگر جلسہ میں اس کی شان ایک قدیم انجمن کی سی معلوم ہوتی تھی۔

خصوصیات نواب مسعود جنگ بہادر کا پر مغز لکچر جو مختصر "حالات جاپان" پر پہلے روز کی شام کو ہوا بلحاظ جامعیت، بلاغت اور دلچسپی کے اپنی نظیر آپ ہی تھا۔ نواب صاحب موصوف نے جاپان کے اخلاق، معاشرت رسوم و عادات اور بادشاہ پرستی اور عام صفائی و نفاست و پاکیزگی وغیرہ پر نہایت دلچسپ پیرایہ میں روشنی ڈالی اور فرمایا کہ باہمی تنازعات اور چھوٹے چھوٹے جھگڑوں کا جاپانی لوگ نام بھی نہیں جانتے، سامعین کی تعداد کثیر تھی لکچر کے بعد میجک لینٹرن کے ذریعہ سے نواب صاحب موصوف نے جاپان کے مختلف مناظر اور مواقع نیز مجالس بھی دکھلائے جو معلومات اور دلچسپی کے لحاظ سے بے نظیر تھے۔ (نواب صاحب موصوف کے لکچر کا اردو میں ترجمہ ہو گیا ہے) بوائے اسکاؤٹس کا اجتماع بھی خاص دلچسپی کی شئے تھی اور دنیائے عمل کے مختلف امور میں جس چستی اور احساس فرض کا اظہار ہونا چاہیئے وہ سب بوائے اسکاؤٹس ریلی (اجتماع بوائے اسکاؤٹس) میں دکھایا گیا تھا

اور "ڈائمنڈ تھیف" کا منظر نیز فرسٹ ایڈ کا سماں بھی مکمل طور پر نہایت خوبی سے دکھایا تھا۔

جلسوں کی کارروائیاں

سب سے پہلے جناب صدر نے "نمائش تعلیمی" کا افتتاح فرمایا۔ جس میں طلبہ کی دستی صنعت اور صفائی کے کامل اور خوشنما نمونے موجود تھے اور نہایت ترتیب اور سلیقہ کے ساتھ رکھے ہوئے تھے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ طلبہ نے علاوہ تعلیم کے ہاتھ اور نگاہ کے استعمال میں کس قدر ترقی کی ہے۔ نمائش کے انعامات کی تفصیل اپنے موقع پر شایع ہوگی۔

افتتاح نمائش کے بعد باقاعدہ آغاز اجلاس کا انتظام عمل میں آیا اور سب سے پہلے قرآن مجید کی تلاوت اور بزبان سنسکرت حمد خوانی عمل میں آئی اس کے بعد محمد یکتھال صاحب صدر مجلس استقبالیہ نے اپنے تقریری ایڈریس میں ملک کے مختلف اجتماعی مجامع کا تذکرہ کرتے ہوئے نواب حیدر نواز جنگ بہادر صدر جلسہ کی تعلیمی دلچسپی پر بوضوح روشنی ڈالی اور فرمایا کہ وہ صرف ایک بہت بڑے ماہر مالیات ہی نہیں بلکہ ایک اعلیٰ ماہر تعلیم بھی ہیں اور ان ہی میں بہ حیثیت ماہر تعلیم ہونے کے ساتھ ماہر مالیات ہونے کی صفت بھی موجود ہے اور ہمیشہ انہوں نے حضرت علی علیہ السلام کے اس مقولہ پر عمل کرتے ہوئے کہ "علم حاکم ہے اور مال محکوم" اپنی تعلیمی دلچسپی کو مالیاتی دلچسپیوں پر مقدم رکھا ہے۔

اس کے بعد معزز مقرر نے عماد الملک بہادر مرحوم کا بھی ذکر کیا اور فرمایا کہ مرحوم نہایت مفید تحریکات کے بانی تھے اور ان کی ذات سے ملک کے

بیحد فوائد حاصل ہوئے۔ اس کے بعد صاحب موصوف نے عام طور پر اساتذہ کی تنخواہوں اور ان کی تعلیمی دلچسپی نیز طلبہ و اساتذہ کے مابین تعلقات کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ جب تک اساتذہ میں باہم اتحاد عمل نہ ہوگا تعلیم کا منشا پورا نہیں ہوسکتا اور اسی غایت کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے انجمن اساتذہ وجود میں آئی ہے اور اسی اعتبار سے رفتہ رفتہ ہم اندازہ کرسکیں گے کہ ہم نے بحیثیت استاد کہاں تک کامیابی حاصل کی ہے۔

اس تقریر کے بعد انجمن کے معتمد صاحب عمومی نے انجمن کی سالانہ رپورٹ پڑھکر سنائی جو سنہ ۱۳۲۴-۲۵ ف پر حاوی تھی اور جس میں انجمن کے آغاز و بنیاد سے لے کر اب تک کا مجمل حال تھا۔

رپورٹ کے بعد جناب صدر نواب حیدر نواز جنگ بہادر کا قابلانہ ایڈریس ہوا جس میں آپ نے فرمایا کہ تعلیمی مقاصد کی ترقی میرا سب سے پہلا فرض رہی ہے۔ نیز آپ نے انجمن اساتذہ کی اہمیت اور اس کی عملی جد و جہد پر بھی زور دیا اور تعلیمی غایات کے حصول میں جو اہم حصہ نواب عماد الملک بہادر مرحوم اور مولوی سید محمد مرتضیٰ صاحب مرحوم نے لیا اس کا بھی تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ بمقابلہ چند سال پیشتر کے تعلیم نے آجکل ہر طرح سے ترقی کی ہے جیسا کہ اعداد و شمار سے صاف صاف ظاہر ہے۔ از انجملہ جامعہ عثمانیہ کا قیام ہے جس کے اندر کلیتہً ہندوستان کے تعلیمی مسائل کا حل پوشیدہ ہے۔ معزز مقرر نے موجودہ ترقیوں اور عام تعلیمی جد و جہد کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ مسئلہ تعلیم کے لئے باہمی رواداری اور اخوت

بہت ضروری ہے، مسئلہ تعلیم میں فرقہ واری خصوصیات کو داخل کرنا ہمارے تعلیمی روایات کے برخلاف اور تعلیم کے لئے نقصان رساں ہے، تعلیم کے مفاد میں ہندوستان کے کل فرقوں کو متحد ہوکر کوشش کرنا چاہیئے اور فرقہ واری مدارس کو معدوم کرکے ہر تعلیم گاہ کا دروازہ ہندوستان کے تمام مذاہب اور فرقوں کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہیئے، اس میں کسی فرقہ واری امتیاز کو مطلق دخل نہ ہونا چاہیئے، بعد ازاں معزز مقرر نے اساتذہ کی اہم ہستی پر زور دیتے ہوئے فرمایا کہ دکن کا مستقبل تمامتر اساتذہ ہی کے ہاتھوں میں ہے۔ اور اس اعتبار سے اساتذۂ دکن کی مختلف حیثیتیں ہیں، مثلاً اساتذہ کی عزت و وقار، اساتذہ کی خودداری، اساتذہ کی شخصیت، اساتذہ کی جدید پوزیشن بمقابلہ قدیم پوزیشن کے، اُن کی عمیق دلچسپی، انکا سوسائٹی کا جزو لاینفک ہونا، اپنے اُنکا آیڈیل بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ معلمی محض ایک پیشہ ہی نہیں ہے بلکہ اس کو غایت کی رفعت کے لحاظ سے ایثار اور قربانی کا مکمل نمونہ ہونا چاہیئے، نیز اساتذہ کے لئے لازمی ہے کہ وہ اپنے مقاصد تعلیمی پر نظر کرتے ہوئے بالکل آزاد اور بے لوث زندگی بسر کریں، آپ نے نصیحت فرمائی کہ تعلیم کو مذہبی اختلافات سے الگ رکھنا نہایت ضروری ہے جس کے بغیر عام اتحاد عمل نہیں ہوسکتا؛ نیز طلبہ کی ورزش اور اُن کی صحت پر بھی خاص زور دیا۔

خطبۂ صدارت کے بعد نواب عماد الملک بہادر مرحوم اور مولوی محمد مرتضےٰ صاحب مرحوم کے متعلق اظہار غم و تعزیت کے رزولیوشن منجانب

صدر پیش ہو کر پاس ہوئے، بعد ازاں مجوزہ رزولیوشنوں کا سلسلہ شروع ہوا
جن میں سب سے پہلے سید ذوالفقار علی حقانی صاحب کا رزولیوشن مدارس کے
لئے موزوں بازیگاہوں اور مناسب عمارات کے متعلق تھا جس میں گورنمنٹ
سے ہر دو امور مذکورہ کی جانب توجہ کرنے کے لئے درخواست کی گئی تھی،
رزولیوشن کو پیش کرتے ہوئے معزز مقرر نے حسب ذیل امور پر خاص زور دیا:۔
(۱) عمدہ عمارت کے فوائد (۲) طلبہ کی دلچسپی کے لحاظ سے بازیگاہوں کی ضرورت
(۳) بازیگاہوں کا باعثِ ترقی تعلیم ہونا نیز ان کے جسمانی اور دماغی اثرات
(۴) طلبہ کی صحت پر ان کا عام اثر۔ (۵) موجودہ حالت مدارس باعتبار مکانات
(۶) موصوف کا ذاتی تجربہ بہ حیثیت صدر نارمل اسکول اور اس کے بعد بلحاظ
صدر مہتمم ہونے کے نیز دیگر ذاتی تجربات۔ (۷) زائد مصارف کا مسئلہ
(۸) باوجود مصارف کرایہ وغیرہ کے مقاصد کا حاصل نہ ہونا۔

تجویز مذکور کی تائید مسٹر رگھون کی طرف سے ہوئی جنہوں نے فرمایا کہ
بہت کم مدارس ایسے ہیں جن کی عمارتیں ضروریات مدرسہ کو پورا کرسکتی ہوں
نیز یہ کہ ہر مدرسہ کے لئے اپنی ذاتی عمارت ہونا چاہیئے۔

تحریک و تائید کے بعد معزز صدر نے سامعین کو تجویز مذکور پر خامہ
فرسائی کی اجازت دی اور مولانا سید محمد مہدی صاحب زبیری نے اسٹیج پر تشریف
لاکر تجویز کی کچھ تائید کچھ تردید کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ صرف گورنمنٹ ہی کا
فرض نہیں ہے کہ عمدہ عمارت اسکول کے لئے فراہم کرے بلکہ خود پبلک کو

بھی اس خصوص میں اپنے فرائض کو محسوس کرنا چاہیئے۔

تجویز مذکور باتفاق آرا پاس ہوئی، اس کے بعد مسٹر آر چاری نے یہ تجویز پیش کی کہ مدارس کا باقاعدہ طبی معائنہ ہونا چاہیئے جس کو پیش کرتے ہوئے مسٹر موصوف نے طلبہ کی عام صحت پر روشنی ڈالی اور اُن کی جسمانی و دماغی کمزوریوں کے اسباب کو واضح فرماتے ہوئے باقاعدہ طبی معائنہ کی ضرورت واہمیت جتائی

جناب ڈاکٹر لطیف سعید صاحب نے تجویز مذکور کی تائید کرتے ہوئے مغربی ممالک کے معائنہ طبی کے اعداد بیان فرمائے نیز انگلستان کی رپورٹ کا تذکرہ بھی فرماکر ہندوستان کے اعداد وشمار سے اس کا مقابلہ فرمایا، آپ نے طلبہ کی خرابی صحت کے تین اسباب بیان فرمائے اول تو خود ان کی بے احتیاطی، دوسرے موروثی اثرات، تیسرے ہمسایوں کے تعلقات، طلبہ کی عام صحت کا تذکرہ کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ پرہیز علاج سے بہتر ہے۔ نیز یہ کہ مدارس کی بیماریوں کے رفع کے متعلق پبلک پر بھی بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

تجویز مذکور کی تائید مزید مولوی عبدالقیوم صاحب ہیڈ ماسٹر گنٹور گورنمنٹ ہائی اسکول نے کی اور فرمایا کہ معائنہ کی سخت ضرورت ہے اور طلبہ کی صحت کی ذمہ داری زیادہ تر اساتذہ یا والدین پر عائد ہوتی ہے۔ طبی معائنہ کے متعلق آپ نے یونانی ڈاکٹری اور ویدطریقوں کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ جس اصول پر آج کل برٹش انڈیا میں معائنہ کیا جاتا ہے ان میں بہت کچھ کمی ہے یعنی ڈاکٹر صرف معاوضہ سے بحث رکھتا ہے اور مدرسہ نیز طلبہ کی سہولت

سے زیادہ اپنی سہولت کو پیش نظر رکھتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک ہی ماہ میں سیکڑوں طلبہ کا معائنہ طبی ہو جاتا ہے جس کے بکثرت نظائر موجود ہیں، صاحب موصوف نے اسی ضمن میں کہا کہ گھوڑے کی سواری، تیرنا، چہل قدمی کرنا، کھیلنا کودنا تندرستی کے بقا و قیام کا باعث ہیں اور ایک قوم کو قوم بنانے میں تندرستی کو بہت بڑا دخل ہے۔

اس کے بعد مولوی وہاج الدین صاحب نے بطور ایک مذبذب موید کے (اس لئے کہ آپ نے صریح طور پر نہ تو تائید کی اور نہ مخالفت) فرمایا کہ محض رسمی طور پر معائنہ کرنے سے کوئی فائدہ نہیں بلکہ ہم کو عملی اور واقعی مشکلات کا احساس کرنا چاہیئے اور والدین کو طلبہ کی صحت کی طرف متوجہ کرنا چاہیئے، تحریک بغلبۂ آرا منظور ہوئی اور پہلی نشست ختم ہوئی۔

دوسری نشست دو بجے سے شروع ہوئی اور سب سے پہلے مولوی محمد عثمان صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ٹی کا لکچر ڈالٹن پلین پر ہوا۔ ڈالٹن پلین کی تفصیل کے ضمن میں آپ نے خاص طور پر بلحاظ رجحان، طالب علم کی حالت کے لحاظ سے تعلیم کو مخصوص کرتے ہوئے فرمایا کہ محض ضبط اوقات کی پابندی کرانا اور مقررہ مضامین کا پڑھا دینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ ہر طالب علم کے رجحان اور خاص دلچسپی کے مضامین پر بھی غور کرنا لازمی ہے جس کی تکمیل بذریعہ ترسیمات مقررہ کے ہونی چاہیئے جس کے لئے مخصوص معمل یا دارالتجربہ ہونا ضرور ہے۔ نیز فرمایا کہ مضامین کی تقسیم اور تدریج بھی بہت ضروری ہے اور ڈالٹن پلین ان ہی اصول و قواعد کی بنا پر

عمل میں آیا ہے، بعد ازاں مسٹر ہری ہر ایر نے ہائی اسکول لیونگ سارٹیفکٹ
کے امتحان میں سہولت پیدا ہونے کے لیے تین ہدایات کے ساتھ تحریک
پیش کی جس کی تائید مسٹر ہنمنت راؤ پرنسپل محبوب کالج نے کی اور اور مسٹر بھانو مورتی
نے بھی اسی موضوع پر تقریر کی مسٹر سید محمد اعظم صاحب نے تحریک کی مخالفت کرتے
ہوئے موجودہ امتحانات اور گورنمنٹ کی مشکلات کو بیان فرمایا کہ اس قسم کی تحریکات
کا عملی پہلو سب سے پہلے پیش نظر رکھنا چاہیئے، صاحب موصوف نے ایک ترمیم
پیش کی کہ گورنمنٹ کے سامنے اس مسئلہ کو پیش کرنے سے قبل اس پر ہائی اسکول لیونگ
سرٹیفکیٹ بورڈ کو غور کرنا چاہیئے، جناب مجوز نے اپنی تحریک کے الفاظ کو بدل دیا۔
اور تحریک مذکور ترمیم شدہ صورت میں پاس ہوگئی۔

اس کے بعد سید مہدی حسن صاحب زبیری کا لکچر "تعلیم جغرافیہ" پر ہوا جسمیں
جناب مقرر صاحب نے اس امر پر زور دیا کہ جغرافیہ کو بطور مضمون اختیاری۔ الیف۔ اے
اور بی۔ اے کے نصاب میں شریک کرنا چاہیئے، زاں بعد مولوی وہاج الدین صاحب
نے تحریک کی کہ اسکول لیونگ سارٹیفکٹ اور عثمانیہ میٹرک کے بورڈ امتحانات میں
مدارس کی تعلیم کے اصلی تجربہ رکھنے والوں کو بالضرور بحیثیت موازنین داخل کرنا چاہیئے۔
اس کی تائید مسٹر شاستری بی۔ اے۔ بی۔ ٹی نے فرمائی اور اس تجویز پر
بہت گرم تقریریں ہوئیں جو آخر میں بغلبہ آرا پاس ہوئی۔

اس کے بعد بوائے اسکاوٹس کا اجتماع ہوا اور سٹی کالج کے میدان میں
متعدد دلچسپ مناظر دکھلائے گئے جس کا تذکرہ اوپر ہوا۔ بوائے اسکاوٹس کے

اجتماع کے بعد مولوی عبد السلام صاحب ناظر گلبرگہ کے تحت میں دیسی کھیل دکھائے گئے جس سے حاضرین بہت محظوظ ہوئے۔ شام کو سات بجے نواب مسعود جنگ بہادر کا لکچر "اس حالات جاپان" پر ہوا جس کا تذکرہ اوپر گذرا اور جو اُردو زبان میں بھی پورا ترجمہ ہو چکا ہے۔ لکچر کے بعد صاحب موصوف نے میجک لینٹرن کے ذریعہ سے جاپان کے قابل دید قدرتی مناظر اور مصنوعی نظارے حاضرین کو دکھلائے۔

تیسری نشست تیسری نشست میں سب سے پہلے مسٹر محمد حسین جعفری بی۔ اے (آکسن) کا لکچر "حفاظت اطفال" کے مبحث پر ہوا جس میں صاحب موصوف نے نہایت قابلیت سے حفظ اطفال کے اُصول، خوبیاں، اور نتائج بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ تجویز ایک مکمل اسکیم کی طالب ہے جس کے لئے پبلک اور حکومت دونوں کو ملکر کام کرنا چاہیئے مثلاً بمبئی میں اس مقصد کے لئے گورنمنٹ نے (۱۵۰۰۰) اور پبلک نے (۲۰۰۰) روپیہ دیا۔ آپ نے فرمایا کہ مہذب ممالک نے اس تحریک کی سرسبزی کے لئے مختلف طریقے اختیار کئے ہیں، مثلاً تندرست بچوں کی ایک فہرست تیار رکھنا حفظ اطفال کا ہفتہ منانا تصاویر اور سنیما کے ذریعہ سے تشویق دلانا۔ آپ نے فرمایا کہ سب سے بڑی ضرورت اس کی ہے کہ نہ صرف والدین بلکہ پبلک بچوں کی صحت وسلامتی کو اپنا فرض سمجھے۔ بلدہ میں ایک مرکز حفظ اطفال قایم کئے جانے کی ضرورت جتاکر آپ نے فرمایا کہ بچوں کی کثیر تعداد خصوصاً دیہات میں پیدا ہوتے ہی مرجاتی ہے اور انکی عمدہ نگہداشت نہیں ہوتی۔ تقریر کے بعد صاحب موصوف نے

حفظ اطفال کے متعلق متعدد مفید چارٹس (مرتبات) دکھائے جن میں پیدائش سے لے کر نشو ونمو اور بڑھنے تک کے جملہ منازل دکھلائے گئے تھے۔

ازاں بعد مسٹر چندر راؤ اکر بی اے نے امتحان مڈل کے اضافی مضامین کے معیار کو بلند کرنے کے متعلق تحریک پیش کی جس کی تائید مولوی محمد سلطان صاحب نے فرمائی تجویز مذکور قدرے رد و قدح کے بعد باتفاق آرا پاس ہوئی۔

اس کے بعد مولوی احمد حسین خاں صاحب نے تفریحات تعلیمی (اکول اکر ٹن) پر ایک پر مغز تقریر پڑھی جس میں نہایت وسعت کے ساتھ اس قسم کے تفریحات کے عملی پروگرام کو بیان فرمایا جس کے بعد مولوی آغا محمد احسن صاحب نے اساتذہ اور والدین کے مابین تعلقات پر ایک قابلانہ خطبہ پڑھا آپ نے فرمایا کہ بچوں کی ترقی وتنزل ہی پر پوری قوم کی ترقی وتنزل کا انحصار ہے۔ مگر افسوس ہے کہ والدین ان جواہرات کو ضایع کر دیتے ہیں جن کی صورتیں یہ ہوتی ہیں کہ لڑکے کو غیر رجحانی یا موروثی پیشہ کی تعلیم دلائی جاتی ہے آپ نے فرمایا کہ شرعاً عقلاً قانوناً عرفاً والدین ہی بچہ کی تعلیم وتربیت کے بہت بڑے ذمہ دار ہیں جو اسوقت تک پوری نہیں ہو سکتی۔ جب تک اساتذہ کے ساتھ حقیقی اتحاد عمل نہ کیا جائے تربیت کے متعلق آپ نے فرمایا کہ مکان سے بہتر نہ کوئی مدرسہ ہے اور نہ ماں سے بہتر کوئی استاد اس اعتبار سے جب تک مکان اور مدرسہ میں تعاون نہ ہو اس وقت تک تعلیم اپنے حقیقی معنی میں ناممکن ہے اس تعاون کے لئے آپ نے چار تدابیر نہایت مفید وقیمتی بیان فرمائی ہیں مثلاً والدین کو مدرسہ میں

مختلف تقریبات کے ضمن میں مدعو کرنا یا والدین کے مکانات پر جا کر ملنا نیز بچہ کی تعلیمی حالت سے والدین کو وقتاً فوقتاً مطلع کرتے رہنا۔

اس لکچر کے بعد مولوی محمد حسام الدین صاحب کی تقریر تلقین اخلاق پر ہوئی جو نہایت دلچسپ اور پراز معلومات تھی آپ نے شرح وبسط کے ساتھ موجودہ تعلیم وتعلم اور طلبار کی اخلاقی حالت کا خاکہ کھینچتے ہوئے فرمایا کہ موجودہ تعلیم میں طلبا کی اخلاقی آرائش وزیبائش کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا ہے یا یہ کہ جو بھی اہتمام کیا جاتا ہے وہ ناقص ثابت ہوتا ہے۔ اس کے بعد آپنے نہایت پُر لطف اور ناقدانہ انداز میں موجودہ طرز تدریس اور مفہوم معلمی پر روشنی ڈالی اور فرمایا کہ مدرس کو کبھی یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ مدرسہ کے بعد اس کا فرض ختم ہوگیا بلکہ جہاں کہیں بھی اس کا متعلم ملے یہی سمجھ لے کہ گویا مدرسہ ہی میں ہے نیز یہ کہ مدرسی کو ملحاظ ملازمت نہیں بلکہ قومی خدمت سمجھکر بجالانا چاہیئے اور یہ کہ جو تعلیم اخلاق کی ہم اپنے طلبہ کو دینا چاہتے ہیں وہ نمونتاً اول اپنے میں پیدا کریں۔ آپ کا لکچر مختلف قصص حکایات کی وجہ سے مفید ہونے کے ساتھ دلچسپ بھی تھا اور اس کا اندازہ تقریر کو دیکھنے اور سننے ہی سے ہو سکتا ہے۔

اس کے بعد چونکہ مولوی حسام الدین صاحب سابق میں تقریر فرما چکے تھے اور صاحب موصوف کا وقت بچ گیا تھا اس لئے باجازت صدر نشین صاحب جناب سید محمد مہدی صاحب مددگار ناظم انجمن ہائے اتحادی نے تحریک امداد باہمی اور تعلیمی تحریکات سے اس کے تعلق پر ایک پُر مغز تقریر فرمائی

ہوئے فرمایا کہ مہذب ممالک میں ان دونوں کا تعلق نہایت گہرا ہوتا ہے نیز یہ کہ انجمن ہائے امداد باہمی ملک کے ارتقائی مدارج کے حاصل کرنے کی شاہراہ میں چھوٹی چھوٹی منازل ہیں۔ اس ضمن میں آپ نے متعدد تجاویز بیان فرمائے جو ہر حیثیت سے عملاً نہایت قیمتی اور مفید ہیں۔ بعد ازاں مولوی ولی الدین صاحب کا لکچر ہوا جس میں آپ نے صدر مدرسین مدارس تحتانیہ کو تعلیم و تعلم کے نفسیاتی پہلو پر توجہ دلانے کے بعد فرمایا کہ ہر انسان موجودہ حالت میں خلاصۂ نسل ہوتا ہے۔

اس کے بعد مسٹر پرکاش راؤ نے یہ تحریک پیش کی کہ عثمانیہ میٹرک کا کورس بجائے دو سال کے تین سال کا کر دیا جائے۔ جس کی تائید مسٹر پٹواری نے فرمائی۔ اس تحریک پر موافق و مخالف متعدد تقریریں ہوئیں جن میں مخالف کا حصّہ زیادہ تھا۔ بالآخر رائے لئے جانے پر یہ تحریک ۱۸ دوٹوں کی زیادتی سے مسترد ہوگئی۔ اس کے بعد سید محمد ہادی صاحب بی۔ اے (کنٹب) ناظم تعلیم جسمانی نے تعلیم جسمانی پر اپنا لکچر پڑھا جو اپنی طرز میں بالکل نئی چیز تھا۔ اور جس میں تاریخی اور مقامی حیثیتوں سے تعلیم جسمانی کے مدارج، قواعد اور امکانات پر روشنی ڈالی گئی تھی اور اس میں جو نقائص و کوتاہیاں رہ گئی ہیں ان کو مشرح طور پر بیان فرمایا گیا تھا۔

اس کے بعد مولوی عبد السلام صاحب ناظر گلبرگہ کی تقریر دلچسپ دیسی کھیلوں پر ہوئی جس سے حاضرین نہایت محظوظ ہوئے۔

اس کے بعد نمائش کے انعامات منجانب صدر محترم عطا و تقسیم ہوئے۔

بعد ازاں جناب صدر محترم اختتامی تقریر کے لئے استادہ ہوئے اور ایک بلیغ اور جامع خطبہ دیا جو کانفرنس کی تمام کارروائیوں پر ایک خاص تبصرہ کی صورت رکھتا تھا۔

آپ نے فرمایا کہ مجھے ہر قسم کی تعلیمی تحریکوں سے دلچسپی اور ہمدردی ہے اور مجھے یقین ہے کہ میری یہ ہمدردی، ہر چند کہ متعدد مشکلات پیدا ہوں، ہمیشہ قایم رہیگی اس لئے کہ یہ خالص علمی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے بعد جناب معظم نے تجاویز کانفرنس پر تبصرہ فرماتے ہوئے فرمایا کہ صحت طلبہ کے لئے مدارس کی عمارتیں خاص طور پر صحت بخش ہونا چاہئیں۔ مگر مصارف کا سوال غور طلب ہے، امتحانات کے بارے میں فرمایا کہ اس خصوص میں حکومت کی امداد ضروری ہے، آپ نے فرمایا کہ جس وقت ہم عثمانیہ میٹرک کا نصاب ابتدائی مرتب کر رہے تھے اس وقت یہ بحث چھڑی تھی کہ آیا نصاب کی مدت دس سال رکھی جائے یا بارہ سال۔ اس وقت اکثریت اسی فیصلہ کی جانب تھی کہ معمولی اور رائج مدت مقررہ سے ایک سال کم مدت رکھی جائے۔ میٹرک کی مدت تین سال اس صورت میں مناسب ہوگی جبکہ معیار کو بلند کر دیا جائے ورنہ مدت کا سوال کسی نہ کسی شکل میں برابر پیدا ہوتا رہیگا، اور مدارس کی نظیر اس موقع پر ذرا دشواری ہی سے صادق آسکتی ہے کیونکہ روز بروز اس یونیورسٹی کا اسٹینڈرڈ بھی پست ہوتا چلا جائیگا۔ چنانچہ آثار یہی کہہ رہے ہیں

اور کالج کی تعلیم کی جو کہئے تو میں عرض کرونگا کہ طلبا نے کالج کو چاہیئے کہ اپنی تمام تر توجہ بجائے انگریزی ادب پر مبذول کرنے کے خود جدید انگریزی زبان کی تحصیل میں صرف کریں۔

بعد ازاں آپ نے علم جغرافیہ کے متعلق اظہار خیالات کرتے ہوئے فرمایا کہ روز بروز جغرافیہ کی اہمیت بڑھتی جاتی ہے چنانچہ انڈین سول سروس امتحان کے نصاب میں بھی اسکو بطور ایک مستقل مضمون کے جگہ دی گئی ہے۔

زاں بعد آپ نے مولوی حسام الدین صاحب اور مولوی سید محمد ہادی صاحب نیز دیگر مقررین کی تقاریر کے متعلق اظہار تحسین و آفریں فرماتے ہوئے انجمن اساتذہ کے قیام کو حیدرآباد کی تعلیمی تحریکوں کے لئے بہت کچھ حوصلہ افزا فرمایا۔ اور ایک پر مغز نظم کے ساتھ اپنی تقریر کو ختم کیا۔

بعد ازاں مولوی سید علی اکبر صاحب بی۔اے (کنٹب) صدر مہتمم تعلیمات بلدہ نے اپنی تقریر میں جناب محترم کا خاص شکریہ ادا کرتے ہوئے فرمایا کہ جناب صدر نے باوجود اپنی گوناگوں مصروفیتوں اور انہماک کے اجلاس انجمن کی صدارت کو قبول فرمایا جو انجمن ہذا کے لئے خاص طور پر باعث فخر و امتیاز ہے۔ زاں بعد آپ نے مولوی محمد اعظم صاحب پرنسپل سٹی انٹرمیڈیٹ کالج کی دلچسپی کا جو صاحب موصوف نے انعقاد انجمن میں لی شکریہ ادا کرکے مکرر حاضرین کی تشریف آوری پر اظہار تشکر فرما کر اپنی اختتامی تقریر کو ختم فرمایا۔

زاں بعد دعا پڑھی گئی اور جناب صدر کے حکم سے اجلاس کانفرنس کا اختتام عمل میں آیا۔

انجمن اساتذہ کے زیر سرپرستی جناب ڈاکٹر لطیف سعید صاحب کا لکچر

"صحت مدارس و امداد اولیں"

پر

بحسن و خوبی ۵ تھڈسٹ بوائز اسکول کے اسمبلی ہال میں زیر صدارت جناب مولوی سید علی اکبر صاحب بی۔ اے (کنیٹب) صدر مہتمم تعلیمات بلدہ غرہ مہر ۳۵ ف کو شام کے چار بجے ہوا۔ انجمن کے اراکین نیز دیگر حضرات بہ تعداد کثیر ڈاکٹر صاحب موصوف کی تقریر کو سننے کے لئے جمع ہوئے تھے اور پورا لکچر نہایت مفید تھا جو بغرض افادہ ناظرین درج ذیل ہے۔

ڈاکٹر صاحب موصوف نے تقریر کا آغاز کرتے ہوئے تمہیداً فرمایا کہ حیدرآباد میں بکثرت انجمنیں آئے دن قائم اور فنا ہوتی رہتی ہیں از انجملہ انجمن طبیہ (مڈیکل اسوسی ایشن) بھی ہے جو حالت نزع میں دم توڑ رہی ہے۔ بر ایں ہمہ میں امید کرتا ہوں کہ انجمن اساتذہ انشاء اللہ ضرور اپنے مد نظر مقاصد کو حاصل کر کے رہیگی!

اس کے بعد چونکہ وقت کم تھا اور مضمون کی وسعت بہت بڑی تفصیل کی طالب تھی اس لئے معزز مقرر نے صرف مبحث کے اہم نقاط کو واضح فرمانے پر اکتفا کی۔ چنانچہ آپ نے انسانی نشو و نما اور ارتقا کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ عصر موجودہ میں انسانی ترقی انتہائے عروج پر پہنچ گئی ہے۔ حتیٰ کہ انفرادی احتیاط و حفاظت اور ترقی کا خیال کرتے کرتے اب ہر امر میں اجتماعی مفاد کا

خیال پیش پیش ہے اور یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ ہماری ترقی دوسروں کی ترقی سے وابستہ ہے اس کے بعد آپ نے جسم انسانی کی نازک و پیچیدہ ترکیب کے ضمن میں فرمایا کہ خفیف سی غفلت یا کاہلی بھی نظام جسمانی کو درہم برہم کر سکتی ہے چنانچہ صحت نام ہی اس کا ہے کہ جسم انسانی فطری تقاضوں کے مطابق کام کرے اور مطلق کوئی بے اعتدالی پیدا نہ ہو۔ جو بیماریاں ہم میں پیدا ہوتی ہیں وہ ہمارے ہی انفرادی و اجتماعی نقائص کا نتیجہ ہوتی ہیں، آپ نے فرمایا کہ مغربی ممالک نے فن "توریث" میں ملکہ حاصل کر کے ملیریا، طاعون، چیچک، پیچش، اور تپ محرقہ وغیرہ امراض کا بالکل استیصال کر دیا ہے حالانکہ یہ بیماریاں اب تک ایشیا کے ممالک میں پھیلی ہوئی ہیں۔

بیماریوں کے اسباب کی تفصیل میں آپ نے فرمایا کہ بیماریاں اول تو خرابیٔ خون سے پیدا ہوتی ہیں مثلاً طاعون، ملیریا، چیچک وغیرہ۔ دوسرے ان جراثیم کی پیدا کردہ ہوتی ہیں جو حلق یا ہوا کی گذرگاہوں یا شُش میں پیدا ہو جاتے ہیں مثلاً نمونیا، انفلوئنزا وغیرہ۔ تیسرے کثیف پانی دودھ یا دیگر متاثر غذاؤں کے استعمال سے پیدا ہوتی ہیں مثلاً ہیضہ یا تپ محرقہ وغیرہ چوتھے جلدی بیماریاں۔ پانچویں چند ایسی بیماریاں جو اعضائے انسانی کی بد استعمالی سے پیدا ہوتی ہیں۔

بعد ازاں مقرر موصوف نے طلبہ کو مذکورہ بیماریوں سے محفوظ رکھنے کے ضمن میں فرمایا کہ اول تو خود طلبہ کو قدرے حفظان صحت کے اصول سے واقف ہونا چاہیئے۔ دوسرے یہ کہ افسران مدارس کو بھی عمارت مدرسہ میں

ہوا، روشنی، کشادگی، اور بازیگاہوں کا پورا پورا خیال رکھنا چاہیئے ۔

آپ نے فرمایا کہ طلبہ کو حسب ذیل امور پر عمل کرنا چاہیئے :۔

اول یہ کہ پوشاک صاف ستھری ہو۔ اور روزانہ غسل کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ سبک لباس پہنیں۔ تیسرے یہ کہ مقام سکونت میں ہوا اور روشنی کے آمد و شد کے راستے برابر کھلے رہیں۔ چوتھے یہ کہ بوقت مطالعہ میز پر جھک نہ جائیں بلکہ سیدھے بیٹھے رہیں۔ پانچویں یہ کہ ردی کاغذات یا کوڑا کرکٹ چند مخصوص ظروف میں جو اسی غرض کے لئے رکھے گئے ہوں ڈالتے جائیں۔ چھٹے یہ کہ اگر بوقت مطالعہ آنکھ یا سر میں درد محسوس ہو تو کسی ماہر چشم ڈاکٹر کے پاس رجوع ہوں۔ ساتویں یہ کہ روزانہ کوئی نہ کوئی ورزش ضرور کریں۔

اس کے ساتھ ہی صاحب موصوف نے وہ امور بھی بیان فرمائے جن سے طلبہ کو پرہیز واجب ہے۔ پہلے یہ کہ غیر ضروری اور فضول یا چست و تنگ پوشاک نہ پہنیں۔ دوسرے یہ کہ تھوکنے کی عادت ترک کردیں۔ تیسرے یہ کہ کسی کے منہ پر کھانسیں کھنکاریں نہیں۔ چوتھے یہ کہ کثیف یا آلودہ پانی نہ استعمال کریں اور بازاری شربتوں اور مٹھائیوں سے پرہیز کریں پانچویں یہ کہ حالت بیماری میں مدرسہ نہ جائیں۔ چھٹے یہ کہ تکان کے عالم میں ورزش یا گیم وغیرہ سے پرہیز کریں۔ ساتویں یہ کہ معمولی زخم کا بھی خاص توجہ سے فوری اندمال کریں۔

بعد ازاں مقرر صاحب نے امداد اولین (فرسٹ ایڈ) کے متعلق کہا کہ زخم آنا۔ غش آنا۔ دورہ ہونا۔ کچل جانا۔ جل جانا۔ نیش زدنی یا گزندگی۔ نیز

مختلف بیماریوں کے ناگہانی حملے وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جن کے لئے فرسٹ ایڈ کی ضرورت پڑتی ہے اور مجھے امید ہے کہ طلبہ کو اس ضروری امر کی طرف بالضرور متوجہ کیا جائیگا۔

آخر میں معزز مقرر صاحب نے فرمایا کہ تعلیم کے تین مقاصد ہوتے ہیں :-

اول یہ کہ صحیح اور غلط میں امتیاز کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ راست کو دروغ سے متمائز کیا جائے۔ تیسرے یہ کہ حسن کو پسند کیا جائے اور قبح سے نفرت کیجائے۔ اب وقت آگیا ہے کہ صحت کی پوری نگہداشت کرکے بیماری کو جڑ سے اکھاڑ دیا جائے۔

آپ کے بعد جناب مولوی سید علی اکبر صاحب صدر جلسہ نے ڈاکٹر صاحب موصوف کا شکریہ ادا کرنے کے بعد فرمایا کہ محکمہ تعلیمات کو عمدہ اور موزوں بازیگاہوں اور مدارس کے لئے اچھے قطعات زمین نہیں دستیاب ہوتے۔ آپنے فرمایا کہ حفظان صحت مدارس تحتانیہ کے نصاب میں داخل ہے۔ اور اگرچہ ابھی اس مضمون کے ماہر پڑھانے والے نہیں ملتے تاہم چونکہ اب اس طرف مدارس تعلیم المعلمین میں خاص توجہ کیجارہی ہے اس لئے امید ہے کہ عنقریب یہ دقت رفع ہوجائیگی۔

جناب صدر نے فرمایا کہ طلبہ میں پاکیزگی اور صفائی کی عادت پیدا کرنا بھی بہت ضروری ہے۔ بحالت موجودہ مدارس میں عموماً اس کا بہت کم خیال رکھا جاتا ہے۔

طلبہ کی کامیابی

(از خامہ مولوی محمد حسام الدین صاحب فاضل ادیب و مولوی فاضل)

(ہم نہایت مسرت سے مولوی صاحب موصوف کا مضمون شایع کرتے ہیں، ہرچند کہ عنوان سے خیال ہو سکتا ہے کہ مضمون طلبہ سے متعلق اور طبقۂ متعلمین سے مخصوص ہوگا مگر اسمیں ایک بہت بڑا نکتہ بلیغ یہ پنہاں ہے کہ متعلم کی ہر حرکت والدین اور معلم کی سیرت کا پرتو اور "تابع محل" ہوا کرتی ہے پس اس کلیہ کے مدنظر کہ معلم کی غایت زندگی ہی یہ ہے کہ متعلم کی زندگی کو مکمل و مرتب کردے نہایت ضروری ہے کہ مضمون ہذا کو ہم معلمانہ نقطۂ نظر سے دیکھیں اسلئے کہ اسمیں ایثار و خود فنائی کے وہی خط و خال نمایاں ہیں جو مولوی صاحب موصوف کی قابل تقلید عملی زندگی کا اہم عنصر رہے ہیں)

تعلیمی سال کا آغاز ہے، امتحانات کے نتایج شایع ہو رہے ہیں، ہر مدرسے میں اس وقت عجیب کیفیت ہے، طلبہ کی چہل پہل، جدید و قدیم طلبہ کا اژدہام عجب سماں پیدا کر رہا ہے، شریک امتحان طلبہ کی حالت خاص کر قابل دید ہے، ان میں دو گروہ ہیں (۱) کامیاب (۲) ناکام، کامیاب طلبہ کا یہ حال ہے کہ خوشی سے پھولے نہیں سماتے۔ جس طرف جاتے ہیں شاد شاد نظر آتے ہیں۔ کبھی ہم جماعت کامیاب طلبہ سے مسرت آمیز گفتگو میں مشغول ہیں کبھی اپنے اساتذہ سے اظہار عقیدت کرنے میں مصروف، مڈل کامیاب طلبہ مدرسہ فوقانیہ کے تصور سے بے حد شاداں و فرحاں ہیں، فوقانیہ کے بامراد طالب علم کالج کی شرکت کے خیال سے دل ہی دل میں بے انتہا مسرور اور اپنی قسمت پر نازاں، اسی زمرہ میں ایک پراگندہ دل کثیر جماعت کے افراد یعنے ناکام طلبہ بھی نظر آتے ہیں جو سراسیمہ وحیران پھر رہے ہیں، ان کے دل پژمردہ ہیں، ان کے چہرے افسردہ

ان کی صورت تصویر غم بنی ہوئی ہے، ان کی گفتار سراپا درد و الم معلوم ہوتی ہے،
اپنے ہم جماعت و ہم خیال کامیاب طلبہ سے میل جول کرتے ہوئے یہ شرمائے
جاتے ہیں، اپنے شفیق اساتذہ سے چار آنکھ ہوتے ہی پسینہ پسینہ ہوئے
جارہے ہیں، غرض کامیاب طلبہ ع لبوں پر مسرت تو رخ پر بہار، کے
مصداق بنے ہوئے ہیں اور ناکام زبان حال سے گویا ہیں ع درد مندیم
خبر ہید ہد از سوز دروں۔ اگرچہ ان کی سرگردانی و پریشانی قابل رحم ہے،
درحقیقت ان کی پریشانی کا الزام انہیں کے سر ہے۔ شیخ سعدی علیہ الرحمہ
دنیا کی زندگی میں نیک عمل نہ کرکے آخرت میں بروز قیامت سرگرداں
و پریشان بدکاروں کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں ؎

بہل تا بدنداں گزد پشت دست   تنور ے چنیں گرم نانے نہ بست

یہی حال سوائے بعض ناکام طلبہ کے جو باوجود محنت، سوء اتفاق سے کامیاب
نہ ہوسکے عام ناکام طلبہ ہے کہ انہوں نے وقت کی قدر نہ کی، تعلیم سے
دلچسپی نہ لی، اساتذہ کی محنت و قابلیت سے فائدہ نہ اٹھایا، والدین پر
اخراجات کا بار ڈالا، اور باوجود علم کی دولت نہایت ارزاں ہونے کے کچھ
نہ کمایا، الحاصل ان کی پریشانی توجہ کے قابل نہیں کہ ع خود کردہ را علاجے نیست،
یہ سب کچھ صحیح لیکن آخر ہیں تو یہ طالب علم، اور نوعمر یا نوجوان طالب علم، ابھی
وہ دور اندیشی و عزیز اوقات کی قدر دانی ان میں کہاں، زمانہ کے نشیب
و فراز کی انہیں کیا خبر، ناکام نہ ہونے تک ناکامی کی دلخراش مصیبت سے
انہیں کیا آشنائی، نامرادی کی جانکاہ تکلیف سے انہیں کیا روشناسی، پس

ضرور ہوا کہ اسباب کامیابی پر چند ناچیز خیالات قلمبند کئے جائیں اور عزیز طلبہ کو چند مفید مشورے دئے جائیں۔ کامیابی کے لئے حسب ذیل امور ضروری ہیں:-

(۱) نیک نیتی (۲) مطالعہ (۳) پابندی اوقات (۴) انہماک (۵) طلب صادق (۶) حفاظت وقت (۷) حفاظت صحت (۸) دور اندیشی (۹) عمل صحیح (۱۰) اطاعت و احترام والدین و اساتذہ (۱۱) درستی اخلاق و عادات (۱۲) ہمدردی ملک و قوم۔

نیک نیتی ہر کام کا بہترین نتیجہ اسی صورت میں نکل سکتا ہے کہ کام کرنے والے کی نیت بخیر ہو۔ خاص کر علم و فضل جیسی لازوال نعمت سے وہی لوگ بہرہ ور ہو سکتے ہیں جن کی نیتیں اچھی اور جن کے مقاصد نہایت بلند ہوں۔ اگر اس پر کافی غور و تدبیر سے کام لیا جائے کہ کثیر التعداد طلبہ کے امتحانات میں ناکام ہونے کے کیا اسباب ہیں تو ایک بڑا سبب یہ بھی معلوم ہوگا کہ طلبہ میں نیک نیتی تقریباً مفقود ہے علم کی غرض و غایت عام طور پر بہت ہی ادنیٰ چیز یعنے ذاتی منفعت اور حصول دولت قرار دی گئی ہے تحصیل علم سے عام طلبہ کو قومی ترقی، ملکی منفعت، مذہبی خدمات، ہمدردی، تہذیب نفس، ایثار و قربانی، حق و باطل کی تمیز، بہت کم مقصود ہے حالانکہ علم و کمال کے حقیقی اغراض یہی امور ہیں ورنہ ذاتی اور شخصی منفعتیں بغیر علم کے بھی کسی نہ کسی طرح ہمدست ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ جانور بھی اپنے اغراض کی تکمیل خاطر خواہ کر لیا کرتے ہیں۔ اگلے زمانہ کے تقریباً تمام علماء کے پیش نظر علم کے ذریعہ صرف مال و دولت کا کمانا یا اپنے آپ ہی کو فائدہ پہنچا لینا ہرگز مقصود نہیں رہا ہے؛ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اہل علم دولت حاصل ہی نہ کریں یا اپنی

ذات کو کچھ فائدہ ہی نہ پہنچائیں۔ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا کہ ع قدر مرد بہ علم است و قدر علم بہ مال؟ مقصد یہ ہے کہ تحصیل علم سے طلبہ کے مطمح نظر متذکرہ اوصاف حمیدہ رہیں اور یہ کہ علم و کمال کو صرف علم و کمال کی حیثیت سے حاصل کریں اور مال و منال ضمناً مقصود ہوں، مال و دولت بری چیز نہیں مگر اپنی عزیز زندگی کو صرف مال و دولت ہی کے لئے وقف کر دینا نہایت معیوب ہے، اور علم جیسی نفیس چیز کو حصول دولت ہی کے لئے حاصل کرنیکی تجویز سخت جہالت، پہلے زمانہ کے علمار کرام کے حالات تفصیل سے دیکھ ڈالئے تو ایک عالم بھی شاید ایسا نہ ملیگا جس نے علم صرف اس لئے سیکھا ہو کہ اس کو اپنی معاش کا ذریعہ بنائے یا اپنے علم و کمال کے وسیلہ سے بڑا مالدار بن جائے آپ کو اُن علماء میں جن پر علم و فضل کو ناز ہے ایسی سیکڑوں ہستیاں ملینگی جنہوں نے باوجود کمال علم و فضل کے معمولی سے معمولی پیشے اختیار کئے اور نہایت قناعت گزینی سے اپنی مبارک زندگی گزار دی مگر اپنے فضل و کمال سے زمانہ کو زندہ کر دیا بلکہ بجائے اس کے کہ علم کو دولت یا ملازمت کے لئے حاصل کریں یا فارغ التحصیل ہونے کے بعد ملازمت کے لئے سرگرداں رہیں، اعلیٰ عہدوں کے قبول کرنے پر وہ مقدس لوگ مجبور کئے جاتے تھے۔ بعض تو مخلوق خدا کی نفع رسانی کے خیال سے خواہ مخواہ منظور کر لیتے تھے بعض ایسے بھی بلند خیال ہوتے تھے کہ عہدے نہ قبول کرنے سے سزائے قید پاتے چنانچہ امام اعظم حضرت ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے لئے خلیفۂ منصور نے قضاء کا عہدۂ جلیلہ تجویز کیا۔ امام صاحب نے انکار کر دیا، منصور نے قسم کھا کر کہا کہ میں تم کو قاضی مقرر کرونگا۔ امام صاحب نے بھی قسم کھائی کہ

میں اس عہدے کو ہرگز قبول نہیں کرونگا۔ خلیفہ نے ان کو قید خانہ بھیجدیا اور حالت محبوسی ہی میں اس ایک عالم کے امام نے وفات پائی" امیر سلیمان ابن علیؓ نے مقام اہواز سے ایک قاصد، امام ادب خلیل نصیری کے پاس بھیجا اور ان کو امیرزادہ کی تعلیم کے لئے طلب کیا۔ ایلچی کی خبر پاکر وہ ادیب بے مثل باہر آیا۔ سوکھی روٹی کا ایک ٹکڑا ہاتھ میں تھا، وہ ٹکڑا قاصد کو دیا اور کہا کہ لو میرے پاس تو یہی حاضر ہے" اور جب تک کہ یہ موجود ہے خلیل کو سلیمان کی پروا نہیں!! ابو غالب لغوی نے جب اپنی کتاب فن لغت میں تصنیف کی تو امیر مجاہد نے ایک ہزار اشرفیاں ان کے پاس بھیجیں اور یہ فرمائش کی کہ کتاب مذکور کے دیباچہ میں یہ الفاظ درج کردیں کہ اس کتاب کو ابو غالب نے امیر مجاہد کے لئے تصنیف کیا ہے' ابو غالب نے عطیۂ شاہی کو واپس کردیا اور کہلا بھیجا کہ اگر ساری دنیا بھی مجھکو دی جاتے تو بھی میں یہ جھوٹ بولنا روا نہ سمجھونگا کہ میں نے یہ کتاب خاصکر امیر کے واسطے تالیف نہیں کی ہے بلکہ عام نفع کے خیال سے لکھی ہے! عثمان غنیؒ ابن مسلم محدث انصاری کو ایک دفعہ دس ہزار اشرفیاں اس غرض سے دی گئیں کہ فلاں شخص کی نسبت وہ قاضی کی عدالت میں جرح و تعدیل نہ کریں مگر انہوں نے فرمایا کہ میں کسی کے حق کو باطل نہیں کرسکتا اور یہ کہکر اشرفیاں واپس کردیں۔

پہلے کے اہل علم کا یہ حال تھا، اب کے طلبہ کی یہ کیفیت ہے کہ ابتدا ہی سے اپنے ذہن میں ناقص تخیلات جمائے ہوئے رہتے ہیں میں نے بارہا متعدد طلبہ سے سوال کیا ہے کہ تعلیم کس لئے پارہے ہو؟ اس کے جوابات

جو مختلف عمر و لیاقت کے طلبار نے دئے ملاحظہ ہوں:۔ منصف و تعلقدار ہونے انجنیر و ڈاکٹر بننے، وکالت یا کوئی نہ کوئی ملازمت اختیار کرنے، یہ جوابات کسیقدر درست ہو سکتے، اگر یہیں تک ہوتے کیونکہ اس میں ایک پہلو عدل و انصاف کی عمدہ صفت سے متصف ہونے اور قومی خدمات بجا لانے کا موجود تھا مگر طلبہ کے دل و دماغ میں ان عہدوں اور ان خدمات سے یہ غرض بھی نہیں کیونکہ جب ان سے پوچھا گیا کہ منصف یا وکیل بننا تمہیں کیوں مقصود ہے تو جواب ملا مال و دولت کمانے کے لئے، کہا گیا کہ دولت کی کیوں ضرورت ہے تو کہا ناز و نعمت میں بسر کرنے کے واسطے! پس سب کا خلاصہ یہ ہوا کہ علم صرف اس لئے سیکھا جا رہا ہے کہ مال و دولت افراط سے کمائیں۔ کھائیں۔ پئیں عیش و عشرت میں بسر کریں، بعض طلبار نے تو سوال کے ساتھ ہی صاف صاف کہدیا کہ تعلیم سے ہمیں صرف دولت کمانا اور پیٹ پالنا مقصود ہے؛ الغرض چونکہ طلبہ کی نیتیں خیر پر مبنی نہیں ہیں۔ اس لئے علم کی حقیقی روشنی سے یہ بہت کم منور ہوتے ہیں اور باوجود محنت بھی بسا اوقات علم و کمال بدرجہ اتم یہ حاصل نہیں کر سکتے، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک ایک امتحان کی کامیابی کے لئے کئی کئی سال ضایع جاتے ہیں اور اگر بعض طلبہ کامیاب بھی ہو جاتے ہیں تو ذہنی اور علمی ترقی سے کافی طور پر دوسروں کو فائدہ نہیں پہنچا سکتے، بلکہ ایسی نظیریں بھی موجود ہیں کہ کامیابی کے ساتھ ساتھ انہوں نے پڑھا پڑھایا ہوا بھی بھلا دیا، خوش قسمتی سے کہیں کے مدرس ہو گئے تو صرف اپنے مفوضہ مضامین حاضر فی الذہن رکھے باقی کا خدا حافظ چنانچہ بعض فارغ التحصیل اشخاص سے کسی عبارت کا

مطلب پوچھا جاتا ہے تو جواب ملتا ہے کہ اب علمی شغلہ باقی نہ رہا برسوں ہوئے کہ مطالعہ چھوٹ گیا ہے الحاصل اگر علم کو علم وفضل کی حیثیت سے سیکھا جاتا تو اس جوہر بے بہا کی بیحد حفاظت کی جاتی اور برسوں میں کمائی ہوئی لاثانی دولت کو اس طرح بے پروائی سے برباد نہ کیا جاتا' چونکہ علم کو ایک معمولی چیز کے حصول کا ذریعہ سمجھکر حاصل کیا گیا تھا اس لئے اصل مقصود پر دسترس ہوتے ہی علم اور علم کے اعلیٰ مقاصد سے قطع تعلق کر لیا گیا ع وائے نادانی ما حیف بہ دانائی ما۔ میرے عزیز طالب علمو! شفیق دوستو! انما الاعمال بالنیات کے با عظمت زرین فعل کو نہ بھولو اور جو کچھ سیکھو اور جو علم حاصل کرو نیت بالخیر رکھو اگر نیت اچھی رکھوگے تو اپنے علم وہنر سے دینی و دنیاوی بہبودیاں حاصل کرسکوگے اور دارین میں کامیاب رہوگے۔

مطالعہ مدرسہ آنے سے پہلے اپنے آئندہ اسباق کا مطالعہ ضرور کر لینا چاہیئے عام اس سے کہ مضمون ہماری سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ ہمارے سامنے ایک اجنبی شخص آتا ہے اور ایک وہ بھی جس کو ہمنے پہلے کبھی دیکھا ہے ظاہر ہے کہ اجنبی کے بہ نسبت اس شخص کو بہت جلد پہچان لینگے اور اب جتنے معلومات جسقدر وقت میں اسکے متعلق ہمیں حاصل ہونگے پہلے شخص کے متعلق ہمیں حاصل نہیں ہوسکتے اسلئے کہ ابھی تو اسے پہچاننا باقی ہے یہی حال مطالعہ کئے ہوئے اور نہ کئے ہوئے ہمارے اسباق کا ہے۔ مطالعہ کے باعث گویا اس سبق سے ایک حد تک آشنائی ہو چکی اب جب استاد صاحب پڑھائینگے تو اسکی باریکیاں بہت جلد سمجھ میں آجائینگی بغیر مطالعہ جو سبق لیا جائیگا پہلے اسکی نوعیت ذہن نشین کرنی پڑیگی اسکے بعد اسکی لطافتوں کیطرف ذہن متوجہ ہوسکیگا۔

اکثر طلبہ نے مطالعہ کو بالکل غیر ضروری خیال کر لیا ہے چنانچہ آئندہ اسباق کا مطالعہ تو در کنار
نئی درسی کتاب کے اوراق جو قلم تراش سے علٰحدہ کئے جانے کے قابل ہیں طلبہ کو اتنی بھی
فرصت نہیں ہوتی کہ کتاب خریدتے ہی انہیں ایک دوسرے سے وقت واحد میں قطع
کر رکھیں کہ پڑھائی کے وقت جب ورق الٹانے پڑیں تو قلمتراش کی محتاجی نہ ہو
یا بے احتیاطی سے چاک کرنے میں کتاب ناقص نہ ہونے پائے۔ اکثر دیکھا جاتا ہے کہ
استاد صاحب انہیں درس دینے میں مشغول ہیں اور یہ ایک صفحہ سے دوسرے صفحہ تک پہنچنے
کے لئے اوراق چاک کرنے میں مصروف۔ غور فرمائیے کہ جب کتاب سے ورق ہی
اب تک نہ الٹے گئے تھے تو مطالعہ کیا خاک ہوا ہوگا۔ اگر ہر سبق کو کم از کم ایک بار سرسری
اور دوسری مرتبہ گہری نظر سے دیکھ لیا جائے اور مشکل الفاظ کے معانی حتی القدور لغات سے
حل کر لئے جائیں نیز مضامین متعلقہ پر پہلے پہل غور کر لیا جائے تو ہر سبق بہت اچھی طرح
سمجھ میں آجائیگا۔ پھر ایک دو بار اس کو پڑھ لینے سے کافی طور پر ذہن نشین ہو جائے گا،
لیاقت بڑھے گی، کامیابی یقیناً ہو کر رہیگی۔ اس وقت جو مطالعہ اور کتب بینی کی عادت
ڈالی جاتی ہے آئندہ چل کر بڑے کام آتی ہے، دل و دماغ مضامین آفرینی کے عادی
ہو جاتے ہیں، ذرا ذرا سی بات میں استادوں کی محتاجی نہیں رہتی، اگر مطالعہ سے
بے پروائی کا یہی حال رہا جو طالب علمی کے زمانہ میں ہے تو یاد رہے کہ معلومات
محدود رہینگے اور آئندہ زندگی میں جب کبھی کوئی کتاب ہاتھ میں آئیگی بہت ممکن
ہے کہ ہر ہر فقرے پر اسکے سمجھانیوالے کی ضرورت دامنگیر رہے۔ کیونکہ بچپن ہی سے دماغ
کاہل الوجود بنا رکھا ہے، اگر کسی بچہ کو ابتداء سے ایک ہی جگہ بیکار بٹھا رہنے دیں اور اسکی تمام
ضروریات اوروں کے ذریعہ پوری کرتے رہیں تو ظاہر ہے کہ یہ لڑکا بڑا ہوگا تو ہاتھ پاؤں کا

ناکارہ اور بالکل اپاہج رہیگا۔ پس جسطرح کسی لڑکے کے لئے کم عمری ہی سے محنتی بنانا اور اپنا کام آپ انجام دینے کی عادت ڈالنا مفید ہے اسی طرح دل و دماغ کو شروع ہی سے محنتی بنانا اور سوچنے سمجھنے کا مادہ ان میں پیدا کرنا نہایت کار آمد ہے تاکہ آئندہ اُن سے اعلی قابلیت کے کام لے سکیں اور بات بات میں دوسروں کے محتاج نہ رہیں کیونکہ

ع مزد آں گرفت جان برادر کہ کار کرد؎

پابندی اوقات جہاں کہیں انسان کے لئے سیکڑوں اچھے اخلاق و عادات کی ضرورت ہے وہیں پابندی اوقات کی عمدہ صفت کا اس میں پیدا ہونا نہایت ضروری ہے اوقات کی پابندی کے بغیر دنیا کا کوئی کام باحسن الوجوہ انجام نہیں پا سکتا' عالم کے تمام کاروبار قادر لایزال نے نہایت منضبط رکھے ہیں' آفتاب کا طلوع و غروب' چاند کا بڑھنا گھٹنا' رات اور دن کا ظاہر ہونا' بہار و خزاں کا وجود غرض کائنات کا ذرہ ذرہ پابندی اوقات کا نہایت دلدادہ ہے' اور اپنا اپنا مفوضہ کام وقت مقررہ پر پورے انہماک سے انجام دینے کا عادی' افسوس ہے اس اشرف المخلوقات کہلانے والے انسان پر کہ یہ اپنے وقت کا' اپنے وعدہ کا بہت کم پابند رہا کرتا ہے' اپنے بڑے بڑے عیوب اس کی نظر میں نہیں آتے' یہ کسی محرابی گھڑی کی آواز سنتا ہے کہ چار گھنٹے بجانے کے عوض اس نے بارہ بجا دئے' فوراً استعجاب سے سر اٹھا اٹھا کر اسے دیکھنے لگتا ہے کہ اپنے وقت اور اپنے وعدے (صحت اوقات) کی پابندی کیوں نہیں کرتی ہے'

مدرسہ طالب علموں کے لئے ہر قسم کی عمدہ تربیتوں کا کفیل ہے بشرطیکہ طلبہ اُس کے قوانین کی پابندی کریں خصوصاً پابندی اوقات پر طلبہ کو خاص طور پر متوجہ ہونا چاہیئے کہ اگر طالب علمی کے زمانے سے پابندی اوقات کی عادت ہوگی تو آئندہ بھی ہر کام وقت پر

ہوگا۔ طالب علم آگے چل کر خواہ کچھ ہی زندگی کیوں نہ اختیار کرے ہر صورت میں اُس کو اوقات کی پابندی کی سخت ضرورت ہے اور اس کے بغیر اس کا کوئی کام تکمیل نہیں پاسکتا پس جو طلبا اوقات مدرسہ کے پابند ہیں وقت پر حاضر ہوجایا کرتے ہیں گویا وہ اپنی آئندہ زندگی کے لئے بہترین سرمایہ جمع کر رہے ہیں اس کے علاوہ اگر اوقات کی پابندی نہ کیجائے تو تحصیل علم میں بڑی بڑی رکاوٹیں پیدا ہوجاتی ہیں۔ کاہلی۔ بے ادبی۔ بے پروائی۔ بدشوقی کا ثبوت عدم پابندی اوقات میں مضمر ہے۔ جو لڑکا دیر حاضری کا عادی ہے عنقریب غیر حاضر بھی ہونے لگیگا۔ غیر حاضر طالب علم امتحان میں کامیاب ہوجائے تو تعجب ہے۔ دیر حاضری سے قطع نظر اس کے کہ کتا بچہ حاضری میں غیر حاضری پڑیگی، استاد کی لعنت ملامت ہوگی، صدر مدرس صاحب سے سزا ملیگی، یہ کتنی بُری بات ہے کہ جو سبق استاد تمہارے حاضر ہونے تک پڑھا چکا ہے اس کی تلافی کس طرح ہوگی، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ پہلے مضمون سے بعد کا مضمون متعلق رہتا ہے : ایک دوسرے کے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتا۔ پس اس دیر کیوجہ سے بسا اوقات کامل سبق ادھورا رہجائیگا اور ممکن ہے کہ اس کے بعد کے بھی دو چار سبق اسی طرح ذہن نشین ہونے سے قاصر رہیں، جب عدم پابندی وقت کے باعث اسباق پر یہ اثر پڑیگا تو امتحان کی کامیابی خواب و خیال ہوجائیگی اس لیے ہونہار طلبہ کا فرض ہے کہ مستعدی کے ساتھ وقت کے پابند رہیں مدرسہ کے مقررہ اوقات کا اپنے ذہن میں ایک آدھ گھنٹہ قبل ہونا معین کرلیں اور اسی اعتبار سے اپنے گھر سے حاضر مدرسہ ہونے کے لئے نکل کھڑے ہوں۔ مثلاً مدرسہ کا وقت دس بجے سے ہو تو اپنے خیال میں حقیقی طور پر ساڑھے نو بجے قرار دے لو اور اسی معینہ وقت پر حاضر ہونیکی

سختی سے پابندی کرو تاکہ کم از کم مقررہ وقت پر پہنچ سکو اور دیر حاضر ہوکر استاد صاحب سے یہ کہنے کے بجائے کہ آج ضروری کام کیوجہ سے دیر ہوگئی، اس ضروری کام سے ہی ہاتھ اٹھاؤ۔ مثلاً یہ کہدو کہ مجھے وقت پر مدرسہ حاضر ہونا بہت ضروری ہے، وقت پر بلکہ وقت سے کچھ پہلے آؤگے تو راستہ چلنے کی تکان اترنے تک اطمیناں سے بیٹھ سکوگے آرام ملیگا۔ پھر جب سبق شروع ہوگا تو اول سے آخر تک توجہ کے ساتھ سُن اور سمجھ سکوگے، مضامین اچھی طرح یاد ہونگے، مدرسہ آنیکی غرض پوری ہوگی امتحان میں کامیابی میسر ہوگی، دیر حاضر لڑکے نہ صرف اپنا نقصان کرلیتے ہیں بلکہ غیر وقت آنے اور اپنی اپنی نشست پر بیٹھنے کے وقت حاضر باش اور پابند طلبہ کی توجہ کو بھی منتشر کرنیکا باعث ہوتے ہیں اور اُن کے سبب سے استاد کا بھی کچھ وقت ہر ایک دیر حاضر لڑکے سے وجہ دیر رسی پوچھنے میں ضایع ہوئے بغیر نہیں رہتا، معلوم ہوا کہ دیر حاضری ایک متعدی مرض ہے جس کا نقصان دیر حاضری سے گذر کر اوروں تک پہنچتا ہے۔ پس ایسی مضر چیز سے پرہیز نہایت ضروری ہے۔

قطع نظر اوقات مدرسہ کی پابندی کے طالب علم کا فرض ہے کہ اپنے گھر پر بھی خاص ضبط الاوقات کا نقشہ بنالے جس کی پوری پابندی کرے تاکہ مدرسہ کے باہر اور اندر ہر طرح پابندی اوقات کا عادی رہے۔

(باقی)

تاریخ پر جغرافیہ کا اثر

(اثر خامہ جناب آچاری صاحب)

جغرافیہ بمنزلہ جسم اور تاریخ اس کی روح ہے جس طرح روح کیلئے جسم کی ضرورت ہے اور اس کی تمام ترقی اور اہمیت کا انحصار جسم پر ہے اسی طرح کسی ملک کی تاریخ کا انحصار بہت کچھ اس کی جغرافیائی حالت پر ہے۔ مثلاً صحرائے اعظم جیسے قطعہ کی تاریخ جہاں کی جغرافیائی حالت نہایت خراب اور زبون ہے اتنی بہتر اور شاندار نہیں ہو سکتی جتنی کسی ایسے ملک کی جہاں کی سرزمین کو قدرت نے زرخیز بنا کر مختلف معدنیات اور خوش گوار موسموں سے مالا مال کر دیا ہو۔ مذکورۂ بالا حالات کا اثر تاریخ پر نہایت اہم اور قابل لحاظ ہوتا ہے۔ اس کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے ہم اپنے ملک کو مثالاً لینگے اور دیکھینگے کہ اس کی جغرافیائی حالت نے اس کی تاریخ پر کیا اثر کیا۔

پہلے ہم اپنے ملک کے مظاہرات طبعی یا خارجی شکل کو لیتے ہیں۔ ہندوستان زرخیز اور پرفضا میدانوں کا ملک ہے جس کے شمال میں ہمالیہ کے سربفلک پہاڑ کھڑے ہیں اور جن کو شرق مغرب اور جنوب میں بحرِ ہند گھیرے ہوئے ہے اگر صرف ہمالیہ کو لے لیا جائے تو ہم دیکھینگے کہ اس کا کچھ کم اثر ہماری تاریخ پر نہیں پڑا۔ اچھا خوشگوار موسم بارش کی کثرت، زمین کی زرخیزی شمال شرق میں بیرونی حملہ آوروں سے حفاظت، یہ سب باتیں ہمالیہ ہی کے وجہ سے حاصل ہوئی ہیں، تاہم شمال مغرب کی جانب سے حملہ آور اہلِ ہند کو پریشان کرتے رہے۔ اگر ہندوستان کے شمال مغرب میں

درے اور راستے بند ہوتے تو آج یہاں کی تاریخ کچھ اور ہی ہوتی' سمندر نے بھی ہماری اس وقت تک بخوبی حفاظت کی۔ جب تک کسی انسان کو ادھر عبور کی قدرت حاصل نہ ہوئی چنانچہ فن جہاز رانی کی ترقی کے ساتھ ساتھ پرتگیزی' ولندیزی' فرانسیسی اور انگریز ہندوستان کے ساحل پر تاجروں کی حیثیت سے آ بسے ایک عرصہ تک ان اقوام یورپ میں پہلے پہل مقابلۂ تجارت اور پھر ہندوستان میں ایک انہی مستقل حکومت قایم کرنے کے لئے باہم کش مکش رہی لیکن آخر کار دوسری قوموں کو اُس قوم نے شکست دی جس کو بحری قوت میں فوقیت حاصل تھی اور جو اس کو اس کے ملک کی جغرافیائی حالت یعنے جزیرہ ہونے سے ہوئی۔ یہاں کے میدانوں کی شادابی' جہاں ایک طرف اہل ہند کے لئے رحمت آلہی ہے وہی وہاں دوسری طرف بیرونی حملوں کی وجہ قرار پائی؛ ان حملوں نے اہل ہند کو سخت مصائب میں مبتلا کیا' یہی زرخیزی اہل ہند کی کمزوری اور انحطاط جسمانی کا سبب ہوئی۔ کیونکہ جس زمین کو قدرت نے اپنے دین سے مالا مال کر دیا ہے وہاں کے لوگ محنتی نہیں ہوتے بلکہ آرام طلب بن جاتے ہیں۔ برخلاف اس کے جہاں قدرت نے فیاضی سے کام نہیں لیا ہے وہاں کے باشندوں کو اپنا پیٹ پالنے کے لئے سخت محنت کرنی پڑتی ہے جس سے وہ مضبوط اور توانا ہو جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے ہندوستان میں پہلے آنیوالی قوموں نے ہمیشہ بعد میں آنیوالی قوموں سے شکست کھائی ہے !!؟

بندھیاچل' ست پڑا اور مغربی گھاٹوں نے بھی ہماری تاریخ کی تشکیل کی ہے' یہ انہی دو پہاڑ کوہ بندھیاچل اور ست پڑا کی سنگین دیواروں کا نتیجہ تھا کہ

جس وقت شمالی ہند میں بدامنی اور شورش پھیلی ہوئی تھی اس وقت جنوبی ہند میں کامل امن و امان تھا اور لوگ اطمینان سے زندگی بسر کر رہے تھے مغربی گھاٹوں کی سرزمین نے سیواجی جیسے قزاق کو ایک علیحدہ سلطنت قایم کرنے اور اپنے وقت کی عظیم ترین قوت سے بغاوت کرنے کا موقع دیا، آج ہم دیکھتے ہیں کہ بمبئی کلکتہ اور رنگون جیسے شہروں کی ترقی کا باعث زیادہ تر اُن کا محل وقوع ہوا ہے، ان کا خشکی اور تری کے درمیان واقع ہونا اور اس کا سرسبز و شاداب ہونا دونوں امور ان کی ترقی کے باعث ہوئے ہیں، اب ہم چین اور جاپان کو شامل لیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ ان ممالک کی جغرافیائی حالت نے ان کی تاریخ پر کیا اثر ڈالا ہے، قدرت نے چین کے ممالک کو دوسرے حصص سے بذریعہ بے آب و گیاہ صحراؤں اور سر بہ فلک پہاڑوں کے بالکل علیحدہ کر دیا ہے جس کی وجہ سے اہل چین اپنی قدیم روایات اور رسوم کو اب تک قایم رکھ سکے ہیں۔ دوسری طرف ہم کو اہل جاپان نظر آتے ہیں جن کو یورپ اور امریکہ کے ملاحوں سے ملنے جلنے کا اتفاق ہوا ہو ممالک غیر کو گئے وہاں علوم و فنون حاصل کئے اور واپس آ کے اپنے ملک اور قوم کی حالت کو درست کیا یہی حالت ہم کو یورپ میں بھی نظر آئیگی۔ مثلاً مینچسٹر لیورپول لنین گریڈ اور برلن جیسے شہروں کے تمول اور بزرگی کا باعث ان کی جغرافیائی حالت ہوئی ہے؛ قسطنطنیہ اور دردانیال کا محل وقوع سہولت کے لحاظ سے اکثر لڑائیوں کا محرک ہوا اقوام یورپ کی تاریخ نو آبادیات میں بھی انہی وجوہ کو بہت کچھ دخل ہے طمع زر امریکہ جزائر غرب الہند افریقہ اور اسٹریلیا کے دریافت کی باعث ہوئی کوئلہ اور لوہے کی کانوں نے تجارت میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا، ان

مثالوں سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہر ملک کی تاریخ کی ساخت میں وہاں کی جغرافیائی حالت کو بہت کچھ دخل ہوتا ہے' تاریخ کے طالب علم اپنے مضمون کو نہایت دلچسپ پائینگے اگر وہ تاریخ کا مطالعہ اور اُس کے واقعات کا مقابلہ وہاں کی جغرافیائی حالت سے کرتے جائیں۔ چنانچہ ہمارے لئے یہ بہت ضروری ہے کہ ہم جغرافیہ کی تعلیم پر جدید طور سے توجہ کریں۔

ارتقائے عمل تعلیم

(۲)

(از مسٹر گنیش چند بی۔ اے)

مقصد تعلیم طریقۂ تعلیم اور نصاب تعلیم کا انحصار زیادہ تر مقصد تعلیم پر ہے اس لئے سب سے پہلے یہ معلوم کرنا چاہئیے کہ تعلیم کا مقصد کیا ہے ؟

تعلیم کے مقاصد متعدد ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ صرف بسر برد کے لئے تعلیم حاصل کی جاتی ہے بعض کی رائے ہے کہ تعلیم کا مقصد صرف علمی معلومات میں معتد بہ اضافہ کرنا ہے، بعض اشخاص تعلیم کا مقصد اخلاق کی درستی تبلاتے ہیں لیکن امریکہ کے چند مشہور مخصوصین تعلیم نے مذکورہ مقاصد تعلیم کو پیش نظر رکھکر تعلیم کا مقصد یہ تبلایا ہے کہ سوسائٹی کا بہترین رکن پیدا کیا جائے" انسان سوسائٹی کا بہترین رکن اسی وقت بن سکتا ہے جب وہ اپنی اور اپنے خاندان کی پرورش شائستہ اور عمدہ طریقہ سے کر سکے، اس کے اخلاق اس قدر وسیع ہوں کہ سوسائٹی اس کو پسند کرے، نیز اُن کے معلومات اس قدر کافی ہوں کہ مسائل معاشرت پر نظر غائر ڈال سکے"۔ تعلیم کا یہ مقصد نہایت بسیط اور جامع ہے!

لیکن انگلستان کے بعض مخصوصین تعلیم نے اس مقصد پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اس میں انسان کی انفرادیت کو اتنی اہمیت نہیں دی گئی ہے جتنی کہ سوسائٹی کو کیونکہ ظاہر ہے کہ انسان سوسائٹی کے لئے اس وقت تک کسی طرح کار آمد نہیں ہو سکتا جب تک کہ اوّلاً اس کے ذاتی انفرادی نشوونما ہو پس بقول نن، انفرادی ارتقار

زندگی کا نصب العین ہے۔

مذکورہ مقاصد کو پیش رکھکر مقصد تعلیم کی بہترین تعبیر یہ ہوسکتی ہے کہ تاوقتیکہ انسان خود کی تربیت نہ کرے اسکی ہستی سوسائٹی کے لئے کسی طرح کارآمد اور مفید نہیں ہوسکتی لیکن ساتھ ہی اس کی تربیت ایسی ہونی چاہیئے کہ وہ آخرکار سوسائٹی کا مفید رکن بن سکے یعنی یہ کہ انسان کی تربیت ایک ساتھ ذاتی اور سوشیل ہو' اس مقصد کو پیش نظر رکھکر یہ معلوم کرنا چاہیئے کہ تعلیم کے خارجی اجزا کیا ہیں ؛ تعلیم کے چار عناصر ہیں۔ اول مرکز تعلیم۔ دوم متعلم۔ سوم معلم۔ اور چہارم طریقۂ تعلیم[1]

مرکز تعلیم تعلیم کی پہلی تعلیم گاہ مدرسہ نہیں ہے بلکہ گھر ہے' یہ وہ مقام ہے جہاں بچہ دیگر ممبران خاندان کی مدد سے اپنے ماحول سے واقف ہوتا ہے' اس لئے مکان کی تعلیم بچہ کی آئندہ تعلیم کا سنگ بنیاد ہے چنانچہ اکثر مصلحین تعلیم نے ماں کی تربیت پر بیحد زور دیا ہے۔

لیکن مدرسہ کی اہمیت کسی طریقہ سے کم نہیں ہوسکتی کیونکہ مدرسہ کی تعلیم ایک باضابطہ صورت اختیار کرتی ہے' دوسرے مراکز تعلیم میں اس کے معلومات اتفاقی اور سوقتی ہوتے ہیں' لیکن مدرسہ اول تو محصلہ معلومات میں اضافہ کرتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ان کو باضابطہ اور منظیم یافتہ شکل میں پیش کرتا ہے اور تیسرے یہ کہ ان نقائص کو دور کرتا ہے کہ جن کا بچہ مکان دیگر مقامات میں عادی ہوگیا ہے۔

---

[1] نصاب تعلیم بھی عناصر مذکورہ میں نہایت اہمیت رکھتا ہے اور مذکورہ ہر چہار عناصر میں مشترک اور ان پر حاوی ہے۔ (اڈیٹر)

ماسوا اس کے مدرسہ وسوسائٹی وغیرہ کی ضرورت اس زمانہ میں اس وجہ سے بھی ہے کہ ان ذرائع سے انسان اپنے گذشتہ کارناموں پر نظر دوڑا سکتا ہے اور اس کو پیش نظر رکھکر مستقبل کی فکر کر سکتا ہے، گذشتہ زمانہ میں بچہ کی تعلیم مکان میں کافی ہوجاتی تھی کیونکہ اس وقت طرز معاشرت اس قدر پیچیدہ نہ تھا' تہذیب کی غیر معمولی ترقی اور موجودہ طرز معاشرت کی پیچیدگی نے مدرسہ کے وجود کو ناگزیر کردیا ہے۔

متعلم مدرسہ کی اہمیت اور ضرورت پر غور کرنے کے بعد ہم کو یہ معلوم کرنا چاہیئے کہ موجودہ زمانہ میں تعلیم پر کیوں زیادہ زور دیا جارہا ہے' اس کے دو وجوہ ہیں۔ ایک یہ کہ زمانہ گذشتہ میں نصاب تعلیم پر زیادہ زور دیا جاتا تھا تاکہ تعلیم پوری ہو' مدرس کی خوبی زیادہ تر اس میں تھی کہ طالب علم نے دس یا پندرہ کتابیں پڑھیں لیکن اب یہ غور کیا جارہا ہے کہ طالب علم نے نصاب کو بخوبی سمجھا یا نہیں اور آیا اس نے علوم محصلہ کو بہترین طریقہ سے کام میں لانیکی کوشش کی یا نہیں۔ دوسرے یہ کہ انگلستان اور امریکہ میں آغاز جمہوریت سے ہر متعلم کے متعلق (خواہ اس کا رتبہ سوسائٹی میں کیسا ہی ہو) یہ خیال پیدا ہوگیا ہے کہ اس کا وجود سوسائٹی کے لئے بیحد مفید ہے: ہر شخص میں بڑے سے بڑا کام کرنے کی قابلیت موجود ہے' پس اس کی تعلیم ایسی ہونی چاہیئے کہ اس کی پوشیدہ خوبیاں علانیہ نمایاں ہوجائیں یہی وجہ ہے کہ متعلم کے فطری رجحانات معلوم کرنے کے لئے آج کل ٹریننگ کالج وغیرہ میں نفسیات کی تعلیم بھی شریک نصاب کی گئی ہے۔ مذکورۂ ہر دو اسباب سے دو نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ تعلیم کی خوبی کا معیار محض متعلم کے معلومات کا ذخیرہ نہ رہا۔ دوسرے معلمان تعلیم نے جماعت واری طریقہ تعلیم کو مضر خیال کیا کیونکہ اس سے غبی اور ذہین

طالب علم فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔

معلم اس مضمون کا تیسرا جزو معلم ہے جس کی وساطت سے متعلم اپنی فطرت کو باعتبار اپنے ماحول کے بدلتا ہے، لازماً کسی طالب علم کی تعلیم نہایت ناکمل ہے اگر وہ عملی دنیا میں ناکارہ ثابت ہو، چنانچہ مدرسہ حقیقی دنیا کا ایک چھوٹا سا نمونہ ہے محض ارشاد اور طلبہ کے درمیان تبادلہ خیالات تعلیم کے اعلیٰ مقصد کو پورا نہیں کرتا تعلیم کی خوبی یہ ہے کہ متعلم مدرسہ کی تعلیم سے ایسا روشن دل ہو جائے کہ طالب علمی کے زمانہ سے ہی اس کو دوسرے مراکز تعلیم کی درستی کی فکر ہو یعنے اس کو سوسائٹی کی بہبودی کی لَو لگ جائے حالانکہ موجودہ زمانہ کی تعلیم اس مقصد کے حصول میں بیحد رکاوٹیں پیدا کر رہی ہے تعلیم کے اصلی معنی یہ ہیں کہ ایک قلب دوسرے قلب کو متاثر کرے اور معلم کی روحانی خوبیاں متعلم کے دل میں جاگزیں ہو جائیں اور یہ معلم کا فریضہ ہے کہ اس قسم کا ماحول قائم کر دے۔

طریقۂ تعلیم اب دیکھنا چاہیئے کہ متعلم کس طریقۂ تعلیم سے معلم کے زیر اثر رہ کر مدرسہ کی تعلیم سے بہترین استفادہ حاصل کر سکتا ہے، چنانچہ آئندہ ابواب میں اُن طریقہ ہائے تعلیم سے بحث کی جائیگی جن کو انگلستان اور امریکہ کے معلمان تعلیم نے متعدد تجربوں کے بعد بہترین اور معقول تصور کیا ہے۔

فطرت اطفال ہر چہار خارجی اجزا تعلیم پر غور کرنے کے بعد ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ آیا انسان کی تعلیم اس کے ماحولی اثرات کا نتیجہ ہے یا بچوں کی فطرت بھی اس تعلیم میں مانع یا مددگار ہوتی ہے، پیدائش کے وقت بچہ کی حالت کئی حیثیتوں سے حیوان کے مماثل ہے لیکن بچہ کی تعلیم پانیکی خاصیت اسکو حیوانوں سے برتر بناتی ہے یوں تو

حیوانوں کو بھی تعلیم دیجا سکتی ہے۔ لیکن انسان جس خوبی سے اور جس حد تک تعلیم پا سکتا ہے وہ حیوانوں کو میسر نہیں۔ پس مدرس کا کام یہ ہے کہ آئندہ ضروریات کے مدنظر بچہ کی فطرت کی تکمیل کرے۔ مثلاً بچہ کی فطرت ہے کہ وہ مختلف چیزوں کو جمع کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک ہشیار استاد بچہ کی طبیعت کو کتابوں یا ڈرائنگ کے نمونوں کو جمع کرنیکی جانب مائل کر سکتا ہے۔

تعلیم کی تعریف ہم بحث بالا سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ تعلیم سے مراد وہ طریقہ ہے جسکو معلم مدرسہ میں اس طرح سے استعمال کرتا ہے کہ طالب علم اپنی فطرت کو ماحول کی ضروریات کے مدنظر بنا سکے تعلیم معاشرت کا گہرا تعلق ہے۔ ہر زمانہ میں تعلیم کا نصب العین معاشرت کے نصب العین کے مطابق تبدیل ہوتا رہا ہے۔ مثلاً یونانیوں میں جسمانی تعلیم پر زیادہ زور اس وجہ سے دیا جاتا تھا کہ وہ اسی شخص کو بہترین تصور کرتے تھے جس کا جسم سڈول اور خوبصورت ہو۔ پس ہماری موجودہ تعلیم لازماً ہمارے نصب العین زندگی کے مطابق تکمیل پانی چاہیے چنانچہ موجودہ زمانہ میں (بالخصوص جنگ عظیم کے بعد) مروجہ طریقہ تعلیم میں جو اصلاحات کی گئی ہیں ان کو نئی تعلیم کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔
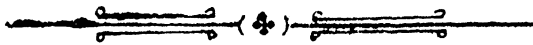
متفرقات

حال میں بلدۂ حیدرآباد کے قابل تعلیم اطفال کی فرد شماری کی گئی تو معلوم ہوا کہ حدود صفائی کے اندر ایسے بچوں کی تعداد جو چھ اور بارہ سالوں کے درمیانی عمروں میں ہیں ۲۰۰۰۵ ہے جن میں ۸۵۸۴ زیر تعلیم ہیں، ان میں سے ۷۴۰۱ پبلک مدارس میں اور ۱۱۸۳ خانگی مدارس میں زیر تعلیم ہیں اور منجملہ ۱۱۴۲۱ بچوں کے جو کہیں بھی تعلیم حاصل نہیں کرتے ۵۳۷۸ مسلمان ہیں، ۳۲۲ برہمن، ۳۶۰۲ غیر برہمن ۲۰۰۸ نیچ قوم کے، ۱۰۷ عیسائی اور ۴ پارسی ہیں۔

لطفیہ کمپنی ۴۲۲۸ ناگا باؤلی یاقوت پورہ حیدرآباد دکن سے چند تعلیمی اشیاء بغرض تبصرہ وصول ہوئی ہیں۔ جن پر اشاعت آئندہ میں انشاء اللہ ریویو ہوگا۔

نرخ اشتہارات حیدرآباد ٹیچر حسب ذیل ہے

مقدار	سال بھر	۶ ماہ	فی اشاعت
پورا صفحہ	عـہ	صہ/	سے/
نصف صفحہ	صہ/	یہ ۱۲/	عہ ۸/
ربع صفحہ	مہ ۸/	عہ ۶/	۱۲/
فی سطر	۱۰/	۸/	۶/

Hyderabad Teacher

ADVERTISEMENT RATES.

Space		Whole year Rs.	A	P.	6 months Rs.	A.	P.	per issue Rs.	A.	P.
Full page	..	10	0	0	5	8	0	3	0	0
Half page .	..	5	0	0	2	12	0	1	8	0
Quarter page	..	2	8	0	1	6	0	0	12	0
Per line ..	..	0	10	0	0	8	0	0	6	0

SUBSCRIPTION RATES.

O.S. Rs. 3 including postage for the Nizam's Dominions
B.G. Rs. 3 do do British India annually
O.S. 12 AS. excluding postage for the Nizam's Dominions per single copy
B.G. 12 AS. do do British India do

tion of the girls does not make it possible for them to get any help at home. So all learning is done while they are with the governess.

Printed assignment sheets are distributed to each girl by units. She does her reading or exercise, enters answers in the sheets where required and sends them back to the Teachers' College as soon as a unit is finished. A member of the college staff then goes through the answers, corrects, and marks them and records the results in a graph, noting the time taken by each individual girl to finish the assignment. The corrected assignments are then returned to the governess for the girls concerned who put them back in their loose-leaf covers.

(*To be continued.*)

ments have been made to individualise instruction in these primary classes in reading, arithmetic and hygiene. Reading comprises two stages, *viz.*, the alphabet and post-alphabet stages.

The idea is to train beginners to individual work by " directed study. "

At the primary grades of the zenana classes the object is literacy for every pupil, so the individual differences are to be counteracted. All children must master the common essentials. It is, however, not enough merely to arrange for the mastery of common essentials without providing for activities. A mere passive aspect of learning brings in boredom.

The existing text-books on the market for beginners are not suitable for individualised work, for such books are characterised by lack of self-instructive material and its suitable gradation. For this reason texts in assignment forms have been specially prepared and printed in reading and arithmetic, the cost being met from the Government grant. An approved textbook in hygiene has been selected to be used as a guide book and is supplemented by printed assignment sheets.

Organization.

The original idea was to try the experiment with only 20 pupils but eventually the number increased to 36. These pupils are of ages varying from 7 to 16—but all beginners. Each of the 36 pupils is given a printed copy of the course of study for the three subjects in which the instruction is individualized. The assignments are for a fortnight. No daily assignment is given. This is the essence of the " individual system. " The pupils spend their time under the direction and assistance of the governess and learn mostly by their own efforts.

The girls assemble in centres twice a week. The governess visits the centres as many times. The home condi-

4. Clerks write out lists to dictation, calculate prices and make out the total.

C. 1. Clerk's list and the original presented to cashier for verification and noting down changes payable.

2. Cashiers hand back the list to the customers.

IV. Individual Work in the Primary Grades.

The Origin of the Scheme.

The need of a plan of individual instruction in certain Primary schools of the city operated by sub-inspectors under training at the Teachers' College was keenly felt. Last year the Government of Bengal felt the necessity of revising and improving the system of education obtaining in the zenana classes. The Principal of the Teachers' College at Dacca was accordingly asked to draw up a scheme for the zenana classes at Dacca on the lines of Parents' National Educational Union in England. The object of Government was to break down illiteracy in the zenanas and to make the short course of training the pupils received really effective, so that when they left off they might carry away with them something of future use. Thus the scheme for individualised instruction as drawn up by the Teachers' College originated not as an application of an educational theory but as a means of meeting the pressing needs.

The zenana classes are attended by pupils from the poorest homes. So the zenana governess has to meet difficulties due to lack of experience and lack of money. Government have specially considered the latter fact and have made a generous annual grant of Rs. 900 which has been placed in the hands of the Principal of the Teachers' College at Dacca to meet the cost of the experiment. The pupils of the zenana classes are supplied free of cost with printed assignment sheets, printed questions for tests, loose-leaf covers for the sheets and pencils. Arrange-

kind of co-operative work enables pupils to gather wide knowledge of the subject in all its correlation. For example, under the project method a lesson on the "Chief Cities of India" will enable pupils to learn all about the chief cities of the world. And it may be possible to so work out projects in geography as to exhaust the fundamental geographical facts and enrich the stock of geographical knowledge.

The manuscript copies of the project work have been preserved by the head-master in his office. His Excellency the Governor of Bengal had a look at them when he came to visit the Education Exhibition of the work of the Training College and connected institutions in March last.

A PLAN OF A PROJECT LESSON IN ARITHMETIC

The Lesson Plan

Class IV

I. Organisation.

Salesmen	5
Clerks	5
Cashier	2

II. General Instructions.

Payment in complete rupees and changes demanded.

III. Plan.

A. 1 Discussion on last lesson.
2. Project announced and explained.
3. Salesmen, clerks and cashiers selected.

B. 1 Rectographed price lists distributed.
2. Pupils make out their list to meet their imaginary requirements.

Prices added up.

3. Lists presented to salesmen. Items out of stock cut out of the lists.

few projects that were worked at the Armenitola Government High School were based on this principle.

The Projects worked.

Three Projects were got up by certain members of the school staff. One evolved from the unsatisfactory learning of the immediate environmental facts of geography so as to develop a sound basis for the study of geography round large central topics. Another object was to enable children to learn through their own effort and combine activity to book-work. This Project—the Survey of the town of Dacca—was worked individually by boys of Class VI under the guidance of a teacher of the school.* The pupils went out on excursion with the teacher, collected materials and embodied them in a book written by each individual pupil. This book gives all kinds of useful information in so far as they interest young people including the industry and antiquities of the place. It is illustrated by maps drawn by each individual pupil and illummined by cut pictures. These young people know more about Dacca than ordinary Matriculates.

The two other Projects worked were—

(1) The coal industry of Bengal.
(2) The tea industry of Bengal.

These projects are results of group work pursued voluntarily by pupils during free periods with a secretary. The plan and contents having been decided upon the collection of material for different items was entrusted to different groups. Eventually these materials were tabulated and made into books. They give all kinds of information useful to school students of upper forms. The books have been amply illustrated by cut pictures and graphs. The language is simple and does credit to the secretary. This

* Babu Girindranath Mukherjea is responsible for the organisation of this project and Babu Kumudbandhu Sen Gupta for the two others.

III. *Projects at the Armenitola Government High School. Difficulties of the Method.*

Projects offer scope for living and working with others, hence they are an effective means of social training. They lend themselves to group activities to secure a common desired end and every child contributes his share towards the end. There are co-operation and discussion which prepare children for good citizenship. But there are difficulties in the way of projects.

The examination conditions of our country are against the success of this method. The projects propose to get all subjects mixed up in a general jumble which is against the successful working out of the curriculum.

McMurry's big projects put the school work out of gear. Small projects which do not interfere with the systematic work of the school are really useful. In America it has been possible to plan out projects which eventually evolve a curriculum. But in this country there are difficulties in so doing. Hence *occasional small* projects seem useful towards socialising education. But their scope is very limited. For example, in arithmetic the four simple and compound rules can be worked into projects, though they hardly fulfil the conditions required of them. Similarly, in history Alexander's march may be worked into a project. Though defective, these small disconnected projectes prove useful in securing social training. In geography such projects are very useful. Encyclopædic tendencies in geography are now discouraged. An old-fashioned student of geography is said to resemble a piece of cloth made by sewing together hundreds of strange arrays of patches. This kind of equipment does not give a comprehension of general geographic principles or large fundamental facts to be an aid to the pupil in comprehending the world geography. Thus in geography organisation of the study around a few large central topics or projects is emphasised. The

and Individual Methods in lower classes of schools in Bengal. The Plan was tried in Class IV for all class subjects. The assignments were for a week and the traditional Time-table was not abolished. Pupils were not jerked out of their work by the periodical school bell, but continued to work at a subject without changing so long as their interest did not flag in it. But they were to adhere to the subjects fixed for the day. This system was liked by the pupils inasmuch as it gave the young learners more freedom and scope to proceed at their own rate. Besides, this system is free from the complications of the Dalton Laboratory Plan. It encourages individual work and sets the teacher free to give effective help to those who need personal supervision and instruction. All the students of a class are together in the same room, so it is easy and convenient for the teacher to explain new principles and processes for the benefit of the whole class. The difficulty is felt about the preparation of assignments which need constant revision and modification in the light of experience. The research scholar left his work in May, 1925, but the experiment is being still run on by a member of the staff of the school. It is not yet time to tabulate the strong and weak points of the experiment, but the comparative results show that a larger percentage of scholars win success and happiness under this method who under the traditional class method would not be nearly half as successful and half as happy. This plan is well worth trying as a first step to the introduction of the Dalton Laboratory Plan in some of the lower classes of High schools in Bengal. Jessie Mackinder has given her impressions of individual methods in lower classes in the Twenty-fourth Yearbook. She is definite in one point, *viz.*, that not more than 35 children ought to be in a class for individual methods of whatever form. The larger the class the longer the time required to bring the class to a given level.

subject. Teachers in training at Dacca ordinarily take three class subjects, hence the problem of specialists presents no serious difficulty with them.

Some simple graphs for keeping records of work.

1. *The Contract Card.*

	History						Geography	Mathematics	English, etc.
Boy									
Boy									
Boy									
Etc.									

Drawlines through the small sq. against each boy showing the amount of work done. Each small square represents one-sixth of the amount set for the week.

Name............

Class............

2. *The Class Record Card.*

Subjects	Week						2	3	4
History									
Geography									
English									
etc.									

3. *Subject Record Card.*

Boy	Week 1						Week 2	Week 3	Week 4
Name									
Name									
etc.									

4. The Letter-mark graphs as an effective means of *ad interim* evaluation of of pupils' work.

Subject..........

Class..........

	Week 1						Week 2	Week 3	Week 4
Boy	A	B	A—	B +	C+	A			
Boy	A—	B+	A	C+	B+	A—			
Boy	B+	C+	B—	A—	B—	A			
Boy	C	A—	B+	B—	B	A—			

and so on.

II. *The Single-class Dalton Plan.*

The single-class Dalton Plan was first tried at the Armenitola Government High School by a Research student in July 1924 who undertook to research on English

4. The real strain if it is ever felt is in connection with marking and construction of assignments. The strain will lessen if the suggestions mentioned are carried out. As it is, the call upon teachers' time and energy is certainly severe, but it may not be undue provided the school is organised properly to suit the work.

TIME-TABLE. 1925.

ARMENITOLA GOVT. H. E. SCHOOL.

Class	Days	10·45-1·15=2½ hrs. daily or 14¼ hrs. weekly 1 2 3	1·45. 3-30 or 9½ hrs. weekly 4 5	3·30-4 6
X	M T W Th F S	Dalton work in English, Mathematics and Vernacular	Dalton work in Histoy, Geography and Optional Subjects	Reserved for Lessons and Drill.
IX	Do			
VIII	Do			
VII	Do			
VI	Do ..	Traditional Time-Table	Traditional Time-Table	Traditional Time-Table
V	Do			
IV	Do			
III	Do			

N.B.—(1) On Fridays the third period has no work to enable Muhammadans to say their Jumma prayer.

(2) On Saturdays there is no fifth period and to last for the traditional classes.

(3) The two bottom classes are let off at 3-30.

It has been pointed out that specialists at Armenitola also take an extra subject. Specialists appear not to be essential any more than a number of subject rooms. Interest and efficiency usually go together, hence specialists imply efficiency. But one teacher may specialize in more than one subject for the High Schools of Bengal which are inferior to English High schools in point of standard. So the case of the latter is different. Thus is it that at Armenitola more than one subject are taken in one room though the original plan recommends one room for one

The Dalton Laboratory Plan at Armenitola Government High School, Dacca

BY

G. BHATTACHARYA,

Professor, Training College, Dacca

(Continued from the previous issue)

Copying.

It is a real danger. Test is a check. But it will disappear with the development of the sense of responsibility ensured by the individual work on correct lines.

The other points of difficulty so far felt are :—

(1) the marking of written work.
(2) Possible lack of vocal practice and expression.
(3) Difficulty of oral lessons with pupils at different stages.
(4) Undue strain on teachers.

1. The difficulty may be removed by answer sheets as already suggested. Otherwise teachers must have enough time for the purpose. This will need to be arranged. Monitors must not be used for help for obvious reasons. But marking and checking of written answers are essential.

2. There must be some provision for this purpose. At Armenitola the last period is utilised for this when necessary.

3. This difficulty is more imaginary than real. This is not absent in the Class system.

consider the rapid growth of the movement within these few months, we do not fear any difficulties now before us. The main trouble is the inadequate number of trained leaders. If teachers would but realise the value of the scout movement and join us in greater numbers, their knowledge of boys and their experience would prove a very helpful reinforcement of our present weakness.

happy, practical things of nature. It insures loyalty to God and country, a helpfulness to other people at all times and obedience to duly constituted authority. A good scout is efficient in first aid, life-saving, signalling, tracking, cycling, nature-study, wood-craft, camping, and all the handicrafts. Scouting is non-sectarian and aims at good citizenships. The scheme of scouting includes an all-round development of the boys—physical, mental, emotional and spiritual—by a system of games and exercises which attract the boys and keep them going. Scouting is, as is often said, both a supplement and complement—outside the school hours—to the education imparted within the four walls of the class room. It serves as a helpful link between the school and the home with the scout-master as a quasi-teacher and a quasi-parent of the boys entrusted to his care. "Education through play is the keynote of scouting and service to others is its highest purpose." B.P.

The movement is still in its infancy in our state ; yet, it has already been placed on a sound footing. Thanks to the benevolent support of the Government of His Exalted Highness the Nizam, it has to-day a splendid organisation of its own. About forty scouters were trained at the first Golconda Camp by Mr. K. S. Kamath of the Madras Provincial Organisation, and the majority of them are actively engaged building up the local organisation for God, the Nizam and the country. There are already twelve troops with about 300 scouts, and the greater popularity and the growing need of the movement will, no doubt, duly enlist every available boy.

It is rightly pointed out that "Hyderabad offers a wonderful opportunity to develop scouting, and in the stalwart boys of Hyderabad the Boy Scout Movement will find apt material to work out its laudable citizen building programme." No doubt the movement is new to us and presents many difficulties in the beginning. But when we

It is the purpose of the Boy Scout Movement to utilize the boys' leisure time under competent and sympathetic leadership, to popularize a large number of outdoor games and occupations of various sorts in which each boy can have a full share, and to provide the incentive that will attract and hold the boys. It is its purpose to supplement all existing educational advantages and not replace any of them. It is true, as Lt.-General Baden-Powell has written, that " The boys of the Nation are full of enthusiasm and spirit, and only want their heads to be turned the right way to become good, useful citizens.... They want a hand to guide them at the cross-roads where their futures branch off for good or for evil."

Probably the most valuable material of any country is its boys—the potential leaders of the country a few years hence. Scouting is glorious fun, and it can be used to attract our biggest national asset—the Indian boy. " Capture the boys of to-day and you have got the men of to-morrow. " The Boy Scout Movement emphasizes not only the development of men of good character, but leaders of men. Perhaps the greatest need of this country at the present moment, with its untold resources and possibilities, is men who are able to lead and take initiative. The quality of leadership is partly born in a person, but it is also largely determined by training and development. The only time leadership can be developed so that it really becomes part of the character of the individual is during the scout age, when the mind is in a plastic state, which makes such training possible. J. Adams Puffer writes in *The Boy and His Gang*, " Of all the present-day organisations for the improvement and the happiness of normal boyhood, the institution of the Boy Scouts is built at once on the soundest psychology and the shrewdest insight into boy nature."

Scouting appeals to the boy and it leads from the unguided and often vicious play of the streets to the healthy,

The Need for Scouting

BY

T. N. SIVAN,

Assistant, All Saints' Institution.

THE Boy Scout movement organised and directed by Lieut.-General Baden Powell has met with phenomenal success throughout the world. It is an institution for instruction and training in good citizenship. There is equal need and opportunity for such an organisation in every country.

The aim of the movement is that boys should grow into sturdy, self-reliant and useful citizens. They must have much outdoor life and be trained in personal initiative and resourcefulness, keenness of perception and alertness in action, courage, cheerful obedience, ability to command, self-control, ability to do team work and the other manly qualities that can be developed in healthy outdoor sport.

Modern conditions in homes and schools are gradually withdrawing boys from the open. In country schools, every boy lives much in the open. He plays games for the fun and adventure of the game, and relies upon his own personal initiative for success. The boy reared in the city has too much done for him, while the boy reared in the country must do much for himself. And then every boy in olden times played his full part in all the sports of the field and playground, while the majority of boys in the modern town or city, whether in or out of the schools, must be content with watching the games played by the regular teams.

ing greater than his simple lines :

> As I wandered in the forest,
> The green leaves among,
> I heard a wild flower
> Singing a song,—

lines themselves as beautiful as a wild flower, or

> The wild deer wandering here and there
> Keeps the human soul from care.

Or

> Everything that lives is holy.

(To be continued)

suddenly aware of what is beyond those portals. Not only in solemn moments does this happen, but this revelation is one of the characteristics of what we term humour,—and that is why we say that laughter and tears are very close to each other : both are responses to sudden revelation.

Most of you will have read some story by Dickens, and must have been surprised at his extraordinarily vivid presentation of the outward show of things. Do you remember that description of the old miser Scrooge in the *Christmas Carol ?*

'Oh ! but he was a tight-fisted hand at the grindstone, Scrooge, a squeezing, wrenching, grasping, scraping, clutching, covetous old sinner. Hard and sharp as flint, from which no steel had ever struck out generous fire ; secret, and self-contained, and solitary as an oyster. (Note the effect in this last line of the proximity of the letters *s* and *t*). The cold within him froze his old features, nipped his pointed nose, shrivelled his cheek, stiffened his gait ; made his eyes red, his thin lips blue, and spoke out shrewdly in his grating voice. A frosty rime was on his head, and on his eyebrows and his wiry chin. He carried his own low temperature always about with him ; he iced his office in the dog-days, and didn't thaw it one degree at Christmas.'

But it is not only the power of words that reveal the external world and its happenings that causes us astonishment. The greatest achievements of language, of the grouping of words, are in the revelation of human personality. A few words uttered by a saint,—how this lustre blinds us, while the endless verbiage of the learned—mere flow of words—sinks away into the deepening shadows. William Blake said that he had written 'Six or seven epic poems as long as Homer, and twenty tragedies as long as Macbeth,' but we may be sure that among them was noth-

Scriptures, and from German critical literature. There have been times when English style was completely transformed, and writers whose English was hardly to be understood because of too close a following and foreign models. You know how difficult Carlyle can be at times when he is under the influence of Richter.

But we must beware of concluding that English style is generally imitative. Its greatness is due to its strong-native quality, which has been made more serviceable by the best that the past has had to give. When we read Julius Caesar or The Merchant of Venice we are in another world than that of ancient Rome, or mediæval Italy—we are in the vaster world of Shakespeare's imagination.

And the sturdy independence of English character has always been reflected in our literature, leading writers to prefer phrases of their own construction to any they have ever read. At times their spirit of rebellion against convention goes to absurd lengths and prevents men from expressing themselves fully and freely.

If we are asked what is the greatest creation of the human race, should we not have to answer : Language?

Words in themselves are profoundly interesting, as full of romance as anything in the world ; but words fulfilling their places in the infinitely varied music of human expression which we call language, that is a manifestation of human activity and achievement which has no parallel in nature.

Words are like gateways that guard the entrance to mysterious depths. From time to time, when words are shone upon by certain lights, when they are ranged in company with other words in certain secret ways that are an echo or reflection of the spirit of man, then we become

lords of language. In fact we may say that in many cases this etymological innocence is made up for by a marvellous instinct for choice and interweaving of words. Few scholars ever wrote as John Bunyan.

'Now, just as the gates were opened to let in the man, I looked in after them, and behold the city shone like the sun; the streets also were paved with gold, and in them walked many men with crowns on their heads, palms in their hands, and golden harps to sing praises withal.'

Bunyan's contemporary John Milton had probably wider scholarship than any English writer except Swinburne, yet where one man has read Milton you may say that a hundred have read Bunyan. It is the same if we compare Dickens with De Quincey—one writing in a torrent from the fervour of heart and brain, the other throwing soundings into the deep past and bringing up solemn and portentous words and images to heighten his effects.

The chief value, no doubt, of etymological study to a writer is to increase his zest in words, and to help him to choose them and place them with the greatest effect. As we read English literature we are conscious here and there of a writer who has this zest in words: Chaucer had it, Spenser, Shakespeare and many of the men about him. Among the moderns Keats most of all, as every poem of his shows us, even if he had not confessed it in his letters and poems. "I look upon fine phrases like a lover," he wrote.

And this sentence leads us further on our way from single words to combinations, to phrases and sentences. It would be possible and entertaining, if we had time, to do with phrases as we have done with a few words, and to show how English syntax has at all times been open to influence from abroad, from the Keltic and Scandinavian fringes, from French and Italian Romance, from Latin and Greek literature, lay and liturgical, from the Hebrew

Words

BY

PROF. E. E. SPEIGHT, B. A.

||*Being the first of three Lectures on Poetry recently delivered to a gathering of Teachers from H.E.H. the Nizam's Dominions.*]

(Continued from previous issue)

ALTHOUGH I have said so much about the past of English words, I would not have you think that such a knowledge is necessary to enable you to understand or to write good English. Bacon called the study of words to the detriment of the thoughts the " first distemper of learning."

It is probable that most of the greatest writers of all ages but the present one had but little knowledge of the precise connection of their language with those of previous ages. We who feel that life and literature would have been so greatly the poorer without Greek poetry, drama, and prose must remember that if the Greeks had leaned upon the past as we do they would never have achieved what they did in art and civic activity. Homer, Sappho, Aeschylus, Plato, and even Aristotle, writers who have affected all later civilization, knew nothing of Sanskrit beyond, perhaps certain place names ; we do not know whether Virgil and Lucretius were aware of more than the obvious connections between Greek and Latin vocabulary and syntax. Boccaccio in Italy, Cervantes in Spain, Shakespeare in England, knew little of philology but were

7. Don't make light of small wounds, cuts or bruises—always apply some simple tincture of iodine without delay.

The lecturer then mentioned that among conditions that required First Aid were cuts or wounds, abrasions or bruises, fractures and dislocations, fits, or faints, stings or bites, and sudden onset of certain diseases. These can be dealt with only by those who have studied the subject of First Aid. The provision for the teaching of this subject as well as of a regular and systematic method of inspection of school children being obvious necessities, the lecturer hoped that the authorities concerned would take the necessary action in the matter as soon as possible.

Dr. Sayeed concluded :—

" Education has three objects in view—That a person should know right from wrong ; distinguish truth from falsehood ; love beauty and hate ugliness. It is time to add to these : Be clean and shun dirt ; eliminate pain and increase general well-being ; strive to be healthy and remove disease."

After thanking Dr. Lateef Sayeed on behalf of the Teachers' Association, the Chairman explained the difficulties which the Education Department had often to face in acquiring suitable plots of land for the construction of school buildings and for use as playgrounds. He pointed out that Hygiene *was* included in the curriculum of the Primary schools. He admitted that this subject was not taught efficiently at present, but now that special attention was being paid to it in the Normal schools, he hoped that there would in future be no scarcity of teachers qualified to teach it. Mr. Ali Akbar also emphasised the need for inculcating on the boys habits of cleanliness, and in this connection, he said that during the 6½ years that he had been an Inspector of Schools, there was nothing to which he had to draw the attention of the Headmasters more frequently than the unsatisfactory personal appearance of the pupils.

there is enough water in our country. Acquire the habit of a daily bath.

2. Wear light clothes, just enough to cover your bodies, make you feel comfortable, and enable you to present a decent appearance.

3. Keep all ventilators, doors and windows open—except when rain or the sun does not allow of it. Fresh air never killed any one.

4. Sit with your backs straight; do not bend over your books.

5. Always deposit waste-paper, refuse or dirt in the places provided for these—covered refuse or dust-bins should be placed in different parts of the buildings, and everything thrown should go into these.

6. If you find yourself straining your eyes during reading; or, if reading gives you an uncomfortable feeling in the head, consult the eye-doctor; for, most probably you need glasses.

7. Choose some form of exercise and stick to it.

What they *should not* do :—

1. Avoid over-dressing and the wearing of heavy or tight clothes.

2. Do not spit about—the habit can easily be controlled and gradually overcome.

3. Do not cough or speak into another's face, specially when you have a cold.

4. Don't drink water where cleanliness is doubtful; and don't eat anything exposed in bazars for sale—ice cream and sweets from street vendors, and bazar sherbets and ærated waters are specially dangerous.

5. Don't go to school if you are ill, specially when you have a cold or sore eyes, or itch until you are quite well; but don't make trivial complaints an excuse for absenting yourself.

6. Don't take exercise or play games when you *feel* ill or tired.

are still the curse of most Asiatic countries ; for instance, Leprosy, Plague, Malaria, Small-Pox, Cholera, Dysentery, and Typhoid, even Phthisis being fairly on the way to its doom in Great Britain.

Dr. Sayeed then classified certain common diseases under the following causes :

1. Blood conditions, namely those caused by the organisms entering the blood-stream—Leprosy, Plague, Malaria, Small-Pox.

2. Infections due to organisms entering the throat, air passages, and lungs—Influenza, Pneumonia, Pleurisy and Phthisis.

3. Diseases propagated through contaminated water, milk, or different foodstuffs, the contamination reaching these by the carelessness or ignorance of people suffering from them—Cholera, Typhoid, Dysentery, and various kinds of worms.

4. Various skin diseases due to unclean habits.

5. Certain other conditions produced by our ignorance of the working of the human body and the different organs.

The lecturer then went on to show how these various causes of disease could be removed by the students being taught to do certain things and not to do others. He took it for granted that the official agencies responsible for the management of schools would provide, in the first instance, properly-situated, well-constructed, and well-ventilated buildings with sufficient accommodation and necessary equipment including appropriate seating arrangements, open spaces, and recreation grounds, etc.

What students at school *should* do :—

1. Keep your bodies and clothes clean—poverty need not necessarily make this difficult or impossible ;

improvement in methods of locomotion and the means of communication—he had reached a position from where he could triumphantly proclaim himself as being " out of the woods ; " and how, at first acting merely instinctively from motives of individual self-preservation, he had gradually and deliberately come to acquire the spirit of self-sacrifice for the preservation of his species (the genus homo) ; and how lastly, through a series of painful experiences, he had come to the great and glorious conclusion that, if he must save himself he must save others. Where else, the lecturer asked, could this noble spirit of saving others be fostered than in the modern school ?

The lecturer then described the general construction of the human body and the different organs, and explained how easily its intricate and delicate mechanism was liable to be upset owing to a number of external and internal causes. Defining Health as a " state of the body and mind in which all parts and organs worked in harmonious co-operation, " and Disease as the disturbance in this equilibrium, he maintained that, whereas Health was the natural state, Disease was an abnormal condition brought about by our own mistakes. He instanced our own mistakes in life and habits causing certain ailments ; the mistakes of our ancestors—immediate or remote—causing some well-known hereditary and constitutional conditions ; and the mistakes of our neighbours tending to increase and perpetuate the common epidemic diseases ; and drew attention to the obvious fact that ultimately all of us undividually and collectively were responsible for all these mistakes, because " We " included not only ourselves as individuals, but as ancestors and neighbours also. He claimed that apart from certain hereditary and constitutional diseases —even which a fuller and increased knowledge of Eugenics would later enable us to control and gradually eliminate— the commonest diseases were all easily preventable, the knowledge necessary to do so having already enabled most of the Western nations to eradicate certain diseases which

School Hygiene and First Aid : A Lecture

BY

DR. LATHEEF SAYEED, M.B., (EDIN.)

UNDER the auspices of the "Teachers' Association," Chaderghat Branch, Dr. Latheef Sayeed delivered a very thoughtful and instructive lecture on "School Hygiene and First Aid" at the Assembly Hall of the Methodist Boys' High School on Saturday, the 7th August 1926 at 5 p. m. with Mr. Syed Ali Akbar in the Chair. Over 300 members of the Association attended the meeting.

Dr. Latheef Sayeed in opening the subject referred to the notorious scarcity of useful institutions in Hyderabad ; he instanced the Hyderabad Medical Association, which was resuscitated a number of times and was now in a state of suspended animation ; and expressed the hope that this useful institution—the Teachers' Association—was not going to be a "one-man-show," and that its aims and objects would be duly realized.

"School Hygiene and First Aid" being a big subject, and a practical lecture accompanied by demonstrations an impossibility at an evening lecture, the lecturer said he could only indicate the great importance of the subject, and explain briefly the urgent need for its study.

Tracing the growth of *Man* from the primitive times, and indicating his progress through village life, he explained how his wants and desires had gradually increased ; how, with the evolution of modern civilization—with its great cities and huge industries, its astounding

indicated, all this was in no small measure due to the personality of the President. But at the same time, one must not omit to congratulate most heartily Mr. Syed Ali Akbar and those who assisted him on the splendid success which attended the Conference.

THE CRITIC REBUKED

A MAGNIFICENT defence of free education by Mr. J. St. Lo Strachey appears in the columns of *The Spectator*. In " To-day and To-morrow," Mr. J. H. Curle, writing of the dangers confronting the white races, says : " Indiscriminate, free education must work havoc with human affairs. It is everywhere bringing about discontent...... The conclusion must be that free education is a two-edged sword. For the right people it is the highest boon we can give ; for the wrong, who are in a majority, a waste of time and money." Mr. Strachey declares that he cannot conceive anything more fallacious, mischievous, or dangerous than this view. He proves his points with dramatic force. Let us be content that education brings about discontent. "Without discontent there can be no improvement in the human race, and therefore it has been justly described as ' divine.' " The best educated nation stands best the shock of revolution and he quotes the case of Germany. " Education is an anodyne, not a provocative stimulant. If you could get the truth out of the revolutionary agitator, he would tell you that the people he likes to work upon are a purely illiterate crowd. Men whose reasons have been trained are always apt to differ from you . . . . Instead of less education, we want more." We hear a great deal in these days about disruptive forces undermining our social sytem. Our worst dangers, in fact, are ignorance and slumdom. Destroy these and the wildest revolutionary is deprived at once of his weapons and his army.

(*The Schoolmaster*, *London*).

inspection of schools. A resolution was also moved asking for the representation of teachers having actual teaching experience in schools on the Board of Examiners for the H.S.L.C. and Osmania Matric Examinations. All these resolutions were passed unanimously. There were three more resolutions suggesting improvement in the existing conditions of the H. S. L. C., Middle School and Osmania Matric courses respectively. The first two were easily passed, but there was a good deal of discussion on the last, since it asked for an extension of the Osmania Matric course to three years, instead of two years, as at present; but this was defeated by a very narrow majority; and since this was the only resolution that was lost at the Conference, a word about the same may not be out of place here, just to show the circumstances under which it was lost. The mover of the resolution and his supporters clearly pointed out, with the help of figures and facts, the various disadvantages under which the Osmania Matric candidates were labouring, in spite of the fact that instruction was being imparted through the medium of Urdu; while the opposers of the resolution mainly stressed the point that an additional year would be a serious inconvenience to the students. When the resolution was put to the vote, the Divisional Inspector of Schools, the Principals of all the important high schools, and a great number of teachers with actual experience of the Osmania Matric classes voted for it, while among the opposers were a great number of primary and middle school teachers and others who had had hardly any opportunity of studying the situation at first hand.

Those who had the good fortune to attend the Conference must have been, like the present writer, impressed by the excellent arrangements made by the organizers, the orderly way in which item after item of the programme was gone through, the healthy spirit of discussion that was displayed throughout and the great interest which those present evinced in the proceedings. As has already been

They had taken from Europe and America only that which was needed by them with the result that instead of themselves becoming Westernised, they had Japanised the most useful products of western civilisation. He concluded by saying that for him the Land of the Rising Sun was the Land of the Rising Hope of Asia.

The following is the list of the other lectures that were delivered at the Conference :' Dalton Plan ' by Mr. Mohd. Osman, B.A., ' Teaching of Geography' by Mr. M. H. Zubairi, B.A., B.T., both of the Normal School ; ' Child Welfare ' by Mr. Syed Mohd. Hussain Jaffery, B.A., (Oxon.), Deputy Director of Public Instruction ; ' School Excursions ' by Mr. Ahmed Husain Khan, B.A., Principal, Darul Uloom High School ; 'Co-operation between Parents and Teachers' by Mr. Aga Mohd. Ahsan, B.A., B.T.; ' Moral Instruction ' by Moulvi Hussamuddin Saheb ; ' Physical Education ' by Mr. S. M. Hadi, B.A., (Cantab.), Director of Physical Education ; ' Indian Games ' by Moulvi Abdus Salam Saheb, Nazir, Gulburga ; ' Psychology in the Class-room ' by Mr. Wahajuddin, B.A., B.T., of the Aurangabad College and finally the ' Significance of the Co-operative Movement ' by Mr. Syed Md. Mehdi. Most of the lectures contained a number of useful and practical suggestions. Let us hope that these suggestions will be taken up and put into practice in as many schools as possible before the Conference meets again next year.

As regards the resolutions passed in the Conference, the first was a resolution expressing sorrow at the deaths of Nawab Imadul Mulk Bahadur and Moulvi Mohd. Murtuza Saheb whose activities, of the former in an official and of the latter in a non-official capacity, synchronized with two important phases in the educational history of Hyderabad. Then there were two resolutions touching on the physical well-being of the pupils, one for providing suitable buildings and playgrounds for schools, and the other urging the need for the introduction of medical

With regard to the co-operative credit movement, he said that the foundations of this movement could and ought to be laid in our schools. It was his strong belief that just as the suppression of communal strife and the union of the different communities would be the solution of all our political problems, so would the establishment of co-operation as the leading feature of our economic life mean the salvation of the agricultural ryot.

The Scout Rally held in the evening of the first day, the first of its kind in Hyderabad, was a great success. One wondered where so many scouts and scouters had sprung up from with their various patrol cries, their trim uniforms, their splendid discipline and their wonderful displays, while a year ago a scout was a rare sight in Hyderabad. Mr. S. M. Hadi, B.A., (Cantab.), the Director of Boy Scouts, and his assistants certainly deserve great credit for their splendid achievement.

The next thing deserving particular mention is the lantern lecture on Japan by Nawab Masood Jung Bahadur. It was indeed a rare privilege to listen to the impassioned outflow of the Nawab's eloquence in that beautiful auditorium on that night. With his stalwart figure dressed all in black, with a face beaming with a real appreciation and admiration of the Japanese life and ideals, delivering his speech with a rhythm and a dignity all his own, he captivated the audience and carried them away to the land where Buddha, though dead, was still alive. The Nawab spoke for an hour and a half, illustrating his speech at the end by a number of slides. He impressed upon the audience the qualities which had made the Japanese people what they are to-day—their impassioned loyalty to the Emperor, their spirit of self-sacrifice, their appreciation of the beauties of Nature, their scrupulous cleanliness and their courage, courtesy and industry. The secret of their success, he said, lay in the fact that they had not allowed themselves to come under the influence of any one country.

Association, and concluded by reminding all those present of the debt of gratitude which they owed to His Exalted Highness the Nizam whose enlightened policy had resulted in an intellectual awakening in the Dominions as shown in the establishment of the Osmania University and the enormous increase in the number of schools and pupils.

The General Secretary's Annual Report disclosed the vast amount of useful work done by the Association during the first year of its existence and its sound financial position. After listening to this report and watching the proceedings of the Conference, one felt doubly sure that this organization had come to stay and was full of promise for the future.

The Presidential Address of Nawab Hydar Nawaz Jung Bahadur constitutes a valuable contribution to educational literature, being full of noble sentiments, high ideals and practical suggestions. To my mind, four points in his address deserve particular attention, namely, his remarks on the position of the teacher, on the canker of communalism, on the physical education of boys, and on the co-operative credit movement. The Nawab exhorted the teachers to realize the dignity of their profession and not to go seeking for favours from officer to officer and begging from door to door. He wanted the teacher to stand on a pedestal of his own where others should come to him. He placed before the teacher the ideal of self-sacrifice. He then pointed out with great insight that the teacher could do much to remove the communal discord in India. He condemned, and quite rightly, institutions and activities intended exclusively for particular communities. He laid great emphasis on the physical well-being of the people and showed how necessary it was that the teacher should pay special attention to the physique of his pupils in the school. He believed in the Boy Scout movement as an effective means to this end and wished it every success.

quality, variety and classification of the exhibits, one found it hard to believe that this was the first exhibition organized by the Hyderabad Teachers' Association. Verily this Conference had brought out a great deal of hidden enthusiasm and talent of the Hyderabad teachers; and when it is seen that the President, in spite of his very onerous duties as the Finance Minister, was present throughout the Conference and conducted its proceedings with unusual interest and zeal, and when one considers also that Nawab Akbar Yar Jung Bahadur, Home Secretary, Nawab Masood Jung Bahadur, Director of Public Instruction and nearly all the important officers of the Education Department were among the distinguished visitors, some of them like the Director and Deputy Director of Public Instruction taking an active part in the Conference, one can assert without hesitation that the future of education in the Hyderabad State is assured and that the Hyderabad youth are, indeed, very fortunate in those that guide their educational activities. During the two days that the Conference lasted one felt that one moved in an atmosphere surcharged with a spirit of educational activity; and the whole thing was indeed a very refreshing and stimulating experience for the teachers.

In his eloquent welcome address Mr. Marmaduke Pickthall, the Chairman of the Reception Committee, paid a warm tribute to the services which Nawab Hydar Nawaz Jung Bahadur had rendered to the cause of education. The Nawab, he said, had always subordinated financial considerations to the needs of education. Mr. Pickthall referred also to the splendid work done by the late Nawab Imadul Mulk Bahadur as the Director of Public Instruction. Speaking of Nawab Masood Jung Bahadur, he remarked, that the Nawab acted not only as the administrative head of the Educational Department but as the inspirer of it. He referred in fitting terms to the indefatigable zeal of Mr. Syed Ali Akbar, B.A., (Cantab.), the President of the

Impressions of the First Annual Conference of The Hyderabad Teachers' Association

BY

G. S. P.

THE First Annual Conference of the Hyderabad Teachers' Association was held at the City College on the 24th and 25th June, 1926, under the distinguished presidency of Nawab Hydar Nawaz Jung Bahadur, Sadr-ul-Moham of Finance. An educational exhibition was also organized on the occasion, and a number of prizes and certificates were awarded for the best exhibits. At the close of the second sitting, a Scout Rally was held, after which Nawab Masood Jung Bahadur, Director of Public Instruction, delivered a lantern lecture on Japan. The conference sat in four sessions during which those present listened to ten lectures of immense educational value and discussed six resolutions of great importance bearing on the existing educational needs in the Dominions. Besides these, there were the address of the Chairman of the Reception Committee, the Annual Report of the Association by the General Secretary, the opening and the closing addresses of the President and a few miscellaneous items.

The arrangements for the Conference had been made with great care and thoroughness. The college premises were tastefully decorated with a variety of festoons and buntings. The exhibition was held in two spacious halls on the ground floor. When one observed the quantity,

to a pos tion in which they themselves exacted service. I can remember hearing an old gentleman of comparatively small importance say, when the name of a famous peer who had been several times Prime Minister was mentioned: "He was my fag at Eton, and we used to call him Dirty Dick." Whenever I hear an Englishman in India bawling: "Bo-o-oy !" I remember the same cry at Harrow which always made the fags on duty run as if their lives depended on it.

This is a side of English Public School education, which has never, so far as I know, been faithfully reflected in the schools of any other country, however much enamoured of English methods of education. It can hardly be reflected in a land of day schools, where the boarders form a small minority of the students in any school. Yet it has its value. No boy was despised for being a fag to another, because everybody knew that that other had himself been a fag, and that every boy who came to the school must be a fag for some time. And no man in England who has been to a Public School—which means no member of what is called "the ruling class"—can be completely without sympathy for servants, can despise manual labour, or feel helpless if a servant happens not to be at hand to do things for him.

Schools are chosen by the class of people who can best afford to pick and choose in the matter of their children's education.

And how is that social training given? Not by pampering the student, not by supervision of the masters, but by leaving him to rough it at the mercy of the other boys. The school is a self-governing institution quite apart from the masters, who have to respect its old traditions and observe them. Every new boy is furnished on arrival with a set of rules by which his conduct must be governed-rules framed not by masters but by boys, and not by boys of the present generation but by boys of long forgotten generations of the past. Every new boy is—and must submit, under pain of corporal punishment, to be—not only the subject but the actual servant of the Sixth Form boys, and must show a certain measure of respect to everyone above him in the school. In some schools the system of personal service still obtains, and a small boy is allowed as a fag to every Sixth Form boy to fetch and carry, run his errands, cook his breakfast, clean his boots if so commanded. In my old school we had a different system by which two boys of the Lower School in every House must always be on duty to answer the calls of their superiors. The fag might be a duke's son and the boy at whose command he ran might be the son of a successful tradesman. The social values of the outer world were altogether superseded by school social values; and the school traditions were more honoured than the laws of Church and State. A certain number of lower boys were told off every evening in the summer term to fag for members, or would-be members, of the school cricket team who practised batting at the nets; and woe betide the luckless fag who missed a catch or failed to throw up promptly to the bowler.

Thus, through service so severe as to crush out all conceit and all idea of self-importance boys struggled to a position where no service was exacted from them, and on

"Public School" Education

BY

MARMADUKE PICKTHALL,

Principal, Chaderghat High School.

I HAVE heard the English "Public School" mentioned as a desirable model for the Indian High School. They seem to me to belong to two different worlds of ideas. The English Public Schools (which are anything but public in the common sense of the word) were designed for the training-ground of a close aristocracy; they were never meant to cater for the struggle for existence nor to meet the strain of competition; they were regarded as successful if they turned out fairly cultivated, genial and large-minded men to fill secure positions which were theirs by birth. But as a well-bred aristocracy has characteristics which every man of wealth would like his children to possess, every parvenue was eager to send his son to a Public School so that the old and famous Public Schools have lost a good deal of their exclusive character, while new Public Schools on the same lines, but cheaper, have sprung up all over England to meet the growing demand. The great Public Schools are still a preserve for the children of quite rich people, for the cost of education there is such as would appal the wealthiest of Indian parents, accustomed to the old Eastern notion that education should be free for rich and poor alike. And the actual instruction in those schools is much less scientific and efficient than that given in the Government secondary schools. It is therefore less for earning than for social training that the Public

epoch-making administration, the Residency School deserves an honoured place as having been largely an outcome of private enterprise." Mr. Menon concluded his speech by expressing gratification at the present flourishing condition of the school and paying a tribute to the work done by Mr. Chandawarkar and Mr. Ali Akbar.

Mr. Ali Akbar proposed a vote of thanks to the chairman, and the proceedings came to an end after Mr. S. M. Hadi, Director of Boy Scouts, had invested the scouts of the school with badges.

ADVERTISING EDUCATION

"THE London Education Committee has just awarded three prizes (£20, £10, and £5) to students in its own art schools for picture poster designs to be used during the session 1926-27 to advertise the facilities provided by the Council for continued education. We think the object and the method are entirely praiseworthy. We doubt whether there are now left many austere-minded persons who object to the advertisement of educational activities. The evidence of our own eyes tells us, however, that there are still too many devotees of the dull and heavy educational "ad." Let no one imagine that we favour the flamboyant and garish forms of broadside publicity. The London County Council itself has set an example of what is possible on right lines. During each of the last two years Mr. Herrick's "Achievement" posters have been among the most notable things on the London hoardings. They were dignified,appealing, and of outstanding artistic merit. The L. C. C. has developed also an advertising technique, expressing itself in literary pamphlets, attractive leaflets, aud well-displayed posters, comparable with the best anywhere else in the world. Even our friendly rivals, the educational publicity experts of New York City, have praised ungrudgingly what they have seen in London. This is most satisfactory. Every Local Education Authority consider the question of publicity for its educational facilities. It seems right and appropriate that the form of all advertisements should be worthy of the subject."

The Schoolmaster, London.

Nizam's Government during the Directorship of Nawab Imadul Mulk Bahadur. Mr. Chandavarkar then showed how under Mr. Syed Ali Akbar the school had made progress in various directions. Its two great needs were increasing the accommodation and raising the school to the status of a High school. Its present strength was 400. After distributing the prizes, Mr. Menon made a very interesting speech, in which he referred to the intimate connection which had always existed between the school and the Chairman of the Residency Bazars Committee. "The institution," he said, "is a good index to the beneficent results of co-operation not merely between the public and the Government, but also between the State and the Residency." Proceeding, he remarked that the school "was *the* pioneer of education in the Residency Bazars, and one of the pioneers of education in the whole State. Not that there was no education in the State before the middle of the 19th century. History shows that under the Bahmani Kings education had flourished in the Deccan; that students were lodged, fed and clothed at the expense of the State ; and that learned moulvies and pundits were engaged from Hindustan, Persia, Bokhara and other celebrated Mussalman centres of learning. Even to-day Mohamed Gavan's splendid 'Madrassa' at Bidar is a standing monument of this 'Golden Age of Education in the Deccan.' But evil days followed. The Maharattas desolated and the Pindaris plundered the State from one end to the other, the sword became mightier than the pen and kings

> "Pinned their faith upon
> The holy text of pike and gun."

Education, especially organized education, was neglected. It was not until Sir Salar Jung appeared on the scene that modern education can be said to have begun in Hyderabad ; and among the institutions that arose during his

School for instituting a suitable memorial of the principalship of Mr. Shawcross. It is conducted by the Hyderabad Athletic Association and is open to the high sections of all the High Schools in His Exalted Highness the Nizam's Dominions. Seven teams competed this year, the result being as follows :—

At the close of the final match, Mr. S. M. Hadi, Honorary Secretary of the Athletic Association, made a brief speech in which he gave a short history of the tournament and emphasized the need for cultivating the spirit of sportsmanship in the schools. Nawab Akbar Yar Jung Bahadur then gave away the shield to the winners.

On the 17th August, 1926, the Diamond Jubilee of His Exalted Highness the Nizam's Government Residency Middle School was celebrated under the Presidentship of Mr. K. P. S. Menon, M.A., I.C.S., Under-Secretary to the Honourable the British Resident. Mr. G. A. Chandavarkar, B.A., read a long report tracing the history of the institution and explaining its present condition and needs. The school was opened in 1866 and was the result of co-operation between the Residency officials and the general publ c. Its early founders were Raja Kandaswamy Moodliar and Moulvi Amenuddin Khan, while Sir Salar Jung the Great gave a generous donation for the construction of the school building. Till 1894 the school was managed by a committee presided over by the Superintendent of the Residency Bazars. In that year it was handed over to the Education Department of His Exalted Highness the

lecture on Japan, which proved the most popular item in the Conference programme; the kindness of Mr. S. M. Azam, Principal of the City Collegiate School, in allowing us the use of his magnificent school premises and giving us so hospitable a welcome; the spirit of friendly collaboration and goodwill among the members; and last, but not least, the indefatigable and most tactful work of Mr. Syed Ali Akbar, President of the Association, who may fairly be called the founder of the Conference.

Many interesting discussions took place, and some important resolutions were passed. But it is not on account of the work actually done on this occasion that we congratulate the President and all the membes so warmly on the success of the first Conference. It is on account of the work which the Conference has still to do, and which it has shown itself capable of doing well and thoroughly. We are convinced that a great and highly useful future is before our Annual Conference.

Since the beginning of the current academical year, the Hyderabad Normal School has been raised to the status of a college under the name of the Osmania Training College. Under the new scheme, provision has been made for training teachers who have passed the Intermediate Examination, while at the same time, by cutting down subjects of general education, the period of training for Middle passed teachers and matriculates has been reduced to one year. We feel sure that the increase in the number of trained teachers, which these arrangements will bring about, will add much to the efficiency of our schools.

The Shawcross Football Tournament was concluded successfully on the 12th August, 1926. The tournament owes its origin to the subscriptions collected from the staff and the present and past students of the Chaderghat High

Notes and News

WE regret our inability to publish, as promised, a short sketch of the late Nawab Imadul Mulk Bahadur's life, but we hope to be able to do so in our next issue.

A census of boys between 6 and 12 years of age residing within the Hyderabad Municipal limits was taken during the last summer vacation. The work was done by over 300 teachers, belonging to the various schools at the Head-quarters. The census statements show that the total number of boys between 6 and 12 years of age living within the said area is 20,005, of whom 8,584, *i.e.*, 42·9 per cent. are actually under instruction, 7,401 in public and 1,183 in private schools. Of the 11,421 boys who are not receiving any education, 5,378 are Mohammadens, 322 Brahmins, 3,602 non-Brahmins, 2,008 Pariahs, 107 Christians and 4 Parsis.

The first Annual Conference of the Hyderabad Teachers' Association has been held, and everyone who was present at its sessions must agree that it was an unqualified success. The success is due, like all success, to a number of causes in conjunction. Chief among them one may mention the sincere and earnest interest in the whole proceedings of the Conference taken by the distinguished President, Nawab Hydar Nawaz Jung Bahadur, who thus has added to the large debt of gratitude which the teaching community of Hyderabad already owed him ; the active help and presence of the Director of Public Instruction, Nawab Masood Jung Bahadur, and his memorable evening

THE HYDERABAD TEACHER

CONTENTS

ملک سرکار عالی کا

تاریخی و جیاگرفیکل اٹلس اُردو

اس اٹلس میں ممالک محروسۂ سرکار عالی اور اسکے جملہ اضلاع و نیز پائیگاہوں اور سمستانات و ملک برار کے نقشہ جات نہایت صحت کے ساتھ طبع ہوئے ہیں اور ہر نقشہ کے محاذی پورے صفحہ پر اسکے متعلقہ جغرافی معلومات بالتفصیل درج کئے گئے ہیں ناظرین اٹلس ہذا کو آئندہ ہر ایک حصۂ ملک کے ضروری جغرافی حالات معلوم کرنے کے لئے کسی مزید جغرافیہ کے ملاحظہ کی ضرورت داعی نہ ہوگی یہ پہلا موقع ہے کہ اس اہتمام کے ساتھ ہمارے ملک کا اٹلس طبع ہوکر پیش ناظرین ہورہا ہے۔

توقع ہے کہ ملک کے قدردان اصحاب اور مدارس کے طلبا، و مدرسین' اس نادر تحفہ کے طلب کرنے میں عجلت سے کام لیں گے تاکہ موجودہ نسخے ختم ہونے پر انہیں طبع ثانی کا انتظار نہ کرنا پڑے۔ اس اٹلس کی قیمت صرف عہ/ دو روپے آٹھ آنہ سکہ عثمانیہ

المشتہر

سید عبدالقادر تاجر کتب و پبلشر چادرگھاٹ حیدرآباد دکن

Regtd. Asafia No. 47.

Vol. I.] Aban 1335 Fasli [No. 2.

Under the Patronage of
Nawab Masood Jung Bahadur,
Director of Public Instruction

The Hyderabad Teacher

Quarterly Magazine of The Teachers' Association,

Hyderabad-Deccan

HYDERABAD-DECCAN
GOVERNMENT CENTRAL PRESS
1926

رجسٹری شدہ ٹپہ سرکار عالی نمبر ۴۸

زیر سرپرستی عالیجناب نواب مسعود جنگ بہادر

انجمن اساتذہ حیدرآباد دکن کا سہ ماہی رسالہ

سید ندیم الحسن تاثیر رضوی بی اے (عثمانیہ)

اعظم اسٹیم پریس چارمینار حیدرآباد میں طبع ہو کر دفتر انجمن اساتذہ واقع صدر مہتممی تعلیمات سے شائع ہوا

غایات

(۱) طبقۂ اساتذہ کے احساس معلمی کو بیدار کرنا۔

(۲) طبقۂ اساتذہ کے مخصوص انفرادی تجربات معلمی کو شایع کرنا۔

(۳) فن معلمی پر نفسیاتی حیثیت سے نقد و نظر۔

(۴) انجمن اساتذہ کے مفید مضامین کی اشاعت۔

(۵) انجمن اساتذہ کے مقاصد و اغراض کو ملک کے طول و عرض میں مکمل طور پر پھیلانا۔

اصول

(۱) رسالہ کا نام "حیدرآباد ٹیچر" ہوگا اور سہ ماہی پر صدر دفتر انجمن اساتذہ بلدہ سے شائع ہوگا

(ب) رسالہ کی سالانہ قیمت بہ تفصیل ذیل ہوگی۔

(۱) اندرون و بیرون ممالک محروسہ سرکار عالی ۲ روپیہ معہ محصول ڈاک سالانہ سکہ رائج

" " " " " ۱۲ ؍ علاوہ محصول ڈاک فی پرچہ " "

(ج) رسالہ نصف انگریزی نصف اردو ہوگا جس میں حسب صوابدید تغیر بھی ہو سکیگا۔

(د) صرف وہی مضامین درج ہو سکیں گے جو تعلیم و تعلم سے متعلق ہوں اور جن میں ملک کے مفاد تعلیمی کے لحاظ سے ندرت اور جدت ہو۔

(و) اشتہارات کا نرخ حسب صفحہ (۴۴) ٹائیٹل انگریزی اشاعت سابق رہے گا۔

فہرست مضامین

جلد (۱)	ماہ بہمن ۱۳۳۶ف مطابق ماہ دسمبر ۱۹۲۶ع	نمبر (۳)

ملک سرکارِ عالی

کا

تاریخی و جیاگرفیکل اٹلس اردو

اس اٹلس میں ممالک سرکارِ عالی اور اس کے جملہ اضلاع و نیز پائیگاہوں اور سمستانات و ملک برار کے نقشہ جات نہایت صحت کے ساتھ طبع ہوئے ہیں اور ہر نقشہ کے محاذی پورے صفحہ پر اس کے متعلقہ جغرافی معلومات بالتفصیل درج کئے گئے ہیں ناظرین اٹلس ہذا کو آئندہ ہر ایک حصہ ملک کے ضروری جغرافی حالات معلوم کرنے کے لئے کسی مزید جغرافیہ کے ملاحظہ کی ضرورت داعی نہ ہوگی یہ پہلا موقع ہے کہ اس اہتمام کے ساتھ ہمارے ملک کا اٹلس طبع ہوکر پیش ناظرین ہو رہا ہے۔

توقع ہے کہ ملک کے قدردان اصحاب اور مدارس کے طلباء و مدرسین اس نادر تحفہ کے طلب کرنے میں عجلت سے کام لیں گے تاکہ موجودہ نسخے ختم ہونے پر انہیں طبع ثانی کا انتظار نہ کرنا پڑے۔ اس اٹلس کی قیمت صرف (عہ/) دو روپیہ آٹھ آنہ سکہ عثمانیہ ہے۔

المشتہر

سید عبد القادر تاجر کتب و پبلشر چار مینار حیدرآباد دکن

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مخاطبات

ہم اپنے معزز معاصرین کے ممنون ہیں جنہوں نے رسالہ کی نسبت اپنی قیمتی اور مخلص راؤں کا نیک نیتی سے اظہار فرمایا ہر چند کہ ہمارے ادب میں "تنقید" اپنے اندر افراط و تفریط کی گوناگونی اور بوقلمونی عجیب و غریب وسعت کے ساتھ پنہاں کئے ہوئے ہے بر ینہمہ جو کچھ ہے مستحق تشکر و امتناں ہے

رسالہ ہذا کے ۱۶۰ نسخے منجانب گورنمنٹ افادۂ مدارس کے لئے منظور فرمائے گئے ہیں ہم اس قدر دانی اور حوصلہ افزائی کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

اس نمبر میں "طلبا کی کامیابی" اور "ارتقائے عمل تعلیم" کی دوسری قسطیں شائع ہو رہی ہیں جو اگرچہ اقساط ہیں مگر اپنی نوعیت میں مستقل ہیں "نمونۂ نیک" اور "اس کا ڈھنگ" پر مضامین اور جناب سینؔ صاحب کی "تعلیم" پر نظم نہایت مفید اور دلچسپ ہیں اور ہم کو مسرت ہے کہ مضمون نگار صاحبان نے رسالہ کے اصولی معیار کو قائم اور بلند رکھنے کی

پوری سعی فرمائی ہے ورنہ ظاہر ہے کہ رطب ویابس مضامین سے صفحات کو پُر کر دینا درحقیقت رسالہ کو اپنی حیثیت سے گرا دینا ہے۔

متعدد دیگر مفید مضامین بھی ہمارے پاس پہونچے ہیں جو بتدریج انشاءاللہ درج رسالہ ہوتے رہیں گے

طاعون کی وجہ سے سررشتۂ تعلیمات کو اپنی خاص اور اہم نوعیت کی وجہ سے جو مشکلات پیش آتی ہیں شاید کسی اور سررشتہ کو پیش نہیں آتیں۔ ہر سال یہ مرض منحوس ملک کی تعلیمی ترقی میں سخت رکاوٹیں پیدا کرتا ہے چنانچہ اس کی وجہ سے اکثر مدارس میں سالانہ تعلیم پوری نہیں ہوتی اور نصاب تکمیل کو نہیں پہونچتا جس کا اثر طلبا پر دوسرے سال بھی اس طرح پڑتا ہے کہ اگر بسبب خامی نصاب ان کو ترقی نہ دی جائے تو ان کا وقت ضایع ہوتا ہے اور اگر دے دی جائے تو جماعت کی اہلیت نہیں رکھتے' زیادہ تر افسوسناک پہلو یہ ہے کہ جب مدارس کی حالت کسی قدر سنبھلنے لگتی ہے اور تعلیمی و انتظامی امور اپنی معمولی روش پر آجاتے ہیں یکایک پھر طاعون نمودار ہو جاتا ہے چنانچہ بلدہ میں ۱۳۳۴ف و ۱۳۳۵ف میں ایسا ہی ہوا نیز اضلاع گلبرگہ بیدر اور عثمان آباد کے اکثر اور اضلاع ناندیڑ اور نلگنڈہ کے بعض مدارس بسبب طاعون کچھ عرصہ سے مسدود ہیں اور بلدہ بھی محفوظ تصور نہیں کیا جا سکتا۔ ایک زمانہ تھا کہ سرزمین دکن اس مرض منحوس سے پاک تھی لیکن اب تو یہ داخل معمولات ہو گیا ہے۔ چونکہ آج کل محض رسمی انسدادات سے کوئی نمایاں مدافعت اور کمی اس مرض کی نظر نہیں آتی لہذا ہماری رائے میں اس امر کی سخت ضرورت ہے کہ ماہرین فن طب اور مخصوصین طاعون کی ایک کمیٹی مقرر کر کے انسداد طاعون کی قطعی او حتمی تدابیر اختیار کی جائیں اور اس مرض کے فوری باقاعدہ اور حقیقی ازالہ کے لئے جس قدر بھی رقم کی ضرورت ہو اس کے عطا کرنے میں گورنمنٹ دریغ نہ فرمائے

یہ امر باعث مسرت ہے کہ پختہ عمروں کی تعلیم کی ضرورت کو حیدرآباد کی پبلک بتدریج محسوس کرنے لگی ہے چنانچہ حال ہی میں مدرسۂ انوار العلوم نام پلی (امدادی) مدرسہ غربا بازار گھانسی (امدادی) میں نیز مدرسۂ تحتانیہ کلثوم پورہ میں منجانب انجمن بین الادب شبینہ تعلیم گاہوں کا قیام عمل میں آیا ہے اور عنقریب سکندرآباد میں بھی ایک شبینہ جماعت کا افتتاح ہونے والا ہے پس ہم کو قوی امید ہے کہ چند ہی سال میں حیدرآباد کے ہر محلہ میں پختہ عمروں کی تعلیم کا انتظام ہو جائے گا اور بتدریج اضلاع میں بھی اس کا عام رواج ہو جائے گا۔ ہماری رائے میں قیدیوں کے لئے بمقام سنٹرل جیل ایک مدرسہ قائم کرنے کی شدید ضرورت ہے تاکہ ایام قید میں ان کے اخلاق کی درستی ہو اور رہائی کے بعد وہ سوسائٹی کے مفید فرد بن سکیں۔ محبس کے علاوہ کارخانہ جات کے کارکنوں نیز پولیس اور فوج میں پختہ عمروں کی تعلیم نہایت مفید و ضروری اور آسان ہے شبینہ جماعتوں کے ساتھ دارالمطالعہ اور کتب خانوں کا افتتاح بھی ضروری ہے تاکہ نصاب مقررہ کی تکمیل کے بعد بھی بالغ العمر اشخاص کو مزید معلومات اور مطالعہ کا موقع مل سکے۔

انجمن اساتذہ بلدہ کی مرکزی انتظامی کمیٹی کے لئے سال حال وہی اراکین اور عہدہ دار منتخب ہوئے جنہوں نے سال گزشتہ اسی حیثیت سے کام کیا تھا کمیٹی مذکور نے یہ تصفیہ کیا ہے کہ امسال بھی سالانہ کانفرنس انجمن اساتذہ کا دوسرا اجلاس تعطیلات عید الاضحی میں منعقد کیا جائے۔

مدرسۂ فوقانیہ نامپلی کی دوسری سالگرہ کا جلسہ ۲۸ مہر ۱۳۳۵ف بروز جمعہ صبح کو آٹھ بجے بصدارت نواب اکبر یار جنگ بہادر معتمد سکریٹری سرکار عالی منعقد ہوا جناب صدر کی افتتاحی تقریر کے بعد مدرسۂ مذکور کے صدر مدرس صاحب نے سالانہ رپورٹ پڑھی دو حضرات نے علمی نظمیں سنا کر سامعین کو محظوظ فرمایا اس کے بعد چند منتخب اسپورٹس (ورزشی کھیل) ہوئے جو

بہت دلچسپ تھے، طلبار کو انعامات تقسیم کرنے کے بعد جناب صدر محترم نے ایک برجستہ اور مفید تقریر فرمائی جو قیمتی خیالات سے لبریز تھی ازاں بعد جناب مولوی سید علی اکبر صاحب صدر مہتمم تعلیمات بلدہ نے ایک مختصر تقریر میں مدرسہ کی ضروریات کو بیان فرماتے ہوئے جناب صدر مدرس صاحب کی ترقی آفرین بیاب وشی اور ولولہ انگیز اضطراب کو مدرسہ کے مستقبل کے لئے مفید بتلایا اور اسی پر کامیابی کے ساتھ جلسہ کا اختتام عمل میں آیا۔

مدرسہ وسطانیہ شاہ گنج کا سالانہ جلسہ بصدارت جناب مولوی سید علی اکبر صاحب صدر مہتمم صاحب تعلیمات بلدہ ۱۵ اسفندار ۱۳۲۵ف کو منعقد ہوا۔ مولوی عظمت اللہ خاں صاحب مددگار ناظم تعلیمات و دیگر اساتذہ مدارس بلدہ کے علاوہ طلبائے مدرسہ شاہ گنج کے والدین اور سرپرستوں کی ایک کافی تعداد بھی شریک جلسہ تھی۔ مولوی فخر الحسن صاحب بی۔ اے صدر مدرس مدرسہ وسطانیہ شاہ گنج نے اپنے مدرسہ کے حالات دلچسپ پیرایہ میں بیان کئے اور طلبار کے مدرسہ سے غیر حاضر ہونے اور ایک مدرسہ کو چھوڑ کر دوسرے مدرسہ میں شرکت کے نقصانات بتائے، مولوی حسام الدین صاحب مددگار مدرسہ فوقانیہ دارالعلوم نے اساتذہ اور والدین طلبا کے تعلقات پر ایک نہایت بامحل اور برجستہ تقریر فرمائی اور مثالوں سے اس امر کو واضح کیا کہ تا وقتیکہ والدین گھر پر بچہ کی نگرانی نہ کریں اور اس کی خواندگی و تربیت میں دلچسپی نہ لیں، مدرسہ کی تعلیم مکمل نہیں ہوسکتی، آخر میں جناب صدر جلسہ نے بلدہ کی موجودہ تعلیمی حالت پر روشنی ڈالی اور تعلیم کی اشاعت اور مدارس کی ترقی کے لئے پبلک کی امداد کی ضرورت خاص طور سے ظاہر فرمائی نیز ورزش جسمانی کے فوائد بیان کرتے ہوئے مدرسۂ مذکور میں کسی موزوں بازی گاہ کے نہ ہونے پر افسوس ظاہر کیا۔

حال میں مدارس وسطانیہ کھم میٹھ، متھواڑہ اور نرمل کو فوقانیہ اور مدارس تحتانیہ را جوڑہ

اور سر سلہ کو وسطانیہ کا گریڈ عطا کیا گیا ہے۔

گذشتہ آذر میں صدر مدرس صاحب مدرسہ تحتانیہ معظم شاہی بلدہ نے مع اپنے مددگاروں کے اپنے طلبا کو قلعہ گولکنڈہ اور اس کے حوالی کی تعلیمی سیر کرانے کا موقعہ بہم پہونچایا۔ سیر کا مقصد طلبا میں مشاہدہ کی قوت پیدا کرانا اور ان کی معلومات کو وسعت دینا تھا فی الحقیقت اس قسم کی تفریح دراصل ایک عمدہ عملی تعلیم ہے جو بچوں کے قوائے دماغی کے لئے بیحد مفید ہے صدر مدرس صاحب موصوف کی رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ طلبا کی یہ تفریح تاریخی اثریات اور سوانح کے مختلف مناظر کے مشاہدہ پر کامیابی کے ساتھ ختم ہوئی ہم کو امید ہے کہ رپورٹ میں جو امور اس مشاہدہ کی تفصیلات کے درج ہیں وہ ضرور بچوں کے ذہن نشین کرائے گئے ہوں گے اور بچوں کو ان کے وطنی اور قومی کھنڈرات دکھا کر ماضی کو حال سے ربط دینے کی کوشش کی گئی ہوگی۔

جس کفایت، احتیاط، حفظ، وقت اور نظم کے ساتھ یہ تفریح عمل میں لائی گئی وہ قابل تحسین اور مفید عملی تعلیم کا ایک بہترین نمونہ ہے۔

روداد مختصر شاہی انجمن اساتذہ بلدہ کی

بابتہ سہ ماہہ آخرین ۱۳۳۵ف

سنہ ۱۳۳۵ف کے سہ ماہہ آخرین میں جو شہریور، مہر، اور آبان پر حاوی تھا جلسہ ہائے ماہوار منعقد ہوئے جن میں صحت مدارس اتحاد عمل بین اساتذہ و اولیائے طلبا اور تعلیم فن ڈرائنگ پر اظہار خیالات کیا گیا

جن میں سے بحث اول پر ایک عمومی لکچر زیر صدارت جناب مولوی سید علی اکبر صاحب بی اے
صدر مہتمم تعلیمات بلدہ بمقام اسمبلی ہال مے تعڈ رست. بوائز اسکول ہوا جس کی مفصل روئداد
اشاعت گذشتہ میں درج ہوئی نیز اسی بحث پر ایک عام لکچر بمقام محبوب کالج سکندرآباد
عمل میں آیا جن میں شاخہائے متعلقہ کے اراکین نے حصہ لیا۔

بقیہ آخرالذکر ہر دو مباحث پر منفرداً ہر شاخ نے کارروائی کی از انجملہ اے وی ہال
اسکول بلارم چادر گھاٹ ہائی اسکول اور دارالعلوم ہائی اسکول نے ہر دو مباحث میں بہت
پرجوش حصہ لیا چادر گھاٹ ہائی اسکول میں مسٹر ڈولی پرنسپل سینٹ جارج گرامر اسکول نے اولیائے
طلبار کے لئے ایک رسالہ کے اجرار کی ضرورت جتلائی نیز مسٹر فادر راس نے بھی ایک مضمون
پڑھا جو ملخصاً اشاعت ہذا کے حصہ انگریزی میں درج ہیں دارالعلوم ہائی اسکول میں بحث اول پر
دلچسپ تقریریں ہوئیں اور طے پایا کہ ملحقہ شاخوں کے اراکین چند تجاویز نوتاً عمل میں لائیں
تعلیم میں ڈرائنگ کے متعلق وہ طرز عمل قابل تقلید تبلایا گیا جو شاخ تحتانیہ مدرسہ مذکور میں اعتباً
فن ڈرائنگ دیگر مضامین اختیار کیا گیا ہے۔ شاخ وسطانیہ دارالشفا میں تعلیم فن ڈرائنگ کے متعلق
یہ تجویز پیش کی گئی کہ ممالک محروسہ سرکار عالی میں بھی بمبئی کے جے جے اسکول آف آرٹس کی قسم کا ایک مدرسہ
کھولا جائے۔ شاخ وسطانیہ گولکنڈہ میں اس کمی پر افسوس کا اظہار کیا گیا جو والدین اور اساتذہ کے
مابین تعلقات کے اعتبار سے پائی جاتی ہیں شاخ وسطانیہ گوشہ محل میں مسٹر عبدالحکیم و مسٹر عظیم الدین و مسٹر تراب علی نے
اپنی تقریروں میں اس امر کو واضح کیا کہ تعلیم کا مقصد اُس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جبتک خود والدین
اپنے بچوں کی تعمیر سیرت میں حصہ لیں تعلیم ڈرائنگ پر مولوی غیاث الدین صاحب و مولوی غلام محبوب صاحب
کی دلچسپ تقریریں ہوئیں جن میں تبلایا گیا کہ ڈرائنگ کو کیونکر دلچسپ بنایا جا سکتا ہے شاخ اسلامیہ فوقانیہ
سکندرآباد میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ کم از کم دو مرتبہ ہر سال میں والدین طلبار اور اساتذہ کے درمیان
تبادلہ خیالات کا موقعہ پیدا کیا جائے۔ تقریریں ہر چند اردو و انگریزی و تلنگی میں ہوئیں مگر اردو تقریروں نے
جلسوں کی کامیابی میں خاص حصہ لیا۔ شاخ محبوب کالج سکندرآباد میں صحت مدارس کے بحث پر زیر صدارت

میں

بیحرام۔ جی نایئڈو ڈاکٹر ایم بھرا طان صاحب کا ایک عمومی اور مفید لکچر ہوا۔ شاخ وسطانیہ مستعد پورہ میں ہر دو مباحث پر نتیجہ خیز تقریریں ہوئیں مسٹر جمیل الدین نے رائے دی کہ اولیائے طلبا کو مدرسہ میں آنے اور اپنے بچوں کی حالت مشاہدہ کرنے کی ترغیب و موقعہ دیا جائے۔ فن ڈرائنگ پر مسٹر عبدالواحد ڈرائنگ ماسٹر مدرسہ مذکور نے تقریر کرتے ہوئے اس امر کو واضح کیا کہ کیونکر فن ڈرائنگ کی ترقی سے دوسرے فنون کی ترقی وابستہ ہیں۔ شاخ فوقانیہ نامپلی میں اولیا اساتذہ کے تعلقات پر مسٹر کے آر چاری صاحب صدر مدرس نے زور دیتے ہوئے فرمایا کہ والدین کو اپنی ذمہ داری پورے طور پر محسوس کرنے کی ضرورت ہے۔ شاخ وسطانیہ رزیڈنسی میں ہر دو مباحث پر دلچسپ تقریریں ہوئیں اور مبحث اول کو عملی صورت میں لانے کے لئے متعدد تجاویز مثلاً جلسہ تقسیم انعامات اور طلبا کی ترقی کی رپورٹیں وغیرہ پیش کی گئیں شاخ وسطانیہ شاہ علی بنڈہ میں فن ڈرائنگ کے متعلق بتلایا گیا کہ تجارت میں اس کو خاص دخل ہے شاخ وسطانیہ شاہ گنج میں فن ڈرائنگ کے ضمن میں بتلایا گیا کہ سلطنت عظمی مغلیہ کے زمانہ میں اس نے کافی ترقی کی تھی۔

شاخ وسطانیہ چنچلگوڑہ میں مبحث اول پر کافی سرگرم تقریریں ہوئیں اور چند تجاویز کو عملی صورت میں لانے کا تصفیہ کیا گیا تعلیم فن ڈرائنگ پر مسٹر نصیح الدین صدر مدرس تحتانیہ رین بازار نے ایک پر از معلومات تقریر پڑھی نیز مولوی نورالدین صاحب نے تعلیم ڈرائنگ ایک مبسوط تحریر کے ذریعہ سے سامعین پر فن ڈرائنگ کے نکات واضح کئے اور تختہ سیاہ کے ذریعہ سے اس کی توضیح کی جلسہ مبحث اول کے نتیجہ کے طور پر اکابر محلہ چنچلگوڑہ کی ایک انجمن "ارباب علم" کا قیام اثنائے تعطیلات کوارٹر میکلر نیچر میں عمل میں آیا جس کے مقاصد مختصراً یہ قرار پائے۔

(۱) منتخب اولیائے طلبا کی ایک کمیٹی کا قیام جو ماہانہ مدرسہ میں آکر طلبا کے متعلق اپنا اطمینان کرے گی۔

(۲) آوارہ اور غریب بچوں کی فوری شرکت مدرسہ کا انتظام۔

(۳) نادار بچوں کے لئے ایک پور فنڈ کا قیام۔

(۴) مدرسہ شبینہ کا قیام۔ .... (۵) محلہ میں ایک عام دارالمطالعہ اور کتب خانہ کا قیام۔

تعلیم

(از محمد محسن خان صاحب تخلص متین مدرس فارسی مدرسہ وسطانیہ شاہ گنج)

شمع ہدایت تعلیم ہی ہے — خضر طریقت تعلیم ہی ہے
کان شرافت تعلیم ہی ہے — دریائے حکمت تعلیم ہی ہے

تہذیب پائی اس سے جہاں نے
اخلاق سیکھے پیر و جواں نے

نام جہالت اس نے مٹایا — بھٹکے ہوؤں کو رہ پر لگایا
سوتے ہوؤں کو اس نے جگایا — مردہ دلوں کو زندہ بنایا

گر یہ نہ ہوتی بزم جہاں میں
اندھیر ہوتا کون و مکاں میں

جب کہ عرب میں تھی جاہلیت — دنیا میں ہر سو تھی بربریت
باقی کہاں تھا جوش حمیت — کب نظم عالم میں تھی سویت

دشت عرب کا پہلا معلم
صلی اللہ علیہ وسلم
جو سارے عالم کا ہے منظم:

اُس کا سبق تھا پہلا یہ ہم کو — تعلیم پاؤ گر چین میں ہو
اصلاح اپنی گر چاہتے ہو — تعلیم سیکھو! تعلیم سیکھو!

ہے اس میں مضمر راز ترقی
ہے یہ ہی چارہ ساز ترقی

جاپان کیا تھا ایک حصۂ چیں — اس کی ترقی سے حیرت آگیں
اُس کو ملی ہے وہ شان و تمکین — ہوتی ہے جسکی توصیف و تحسیں

اس کا سبب ہے صرف اسقدر ہی
تعلیم نے دی اس کو ترقی

یورپ ہے کیوں آج اوج فلک پر — کیوں اس کی قسمت ہے آج یاور
کیوں آج اُس کا رتبہ ہے برتر — اس کو ملا کیوں بخت سکندر

تعلیم نے دی اس کو فضیلت
تھا ورنہ وہ بھی غرق مذلت

اس سے یہ ہم کو نکتہ ملا ہے — تعلیم سے ہی اپنی بقا ہے
کہنہ مرض کی اس میں شفا ہے — بیمار قوموں کی یہ دوا ہے

بس ہے متینؔ اب اس کا سہارا
چھوڑو نہ دامن اس کا خدارا

طلبا کی کامیابی

از مولوی حسام الدین صاحب فاضل ادیب و مولوی فاضل

(پیوستہ)

انہماک | یکجہتی و دل جمعی بھی عجیب چیز ہے اِس کے بغیر ہمارا کوئی کام سود مند ہو ہی نہیں سکتا
ایک پریشان حال و پریشان خیال طالب علم جس کا دل ٹھکانے نہیں ہے اپنی کتاب کے

صفحے کے صفحے الٹ جاتا ہے مگر ایک لفظ بھی سمجھ نہیں سکتا کیونکہ دل قابو میں نہیں ہے اس لئے دماغ بھی بیکار سا ہو گیا ہے ایک ریاضی داں کسی حساب یا جیومٹری کے سوالات پراگندہ دلی سے حل کرتا جارہا ہے سو سو دفعہ عمل کرتا جاتا ہے مگر اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آتا اور معمولی معمولی غلطیوں نے ناک میں دم کر رکھا ہے اس لئے کہ دل مطمئن نہیں ہے، غرض اطمینان قلب بغیر کوئی کام اچھے اصول پر انجام نہیں پا سکتا اور دلی اطمینان کا حاصل ہونا اکثر و بیشتر خاص توجہ اور پورے انہاک بغیر ممکن نہیں پس اگر ہمیں مقصود ہے کہ ہم اپنی محنت سے خاطر خواہ فائدہ اٹھائیں تو ضرور ہے کہ کارگزاری کے وقت اپنی توجہ کو برقرار رکھیں اور ایک اچھے کام کی انجام دہی میں پورے انہاک سے کام لیں کیونکہ جہاں کام کرنے والے کی توجہ منتشر ہوئی کہ کارگزاری میں بھی فرق آگیا مثلاً انجن ڈرائیور اگر اپنی توجہ ریل گاڑی کی طرف کافی طور پر مبذول نہ کرے تو نہ معلوم کیا کیا نقصانات اُسے اور تمام مسافروں کو برداشت کرنے پڑیں، ایک شکاری کسی شکار کو اپنے دام میں اُسی وقت لا سکتا ہے کہ ہمہ تن متوجہ ہو کر تاک میں بیٹھا رہے، علم کو بھی اپنے قبضہ میں لانے کیلئے بیحد توجہ کی ضرورت ہے کوئی مضمون کوئی مسئلہ خاص انہاک بغیر ذہن نشین ہو ہی نہیں سکتا طلباء کی یہ حالت ہے کہ مدرسہ میں دست بکار دل بیار کے مصداق بنے بیٹھتے ہیں اِدھر سبق ہو رہا ہے اُدھر اپنے خانگی لاطائل معاملات دل و دماغ میں طے ہوتے جا رہے ہیں، یہاں استاد صاحب سر کھپا کھپا کر عمدہ اور مفید مضامین کی تفہیم فرما رہے ہیں اور طالب علم ہے کہ برخاست مدرسہ کے بعد کی تقسیم اوقات والی اسکیم دل ہی دل میں مرتب کر رہا ہے کوئی اپنے جلیس سے گفتگو میں مشغول ہے کوئی اپنے سے دور بیٹھے ہوئے طالب علم سے اشارۃً پوچھ رہا ہے کہ گھڑی میں کیا وقت ہے کوئی موجودہ درس چھوڑ کر گذشتہ غیر متعلقہ سبق یاد کرنے میں مصروف ہے تو کوئی آنے والے گھنٹہ کے لئے سبق یاد کر رہا ہے، استاد صاحب نے تنبیہ کی تو کسی قدر متوجہ ہو گئے ورنہ پھر وہی کج رفتاری ہے اور قابل ترک بیکاری۔ خیال ہوگا کہ اثنائے درس میں اگر کسی دوسرے سبق

کی طرف توجہ کی گئی تو کیا برائی ہے، بہر حال علم تو حاصل کرتے رہے۔ یہ صحیح ہے مگر ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے، بھوک کی وقت لذیذ آب سرد یا تشنگی کی وقت عمدہ غذائیں تسکین بخش نہیں ہو سکتیں۔ بعض طلباء ایسے بھی رہتے ہیں کہ بظاہر استاد صاحب کی طرف متوجہ ہیں مگر ان کے دل کسی اور طرف لگے رہتے ہیں اب علم آئے تو کس طرح کامیابی ہو تو کیونکر۔ عزیز طالب علمو تم حساب جانتے ہو تم سے میرا ایک بالکل معمولی سوال ہے، فرض کرو ایک حوض ہے اور اس میں پانی بھرنے کے لئے دس نل لگے ہوئے ہیں اور ایک خزانہ آب سے ان تمام نلوں کے ذریعہ اس حوض میں پانی جمع ہوتا ہے، اب بتاؤ کہ یہ حوض پانی سے بہت جلد کس صورت میں بھرے گا آیا حوض میں ایک نل سے پانی آنے میں یا دو چار یا دس کے دس نلوں کے ذریعہ پانی پہونچنے میں، ظاہر ہے کہ نل جتنی زیادہ تعداد میں کام میں لائے جائیں گے حوض اُسی قدر جلد پانی سے لبریز ہوگا پس سمجھ لو کہ تمہارا دماغ وہ خالی حوض ہے جسے علم کے صاف و شفاف پانی سے بھرنا منظور ہے، تمہارے حواس خمسۂ ظاہری یعنے باصرہ۔ سامعہ۔ ذائقہ۔ شامہ لامسہ اور حواس خمسۂ باطنی یعنے حس مشترک۔ خیال۔ متصرفہ۔ واہمہ۔ حافظہ یہ سب دس نل ہیں اُستاد کا قابل دماغ علم کا خزانہ آب ہے جس سے تم مستفیض ہونا چاہتے ہو فرض کرو ایک طالب علم بوقت تدریس چھالیہ چبا رہا ہے گویا قوت ذائقہ کو کام میں لانے کی وجہ سے اس نے ایک نل بند کر دیا ہے کوئی بجائے اپنے اُستاد کو یا درس سے متعلقہ چیز دیکھنے کی طرف دیکھنے کے دوسری جانب نظریں دوڑا رہا ہے اس نے بھی ایک نل کو بیکار کر دیا ہے، اسی طرح اُستاد کی آواز کے عوض دوسری آوازوں کو بغور سننے والا یا اپنے دست و پا سے بیکار حرکتیں کرنے والا خزانہ آب سے پانی لینے میں کمی کر رہا ہے، یہی حال اُن طلبا کا بھی ہے جو پڑھتے وقت دوسرے خیالات میں لگے ہوئے ہیں یا کسی واہمہ و تفکر میں پڑے ہوئے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمہ تن متوجہ طالب علم کے دل و دماغ تو علم و کمال سے بہت جلد معمور ہو جائیں گے اور بدشوق طلباء اپنی اپنی بے توجہی کے لحاظ سے علم کے آب حیات سے محروم رہ جائیں گے

یا نسبتاً کم سیراب ہوں گے۔

طلباء کی بے توجہی کا یہ حال ہے کہ ذرا سی آہٹ اُن کو اُستاد سے اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔ اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اگر سبق سنتے ہیں تو سمجھتے نہیں سمجھ لیتے ہیں تو یاد رکھنا مشکل ہو جاتا ہے، مدرسہ آنے کی غرض تحصیل علم ہے، اُستاد سے درس لینے کا مقصد علم میں باکمال ہونا ہے نہ کہ ع

ہم بھی لہو لگا کے شہیدوں میں مل گئے

کے مصداق حاضر باشوں میں نام مگر غیر حاضروں کے سے کام۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ تدریس کے وقت طالب علم اپنی غیر ضروری دُھن میں لگا رہتا ہے اور اُستاد صاحب سبق کے کسی فقرے کا مطلب شرح وبسط سے بیان فرما چکتے ہیں، سمجھا دینے کے بعد جب آگے بڑھنا چاہتے ہیں تو ہمارے کوتہ اندیش طالب علم کو اپنی غفلت کا احساس ہوتا ہے اور تب اپنی کم فہمی کا اظہار کر کے اُستاد صاحب کو بار دیگر اپنی جانب اور پڑھائے ہوئے سبق کی طرف رجوع کر لیتا ہے اور نہ صرف اپنا وقت ضائع کرتا ہے بلکہ تمام جماعت کی تضیع اوقات کا باعث بنتا ہے، بسا اوقات اِس بے موقع سوال کی ذلت سے بچنے یا اپنے تغافل کے ظہور کے خیال سے اصل مضمون ہی کے سمجھنے سے دست بردار ہو جاتا ہے اور عین دریا میں پیاسا رہ جاتا ہے۔ طالب علم کا تو یہ فرض ہے کہ اگر یہ خارج مدرسہ اوقات میں دوسرے کاروبار میں بھی مشغول رہے تو اُس کا دل علم ہی کی طرف لگا رہے۔

اے میرے عزیز طالب علمو! اپنا گھر اپنا آرام چھوڑ کر مدرسہ صرف علم سیکھنے اور اُستاد سے مستفید ہونے آئے ہو، ہمہ تن متوجہ ہو کر بیٹھو، غور سے پڑھو، مدرسہ آنے سے قبل تمام ضروریات سے فارغ ہو جاؤ، اپنے دل کو جہاں تک ہو سکے ہر ایک اندیشہ سے خالی کر دو، فرض جن چیزوں کی اثنائے درس میں ضرورت لاحق ہوا کرتی ہے پہلے ہی سے اُن کی تیاری کر لو مثلاً پنسل کی درستگی یا سیاہی کاغذ وغیرہ، غرض مدرسہ میں تحصیل علم کے لئے ایسے مستعد ہو کر بیٹھو کہ سبق شروع

ہونے کے بعد کوئی چیز تمھیں اپنی جانب متوجہ نہ کر سکے۔ طالب علم جماعت میں اپنی نشست گاہ اختیار کرتے وقت اکثر ایسے طالب علم کے نزدیک بیٹھنا چاہتا ہے جس سے اس کی طبیعت مانوس ہے۔ اس ہمدم و انیس کی ہمنشینی سے کوئی معتدبہ فائدہ تو نہیں پہونچتا البتہ یہ ضرور ہوتا ہے کہ اثنائے درس میں باہمی گفتگو کا موقع مل جاتا ہے جس میں ہر دو کا نقصان متصور ہے کبھی اُستاد سے سنا ہوا مضمون ان دونوں میں سے کوئی ایک نہیں سمجھتا ہے تو بجائے اس کے کہ تشفی ہونے کیلئے اُستاد صاحب سے پوچھے، اپنے قریب کے دوست طالب علم سے سوال کرتا ہے ایک دوسرے کی تفہیم میں یہ اِدھر مصروف رہتے ہیں اُدھر اُستاد صاحب آگے بڑھ جاتے ہیں اگر تعلیم کے تمام وقت میں ایک دفعہ بھی یہ غلطی ہو جاتی ہے تو بہت دیر تک اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے گذشتہ مضمون کے سمجھنے تک موجودہ مضمون بھی رفت و گزشت ہو جاتا ہے یہی حال ہر مسئلہ کا ہوتا ہے، ان ہر دو طلبا کی دوستی نے یہ اثر کیا کہ جو سبق ایک قابل اُستاد سے سمجھا جا سکتا تھا ایک ہم جماعت سے غلط سلط سمجھنا پڑا اس کے سوائے بوقت درس گفتگو کرنے پر اُستاد کی سرزنش علحدہ ہوئی، پس میرے دوستو تمہاری نشست ہم رنگ و ہم خیال طالب علم کی بجائے ایسے کے قریب زیادہ مناسب ہے جس سے تمہارا زیادہ خلا ملا نہیں ہے تاکہ سبق کے وقت تمہاری یکجہتی میں فرق نہ آسکے۔

تمہیں کسی نہ کسی سفر کا اتفاق ہوا ہوگا جب تم ریل پر سوار ہونے کے لئے اسٹیشن پہونچکر ٹکٹ وغیرہ لینے کے بعد ریل کی آمد آمد کے منتظر رہتے ہو یکا یک گھنٹی بجتی ہے اس وقت تمہاری پوری توجہ ریل کی طرف مبذول ہو جاتی ہے، اِدھر ریل آئی اور تم گویا سب سے بے خبر ہو جاتے ہو صرف سوار ہونے کی دھن رہتی ہے، مدرسہ آنے کے بعد کم از کم اُستاد کی آمد کے بھی اسی طرح منتظر رہو، جب مدرس صاحب جماعت میں تشریف فرما ہو جائیں تو تمہیں صرف تحصیل علم ہی کا خیال رہے اور بس، اور سبق شروع ہونے کے ساتھ ہی تم اس کے سمجھنے میں ایسے منہمک ہو جاؤ کہ دنیا و مافیہا کی تمھیں خبر نہ رہے، اب جو علم تم سیکھوگے

اچھی طرح ذہن نشین ہوگا مشکل سے مشکل مضامین بسہولت سمجھ میں آجائیں گے قابلیت
بڑھے گی لایق ہوگے امتحانات میں اعلیٰ نشانات ضرور پاؤ گے۔

طلب صادق | ایک مفلس شخص کا دولتمند ہوجانا ایک فقیر حقیر کا امیر کبیر بننا ایک
سیاہ کار کا ولی کامل ہوجانا ایک جاہل کا علامۂ دہر کہلانا ناممکن سا معلوم ہوتا ہے لیکن ان
سب میں اگر طلب صادق اور شوق کامل کا ملکہ کافی طور پر موجود ہے اور یہ اس سے کام لے
رہے ہیں تو یہ سب کچھ ممکن الوقوع ہے تاریخ عالم پر نظر ڈالیے ہزاروں مثالیں اس قسم کی
ملیں گی کہ طالب صادق کو اپنے مطلوب پر کسی نہ کسی طرح دسترس ہو ہی گئی ہے۔ ؎

مور مسکین ہوسے داشت کہ در کعبہ رسد — پائے در دست کبوتر زد و ناگاہ رسید

بعض طالب علم کہا کرتے ہیں کہ ہماری کوشش رائگاں گئی محنت ٹھکانے نہ لگی امتحان دیا کامیاب
نہ ہوئے اگر انہیں یاد رکھنا چاہئے کہ محنت رائگاں نہیں جاتی کوشش ضرور کارآمد ہوتی ہے
بشرطیکہ ان کی طلب سچی ہو ان کا شوقِ علم کامل ہو۔ کامیابی کیسے ہوگی جب کہ غور سے پڑھا نہیں
مضامین علمیہ کس طرح حاضر فی الذہن رہیں گے جب کہ دلی شوق سے علم سیکھا نہیں۔ اسی
کام کا دل پر اثر ہوتا ہے جو بطیب خاطر انجام دیا جائے وہی باتیں دلنشین ہوتی ہیں جنہیں
دل شوق سے سنا جائے بہتیرے واقعات ہمارے گوش گزار کئے جاتے ہیں مگر ہم کو صرف
ان لئے یاد نہیں رہتے کہ ہم نے انہیں شوق و رغبت سے نہیں سنا ہے ظاہر ہو کہ مدرس کے اسباق
بے شوقی طلبار کے ذہن نشین کیونکر ہوسکیں گے بعض طلبار مدرسہ آتے ہیں تو صرف ماں باپ کے
ڈر یا اُستاد کے خوف سے تعلیم پاتے ہیں تو بادلِ ناخواستہ۔ اثر یہ ہوتا ہے کہ کسی مضمون سے
ان دلچسپی نہیں ہوتی۔ وقت کا ٹالنا منظور ہوتا ہے یہ تو ٹل جاتا ہے مگر جہالت کی مصیبت سر سے
ٹلنے نہیں پاتی۔ طلبار کی بدشوقی کا یہ عالم ہے کہ کوئی صرف اس وجہ سے زیر تعلیم رہنا پسند
کرتا ہے کہ وظیفہ تعلیمی پر اثر نہ پڑنے پائے کوئی اس لئے بار بار ناکام ہونا تک پسند کرتا ہے کہ
والد ماجد تنگ آکر تعلیم دلانے ہی سے دست بردار ہوجائیں کوئی عمداً اس واسطے غیر حاضر

ہوتا ہے کہ بعلت غیر حاضری مدرسہ سے نام خارج ہو جائے اور کچھ نہ کچھ زمانہ بیکاری میسر آسکے کوئی اپنے والدین سے اساتذہ یا مدرسہ کی بیجا شکایتیں اس لئے کرتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح مدرسہ سے پیچھا چھڑ لے۔ ان کی ناہنجاریوں کے باعث اگر استاد کی توجہ ان پر زیادہ مبذول نہ رہنے لگی تو یہ باغ باغ ہو گئے والدین نے اگر ان گستاخیوں کے سبب ان سے روگردانی کرلی اور نگرانی میں کمی کردی تو یہ پھولے نہ سمانے لگے! ع

بریں عقل و دانش بباید گریست

تحصیل علم کو ایک مشغلۂ بیکاری بنا رکھا ہے' اگر تمام کاروبار غیر ضروری سے وقت بچ گیا تو ادھر کچھ توجہ ہوگئی ورنہ ہر کام کو تعلیم و تعلم پر ترجیح حاصل ہے' مدرسہ سے رخصت کا لے لینا یا غیر حاضر ہو جانا ان کے نزدیک بالکل معمولی بات ہے' اسباق کا ناغہ ہو جانا یا ہم جماعت طلباء سے اسباق میں پیچھے رہ جانا کچھ بھی قابل افسوس نہیں' بلکہ وہ طلباء جنہوں نے امتحانی سوالات کے کچھ بھی جوابات نہیں دئے اور صرف نام اور رجسٹر نمبر لکھنے پر اکتفا کی امتحان گاہ سے ایسے شاد و خرم نکلتے ہوئے پائے گئے کہ گویا کوئی تمغۂ امتیاز حاصل کرکے تشریف لا رہے ہیں' بعض طلباء سے پوچھا جاتا ہے کہ کیا کامیاب ہو تو وہ اپنے کسی امتحان میں فیل ہونے کا اظہار اس پر فخر انداز سے کرتے ہیں کہ گویا کوئی بڑا کام انجام دیا ہے' جن کے پاس ناکام ہونے کی ذلت' ذلت ہی نہ رہی ہو اگر وہ بات بات پر مدرسہ سے رخصتیں نہ لیں یا غیر حاضر نہ ہوں تو تعجب ہے' بدشوقی اور تحصیل علم سے بے پروائی کا یہ حال کہ والدین کے پاس اگر کوئی مہمان آگیا کہ یہ مدرسہ سے غیر حاضر ہوگئے' اگر ان کے سرپرست کہیں مہمان گئے تو بھی مدرسہ آنا مشکل ہوگیا! سر میں خفیف سا درد ہوا کہ درخواست رخصت بھیج دی' کسی عزیز کی شادی ٹھیری کہ ہفتوں غیر حاضر ہو گئے' کسی دن بر وقت کھانا تیار نہ ہوا کہ مدرسہ سے غیر حاضری لازمی سمجھ لی' لطف یہ ہے کہ سبق یاد نہ کیا تو رخصت' دیر حاضری کا احتمال ہوا تو بھی رخصت' اگر کثرت غیر حاضری کے باعث مدرسہ سے نام خارج ہو گیا تو بھی ان کی مراد

پوری ہوگئی اگر نہ ہوا تو بھی ماں باپ کو یہ باور کرا کے خارج مدرسہ ہو گئے کہ ہم سبق طلبا بہت آگے بڑھ گئے ہیں ان کے ساتھ چلنا مشکل ہے اب اگلے سال ابتداہی سے خاص طور پر سخت شاقہ سے کام لیا جائے گا سُبحان اللہ

علم اور تعلیم گاہ سے ہماری یہ کنارہ کشی حضرات معلمین سے ہماری یہ بے اعتنائی اور گذشتہ زمانہ کے طلبار کے شوق علم اور طلب صادق کی یہ حالت کہ امام اسمٰعیل نے اپنی سترہ برس کی عمر میں جب محمد بن ایوب رازی کی خبر وفات سنی تو روئے چیخے اور کپڑے پھاڑ ڈالے ان کی پریشانی دیکھکر گھر والے جمع ہو گئے سبب پوچھا تو انہوں نے دل گیر ہو کر کہا کہ تم لوگ مجھکو سفر سے روکتے رہے آخر محمد ابن ایوب وفات پا گئے اب میں ان کو کہاں پاؤں گا آخر گھر والوں نے انہیں تسلی دی اور کسی شہر میں دوسرے شیخ وقت کی خدمت میں بھیجدیا۔ جہاں انہوں نے تحصیل علم کی۔

عزیز طالب علمو سچی طلب اور شوق علم میں تم بھی کمال پیدا کرنے کی کوشش کرو علم وفضل سے خاص محبت رکھو۔ مدرسہ اور مدرسین سے دلی انس پیدا کرو کتاب کو بہترین ہم نشین سمجھو مدرسہ کی حاضری کو ہر قسم کی مہمانی سے زیادہ عزیز جانو مسائل علمیہ اور ان کے نکات کے سمجھنے میں دعوتوں اور ضیافتوں سے بڑھ کر لذت حاصل ہونے کی کوشش کرو اپنے دوستوں سے حتی الامکان علمی مسائل کا تذکرہ کرتے رہو غرض ہر وقت علم وفضل کو اپنا مطمح نظر رکھو اگر تم ان اصول پر عمل کرنے والے بنو گے تو نہ صرف امتحان میں کامیاب ہو گے بلکہ ہر حیثیت سے فائز المرام رہو گے۔

حفاظت وقت اگر کسی باغ کی بہار خزاں سے مبدل ہو تو کچھ عرصہ کے بعد پھر نئی بہار آسکتی ہے کوئی قیمتی گوہر شکستہ ہو جائے تو پھر معدن میں اس قسم کے جواہر پیدا ہو سکتے ہیں کوئی چیز گم ہو جائے تو پھر وہی یا اس کے مشابہ کوئی اور ہمدست ہو سکتی ہے غرض تقریباً سبھی اشیار کا بدل بلکہ نعم البدل ممکن ہے مگر اگر تلافی نہیں ہو سکتی ہے تو گئے

وقت کی جا کر نہیں آسکتی ہے تو عزیز عمر خیا نچہ مال و دولت عزیز ہے اس لئے کہ اس سے
لطف زندگی نصیب ہوتا ہے عزت و شہرت پسندیدہ ہے کہ اس سے بڑے بڑے
فوائد حاصل ہو سکتے ہیں ریاضت و عبادت بہترین چیز ہے کہ اس سے نجات اخروی
میسر ہوتی ہے مگر ان میں سے ہر ایک اور ان کے سوا بہتری چیزوں کا دستیاب ہونا وقت
منحصر ہے وقت کو کام میں لایا گیا تو سب کچھ ہو سکتا ہے اس کو ضایع کیا کہ ہر قسم کی بربادی کا
سامان مہیا ہو گیا معلوم ہوا کہ ہر ایک ترقی کی جان دارین کی بہبودی کی روح رواں وقت ہے
اور بس ۔ وقت کی قدر کرو جملہ خوبیاں خودبخود حاصل کر لو گے

میرے شفیق طالب علمو! تمہارا معمولی سا نقصان ہوتا ہے تو تم پریشان ہو جاتے ہو
مثلاً تمہاری کوئی ادنیٰ سی چیز گُم ہو جاتی ہے تو بیحد تلاش کرتے ہو ایک ایک سے پوچھتے ہو
افسوس کرتے ہو تلافی مافات کی فکر میں لگ جاتے ہو یہ کیا غضب ہے کہ اوقات جیسی
عزیز ترین چیز اکثر و بیشتر بیکاری میں صرف ہو جاتی ہے مگر بہت کم ہیں ایسے طالب علم جو اس
نایاب شئے کے ضائع ہونے پر کچھ افسوس کرتے ہوں یا تلافی مافات کی فکر میں لگے رہتے ہوں
حالت تو یہ ہے کہ عمر کی عزیز گھڑیاں فراخ دلی کے ساتھ بیکاری میں صرف کی جاتی ہیں سوائے
چند مستعد طلبا کے اکثر کی زندگی کا نظام العمل جہانتک معلوم ہے تقریباً حسب ذیل ہے
صبح سات یا آٹھ بجے خوابِ غفلت سے بیداری (چنانچہ مدارس جب صبح کے رہتے ہیں تو
دیر حاضر طلبا کی تعداد بڑھ جاتی ہے جس کا حقیقی سبب دیر سے بیدار ہونا ہے) پھر ضروریات
بسہولت و کاہلی تمام فراغت پا کر حضوری مدرسہ بعدازاں مغرب سے ایک آدھ گھنٹہ پیشتر
کچھ پڑھ لیا اور بعجلت تمام کچھ درس خانگی اُستاد کے خوف سے کر لئے پھر محو خواب ہو گئے
اگر نہ بھی سوتے ہوں تو دوسرے بیکار مشاغل میں رات کا تقریباً نصف حصہ گزار دیا جاتا ہے
آرام طلبی میں بیجا تاخیر صبح میں دیر سے بیدار ہونے پر مجبور کر دیتی ہے قابل غور یہ ہے کہ
جن طلبا کے کئی کئی گھنٹے بستر راحت پر کروٹیں بدلنے میں یا دوست احباب کے ساتھ

غیر ضروری گفت و شنید میں گذر جاتے ہوں ان کے دل و دماغ علم و فضل سے کس طرح معمور ہوں گے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ تفریح نہ کی جائے، یا خورد خواب کے لئے کوئی وقت نہ دیا جائے اس کے متعلق حفاظتِ صحت کے عنوان میں آیندہ مفصل بحث کی جائیگی اب صرف اس قدر سمجھا دینا کافی ہے کہ ہر چیز میں افراط و تفریط ہر دو مضر ہیں اور بے موقع کام کا ترک کر دینا ضروری ہے، تفریح کیجئے آرام لیجئے مگر ان سب سے مقصود بالذات علم ہو اور یہ سب چیزیں اس کے حصول کا ذریعہ سمجھی جائیں؛

یاد رہے کہ بعض دوست خواہ ہم جماعت ہوں یا ہم مدرسہ، ہم وطن ہوں یا ہم عمر تضیع اوقات کے خاص اسباب رہا کرتے ہیں ایسے احباب سے حتی المقدور کنارہ کشی نہایت ضروری ہے مثلاً ایک طالب علم مدرسہ آنے کے لئے وقت پر گھر سے نکلتا ہے اگر یہ تنہا آتا تو بر وقت مدرسہ پہونچتا اور راہ روی کے وقت اپنے سبق کے متعلق کچھ غور و تدبیر کرتا ہوا آسکتا یا کم از کم ایسے دوست کے ساتھ آتا جو راستہ میں طے مسافت کے وقت علمی تذکرہ میں اس کا شریک رہتا مگر ہوتا تو یہ ہے کہ ایک دوست مدرسہ آتا ہوا دوسرے کے گھر پر حاضر ہوتا ہے اگر وہ کسی بیکار مشغلہ میں مصروف ہے تو یہ بھی اس کا شریک کار ہو جاتا ہے اگر کسی وجہ سے وہ دیر حاضر ہونا چاہتا ہے تو یہ بھی اس کی خاطر سے دیر حاضری کو پسند کر لیتا ہے اور مدرسہ آتے وقت بجائے اس کے کہ آپس میں درس یا علمی تذکرہ کرتے ہوئے آتے لاطائل گفتگو میں قطع مسافت کر لیتے ہیں، دوستی کا نتیجہ یہ ہوا کہ عزیز وقت کا کافی حصہ بیکاری میں گزر گیا۔ ؎

ہر متاعے کہ خریدیم باوقات عزیز بود اگر یوسف مصری نہ خریدن به بود

یہ حالت تو ان ایام کی ہے جن میں مدارس کھلے رہتے ہیں، تعطیل کے دنوں میں وقت کی تباہی نئے انداز سے کی جاتی ہے کوئی طالب علم کسی عزیز کے گھر تعطیل کا دن بڑی بیکاری میں گزار دیتا ہے کوئی اِدھر اُدھر گشت لگا کر اوقات ضائع کر دیتا ہے۔ سالانہ امتحان کے بعد

اگر طویل تعطیلات ہو گئے تو کتابیں بالائے طاق کر دی گئیں گویا قسم کھالی ہے کہ اس اثنا میں
کسی قسم کا علمی کاروبار انجام نہ دیں گے کیونکہ برس بھر تعلیم پاتے پاتے بیحد تھک گئے ہیں۔
اگر کہا جاتا ہے کہ کتابوں کا مطالعہ کیا کیجئے جواب ملتا ہے کہ پڑھی ہوئی کتابیں پڑھنا بیکار ہے کیونکہ
رفت و گذشت ہو گئیں اور آیندہ کورس کی کتابیں اس لئے شروع نہیں کی جا سکتیں کہ ممکن ہے
جو امتحان دیا ہے اس میں ناکام ہو جائیں اور پھر وہی پڑھی ہوئی کتابیں پڑھنے کی نوبت آ جائے
بعض علم دوست ماں باپ بھی اس نرالی منطق کی کنہ سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں اور طالب علم کے
خیال کی تائید کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اگر سالانہ امتحان کا نتیجہ تعطیلات سے پہلے ہی
شائع ہو چکا ہے تو ناکام طلبا یہ کہہ دیتے ہیں کہ پڑھی ہوئی کتابیں کیا پڑھا کریں، کامیاب یہ
عذر کر بیٹھتے ہیں کہ آیندہ نصاب کی کتابیں خریدی گئی ہیں نہ ان کی تعلیم شروع ہوئی ہے،
ابھی سے ان کا مطالعہ کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ الحاصل نتیجہ امتحان برآمد ہو کہ نہ ہو سالانہ
امتحان میں یہ کامیاب رہیں یا نہ رہیں، بہر حال کسی درسی کتاب کا مطالعہ اپنے لئے مناسب
خیال نہیں کر سکتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طویل تعطیل کے بیش بہا ایام صرف بیکاری کے نذر
ہو جاتے ہیں۔ اگر علمی شغلہ کسی نے جاری بھی رکھا تو صرف اس حد تک کہ طلسم ہوش ربا کا دورہ
کر لیا یا عشقیہ ناول یا دیگر افسانے دیکھ ڈالے جن سے اخلاقی و علمی فائدہ ملا جتنا ملا مگر نقصان
یہ ہوا کہ عزیز اوقات ناقص یا کم سے کم ادنیٰ شغل میں گذر گئے۔

دوستو۔ طالب علمی کا زمانہ بہترین زمانہ ہے کہ اہل و عیال کے جھگڑے ساتھ ہیں نہ
ملازمت وغیرہ کے بکھیڑے زمانہ کے نشیب و فراز کی پروا ہے نہ افکارات دنیوی سے سابقہ
آیندہ عمر میں اس زمانہ کو اور ان بےفکر ایام کو یاد کرو گے اور پچھتاؤ گے۔

صاحبو۔ اگر تم بھی علم میں باکمال بننا چاہتے ہو تو ع

جو دم ہے وہ ہے بسا غنیمت۔

پر عمل پیرا رہو لمحہ لمحہ کا اپنے دل میں حساب رکھو سوائے فائدہ بخش تفریح اور لابدی ضروریات

زندگی کے ذرا غور کرو کہ چوبیس گھنٹوں میں کتنے گھنٹے ضروری کام میں بسر ہوئے اور کتنے بیکاری یا
مصرت بخش کاروبار میں گذرے دوسرے دن پہلے کی نسبت غیر ضروری اشغال میں کمی کردو
اس طرح اپنی اصلاح آپ کرتے جاؤ اگر حفاظت وقت میں سرگرمی سے کام لوگے تو علمی ترقی میں
خاطرخواہ اضافہ پاؤ گے امتحان میں اعلی کامیابی کے ساتھ فائز المرام رہوگے

(باقی)

ارتقائے عمل تعلیم

از مسٹر گنیش چند بی اے۔ بی ٹی مدگار مدرسہ فوقانیہ دارالعلوم

(پیوستہ)

تاریخی تعلق ہر ملک کی تعلیمی حالت اس کی تاریخ سے وابستہ ہوتی ہے لہذا یہ معلوم کرلینا ضروری ہے
کہ انگلستان کی تاریخ کیونکر تبدیلی طرز تعلیم کی محرک ہوئی دو اہم واقعات جن سے یورپ و امریکہ کی
سیاسی و تمدنی زندگی میں غیر معمولی کایا پلٹ ہوئی وہ "انقلاب صنعتی" اور جمہوریت کی ترقی" ہیں
گو ہندوستان اس قسم کے انقلابات سے تاحال متاثر نہیں ہوا۔ لیکن کیا عجب ہے کہ جلد تر
ہمارا ملک موجودہ زمانہ کی ضروریات کے مدنظر ان معرکۃ الارا انقلابات کو طوعاً و کرہاً قبول کرلے
کوئی ڈیڑھ دوسال قبل انگلستان کی حالت ہندوستان کی موجودہ حالت کی سی تھی
وہی تعلیمی مسائل جو آج ہندوستان میں زیر غور ہیں اس وقت یوروپی مجالس تعلیم کے خاص
بحث تھے مثلاً۔ والدین کی خواہش تھی کہ ان کی اولاد اپنے آبائی پیشوں ہی میں درجہ کمال
حاصل کرے لیکن جب صنعتی انقلاب کی وجہ سے ملک کی دولت چند بڑے سرمایہ داروں کے
ہاتھ میں آگئی تو عوام اپنے آبائی پیشوں کے اختیار کرنے پر راغب نہ رہے اور ایک معتدبہ

تعداد اطفال کی کارخانوں میں کام کرنے لگی۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کو ان کی
تعلیم کی فکر پیدا ہوئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی وجہ سے مکان پر اور دیہات
میں انفرادی تعلیم کا طریقہ مفقود ہو گیا۔ لیکن حسب ذیل مفید اثرات لازماً پیدا ہوئے۔
اول یہ کہ مدارس کے قیام کا خیال پیدا ہوا۔ دوسرے یہ کہ تعلیم کا مقصد صرف حصول علم ہی
نہ رہا۔ بلکہ عوام اس امر پر غور کرنے لگے کہ اپنے روزانہ کاروبار کے بعد وہ فرصت کے
گھنٹوں کو تعلیمی مشاغل سے کس طرح دلچسپ بنا سکتے ہیں چنانچہ اس کا فوری نتیجہ اخبارات
کی ترویج اور ناولوں کی زیادتی ہوا۔ تیسرے یہ کہ صنعتی مدارس کا قیام لازمی قرار پایا
تاکہ طلباء ابتدائی تعلیم کے ساتھ ساتھ اپنے پیشے سے بھی واقف ہو جائیں۔

صنعتی انقلاب سے زیادہ انقلاب آفریں واقعہ "جمہوریت کی ترقی" ہے جس سے
مساوات کا زرین اصول یورپ میں رائج ہو گیا۔ اس کے پہلے تعلیم صرف چند خوش قسمت
اشخاص کا حصہ تھی لیکن رفتہ رفتہ یہ خیال واضح ہو گیا کہ ہر شخص میں انسان ہونے کی حیثیت سے
تعلیم پانے کی قابلیت موجود ہے' اور نفسیات نے یہ ثابت کر دیا کہ ہر بچہ میں کئی متعدد
خوبیاں مضمر ہیں۔ چنانچہ معلم کا یہ فریضہ ہوا کہ وہ اپنی ذاتی دلچسپی سے مستتر خوبیوں کی بہترین
طریقہ سے نشو و نمو کر سکے۔

جمہوریت کی ترقی سے یہ اثرات مترتب ہوئے کہ (۱) موجودہ زمانہ کی تعلیم ایک خاص
عمر اور خاص قابلیت کے طلباء کو یکجا کر کے اس اصول کو عملی جامہ پہنا رہی ہے (۲) ابتدائی
جبری تعلیم پر زور دیا جا رہا ہے۔ تاکہ طالب علم ابتداءً عام اور ضروری تعلیم حاصل کرنے کے بعد
کسی پیشہ کو اختیار کرے۔ (۳) ہر جمہوری حکومت میں ہر منفرد باشندے کا یہ فریضہ ہے کہ
وہ ملکی معاملات میں حصہ لے جس کے خوب پینے کے لئے یہ لازمی ہے۔ کہ وہ ملکی دستور کو
بخوبی سمجھے۔ لیکن یہ اس وقت ممکن ہو سکتا ہے۔ جب کہ وہ تعلیم یافتہ ہو۔ چنانچہ
رفتہ رفتہ انگلستان اور امریکہ میں سوسائٹی اور حکومت کے مفاد کے مدنظر سرکاری مدارس

قائم ہوگئے تاکہ ہر بچہ تعلیم سے بہرہ اندوز ہوسکے (۴) بالآخر یہ کہ ہر جمہوری ملک کی یہ خصوصیت قرار پائی کہ تمام افراد ملک انتہائی ملکی مفاد کو پیش نظر رکھ کر ملکی انتظام کو اس خوبی اور اس ترتیب سے ڈھالیں کہ ملک کو بحیثیت مجموعی ہر فرد ملک کی خوبیوں سے استفادہ کا موقعہ ہاتھ آئے۔ اور یہ اسی وقت عمل پذیر ہوسکتا ہے جب کہ ملک کے باشندے صحیح طرز زندگی سے واقف ہوجائیں اور صحیح طرز زندگی کے لیے لازم ہے کہ صحیح اصول سے تعلیم دی جائے۔ پس مصلحان تعلیم مختلف تجارب سے اصول تعلیم معلوم کرنے کیلئے کوشاں ہیں۔

جنگ یورپ سے پیشتری مصلحین تعلیم اس ٹوہ میں تھے کہ موجودہ کو دفع کیا جائے جنگ عظیم نے ثابت کر دیا کہ ہمارے تعلیمی نقایص باہمی جنگ، وجدل، نفاق اور بدامنی کی جڑ ہیں پس اگر ایسے طریقۂ تعلیم کو رائج کیا جائے جو ہمکو اپنے ذاتی و قومی مسائل پر صحیح طور سے غور و فکر کرنے میں مدد دے اور یہ فکر صحیح عمل صحیح پر منتج ہو۔ تو لازماً ہم جنگ وجدال او بدامنی کے مصائب سے چھٹکارا پا جائیں گے، اس غیر معمولی تعلیمی دلچسپی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مخصوصین تعلیم نے جماعت کی نوعیت اصول تعلیم مدرسہ نصاب تعلیم اور متعلم کی ذاتی دلچسپیوں کے متعلق غور و فکر کیا۔ چنانچہ اسی بنا پر ٹریننگ کالج وغیرہ کو فروغ دینے کا خیال پیدا ہوا۔

دور ماضی | یہ غیر صحیح ہے کہ "نئی تعلیم" ایک جداگانہ انقلابی حیثیت رکھتی ہے۔ اور زمنہ گذشتہ کے آثار تعلیم سے بری ہے۔ "نئی تعلیم" ان آثار تعلیم قدیم سے تین طریقوں سے متاثر ہوئی۔ اولاً یہ کہ تعلیم جدید میں علم النفس کا اشتراک پایا جاتا ہے۔ ثانیاً یہ کہ تعلیم کا رجحان سائنٹیفک (علمی) ہے۔ ثالثاً یہ کہ تعلیم اور سوسائٹی کا تعلق گہرا ہے۔ اور یہ جملہ امور نتیجہ افکار ماضیہ ہیں۔ پس قدیم و جدید کا فرق ظاہر ہے۔

یہ بتلا دینا ضروری ہے کہ "نئی تعلیم" میں چند باتیں ایسی مشترک پائی جاتی ہیں کہ مصلحین مابعد نے جن کے مفید اور بہترین اصول تعلیم کی تفصیلی اپنی تصنیفات میں کر دی ہے۔

ابتداً "طالب علم کی فطرت" پر کسی نے تفصیلی بحث نہ کی تھی۔ حتیٰ کہ کہا جاتا تھا کہ

طالب علم کی تعلیم ایسی ہونا چاہئے کہ اس کے فطرتی جذبات دب جائیں۔ مگر بعد کو یہ ثابت کر دیا گیا کہ طالب علم کی فطرت کا خاص لحاظ مدرس کو تعلیم میں کرنا چاہئے۔ طالب علم کی فطرت کا تعلق نفسیات سے ہے اس لئے اس کو اس زمرہ میں لیا جا سکتا ہے چنانچہ یہ ثابت ہوگیا کہ نصاب تعلیم و طریقۂ تعلیم کو اس قدر اہمیت نہیں جس قدر کہ طالب علم کی ذاتی دلچسپیوں کو ہونی چاہئے۔ بچہ ایک ایسا حیوان ہے جو ہمیشہ مائل بہ نشو و نمو رہتا ہے۔ بچہ کی فطرت ہے کہ وہ اپنے ماحول سے واقفیت حاصل کرنے کی طبعی کوشش کرے پس بہترین مدرس وہ ہے جو سچے رہنما کی طرح بچہ کی اس کام میں امداد کرے۔ بچہ کو اس سے دور نہ رکھنا چاہئے جس سے اسے کچھ فائدہ نہ ہو۔ اس کا ماحول ایسا ہونا چاہئے کہ مدرس بآسانی یہ معلوم کر سکے کہ بچہ کا میلان طبع کیا ہے۔ اور اسی کی نشو و نما کرنا چاہئے مختصر یہ کہ طالب علم کی فطرت، اس کی تعلیم کی اساسی بنیاد ہونی چاہئے۔ تعلیم ایسی ہو کہ بچہ کو ذاتی سعی و اکتساب کے جانب راغب کرے۔ بچہ خود بخود آس پاس کی چیزوں سے واقف ہونے کی کوشش کرتا ہے ہر چیز کو وہ دیکھتا، سونگھتا، چھوتا، اور کسی نہ کسی طرح استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مدرس کی تعلیم بھی اسی نمونہ کی ہونی چاہئے۔ مدرس طلباء کے صرف حواس بصارت و سماعت کو ہی کام میں نہ لائے بلکہ حتی الوسع کوشاں ہو کہ طالب علم اپنے تمام حواسوں کو جداگانہ یا متفقہ طور پر استعمال کر سکے۔ مثلاً اگر مثلث کی شکل سے بچے کو واقف کرانا ہو۔ تو مدرس اس کو تختۂ سیاہ پر کھینچکر خاموش نہ ہو جائے۔ بلکہ اس کو کاغذ دیکر یہ کہدے کہ اسی قسم مثلث کاغذ سے کاٹے۔

مذکورۂ بالا نظریات تعلیم کے لحاظ سے بچہ کی شخصیت پر زور دینے سے اس قسم کے حسب ذیل نتائج مترتب ہوتے ہیں کہ مثلاً بچہ کی طبیعت سے واقف ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ

مدرس علم النفس کے اصول سے واقف ہو

یا یہ کہ گو بچہ میں کئی ذاتی تمدنی و قومی خصائل پائے جاتے ہیں لیکن وہ فطرتاً ایسا شخص ہے

جو مجموعی طور پر جسمانی و نفسیاتی خوبیاں رکھتا ہے۔ چنانچہ دیکھا جاتا ہے کہ ہر طالب علم کی ترقی دوسرے طالب علم کے مقابل ہوتی ہے۔ بس "نئی تعلیم" نے اس امر پر زور دیا کہ مدرس کو جماعت کی طرف مجموعی حیثیت سے ہی نظر نہ ڈالنی چاہئے۔ بلکہ ہر متنفس کی تعلیم کی طرف جداگانہ طور پر بھی متوجہ ہونا چاہئے اور اخلاقیات کا یہ نظریہ کہ ہر متنفس میں بہترین کام کرنے کی قوت مضمر ہے مذکورہ بالا امر کو اور بھی تقویت پہونچاتا ہے۔ نہ صرف مدرسہ کے ہر طالب علم کے حقوق و قابلیتوں کا لحاظ مدرس کو کرنا چاہئے بلکہ اس کا فریضہ ہے کہ اپنے طریقۂ تعلیم کو وقتاً فوقتاً بلحاظِ ضرورت جماعت تبدیل کرتا رہے۔ یہ غلطی اکثر ٹرینڈ مدرسین سے ہوتی ہے جو یہ تصور کرتے ہیں کہ چند عام اصول ہر وقت اور ہر صورت میں اس کے درس کو کامیاب بنا سکیں گے لیکن مدرسین کو یہ بات معلوم رکھنی چاہئے کہ ان کے ذمہ دنیا کی زندہ ہستیوں کی تعلیم سپرد ہے نہ کہ کسی بیجان شین کی جو ہمیشہ ایک طور پر چلتی رہے تعلیم کا کوئی اصول باقاعدہ (خواہ وہ کیسا ہی مکمل کیوں نہ ہو) ہمیشہ ناکامیاب رہے گا اگر مدرس اس کو بلا سوچے سمجھے وقت بے وقت کام میں لائے۔

جماعت کو صرف انتظامی نقطۂ نظر سے تصور کیا جانا چاہئے۔ نہ کہ تعلیمی چنانچہ ڈالٹن پلین اسی عمل کی توضیح کرتا ہے۔

علمی رجحان تعلیم | تعلیم کا مقصد یہ تبلایا گیا ہے کہ وہ زندگی کو کامل کردے بس علی الترتیب حسب ذیل علوم کی تعلیم پر زور دیا جانا لازمی ہے اولاً وہ علوم جو انسان کے بقائے ذات کے لئے ضروری ہیں مثلاً علم طبعیات، علم الکیمیا، حفظان صحت وغیرہ دوسرے وہ علوم جو بالواسطہ ذاتی تحفظ کے لئے ضروری اور معاشی اور تمدنی ضروریات میں ممد ہوں۔ تیسرے وہ علوم جو عیال و اطفال کی تعلیم و ترتیب میں مدد دیں۔ چوتھے وہ علوم جو ہماری معاشرتی اور سیاسی زندگی میں کار آمد ہوں پانچویں فنون لطیفہ وغیرہ، اس اعتبار سے نئی تعلیم نے نصاب کو وسیع کرایا اور نئی بحث یہ پیدا کردی کہ آیا تعلیم محض حصول علوم عامہ کے لئے دی جائے

یا طالب علم کے افادہ کے لئے اس ضمن میں وہ مضامین شامل نصاب کئے گئے جو نسل آیندہ کو آبا و اجداد کے پیشوں کو اختیار کرنے میں مددیں اور تعلیم پیشہ ورانہ نقطہ نظر سے دیکھی جانے لگی تیسرے اس کا فوری نتیجہ یہ ہوا کہ سائنس مدارس ثانویہ کے نصاب میں فی الفور داخل کر لی گئی۔

معاشرتی پہلو سے تعلیم سوسائٹی کی بہبودی اور استحکام کا ایک زبردست ذریعہ ہے پس نصاب کا انتخاب ایسا ہونا چاہیے کہ وہ ہر متنفس کو بہترین معاشرت پیدا کرنے میں مدد دے تاکہ سوسائٹی کا ہر فرد تعلیم سے فیض یاب ہو سکے، انیسویں صدی کے سیاسی حلقوں میں یہ خیال موجزن ہوا کہ سیاسی و قومی ارتقا کیلئے تعلیمی مناسبت پیدا ہو ضروری ہے یعنی یہ کہ جمہوری حکومت کا قیام عوام کی تعلیم پر منحصر ہے یہی خیال جبری طریقہ تعلیم کا محرک ہوا۔ انیسویں صدی میں تعلیمی اصلاحات سوشیل و سیاسی تبدیلیوں کے دامن گیر رہیں تعلیم کی تعبیر سوشیل نقطہ نظر سے حسب ذیل طریقوں سے ہوئی۔ اولاً یہ کہ تعلیم علم کی اشاعت کا ذریعہ تصور کی گئی۔ ثانیاً یہ کہ تعلیم انضباط معاشرت کا باعث ہوی۔ قدیم زمانہ میں سوسائٹی کا انحصار راست حکومت پر تھا۔ اور بالواسطہ مذہب پر۔ لیکن موجودہ زمانہ میں تعلیم بالواسطہ انضباط معاشرت کا ذریعہ ہو گئی ہے اور وہ اس طرح سے کہ تعلیم آنے والی نسلوں کے خیالات کو موجودہ ضروریات کے مدنظر خاص طور سے متشکل کرتی ہے۔ نیز ان کے خیالات کی اصلاح اور ان کی معاشرت میں تبدیلی پیدا کرتی ہے۔ گویا یہ کہنا چاہیے کہ تعلیم ہمارے خیالات کو متغیر کرتی ہے اور یہ تبدیلی ہماری معاشرتی اصلاح کا باعث ہوتی ہے۔ ثالثاً یہ کہ تعلیم سوشیل خیالات کے ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہونے کا باعث ہوتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ انسان فطرتاً اپنے تجربات، اپنے روایات معاشرت، خیالات، رسم و رواج کو وراثتاً منتقل کرتا چلا آیا ہے۔ پس تعلیم سوشیل خیالات کی منتقلی کا زبردست ذریعہ ہے۔

خلاصہ یہ کہ تعلیم سوشیل ارتقار کا باعث ہے، ارتقاء انسانی کے معنی یہ ہیں کہ انسان

خود کو بحیثیت مجموعی اپنے ماحول کے اعتبار سے سد ہار تا چلا جائے مناسب تو یہ ہے کہ بجائے قدرتی ماحول کے سوشل ماحول ہماری نسلوں کی تعلیم کا مرکز بنے۔ تاکہ سوشل بیداری سوشل ترقی کا باعث ہو۔ پس تعلیم سوشل دنیا سے واقفیت کا ذریعہ ہے۔ بالآخر اس امر کی توضیح ضروری ہے کہ "نئی تعلیم" نے ہر قسم کے مختلف تعلیمی رجحانات کو یکجا کر دیا۔ اور ان کو ایک نئی وضع میں ڈھالا جس کا فوری نتیجہ یہ ہوا کہ اولاً ہمارا نصاب تعلیم وسیع و ہمہ گیر ہو گیا اور ثانیاً یہ "نئی تعلیم" نے مروجہ تعلیم کے اساسی سنگ بنیاد پر ایک شاندار عمارت کھڑی کر دی۔

نمونۂ نیک

از جناب مولوی سید فخر الحسن صاحب ملاّبی اے صدر مدرس مدرسہ وسطانیہ شاہ گنج

روزمرہ کے مشاہدات حکماء کے اقوال اور عقلمندوں کے تجربات سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ گئی ہے کہ انسان جس قسم کے لوگوں سے ملتا جلتا ہے۔ جن کے ساتھ اُٹھتا بیٹھتا ہے اُن کی عادتیں اور اطوار وہ بہت جلد سیکھ لیتا ہے صالحین کا فیض صحبت بداطواروں کو نیک نہاد بنا دیتا ہے لیکن بدوں کی ہمنشینی سے بہت کم ایسے ہیں جو حکیم لقمان کی طرح نیکی و خداترسی کا سبق لیکر نکلیں اسی لئے کہا جاتا ہے دوستوں کے انتخاب میں خوب جانچ پرتال سے کام لینا چاہئے کیونکہ ہر شخص کے اطوار و عادات اُس کے دوستوں اور ہمنشینوں کے اطوار و عادات سے جانچے جاتے ہیں" انسان اپنے دوستوں اور ہمسروں کے اثر سے اس قدر متاثر ہو جاتا ہے کہ اس کا دل و دماغ، اُس کے عادات و خصائل، اُس کے جذبات و رجحانات سب اسی رنگ میں رنگے جاتے ہیں ہمنشینی کا اثر یوں تو ہر عمر کے انسانوں پر کم و بیش پڑتا ہے مگر انسانی زندگی کا

وہ سادگی اور بھولے پن کا زمانہ جسے لڑکپن کہتے ہیں گویا اثر پذیری ہی کے لئے بنایا گیا ہے قدیم زمانہ کے معلمین اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے' اس خاصہ طبعی کے جملہ پہلوؤں پر عبور رکھتے تھے اور خوب سمجھتے تھے کہ اس کے طرز عمل پر بہت سی زندگیوں کے مستقبل کا انحصار ہے ان کا مقصد حیات یہ تھا کہ وہ خوبیوں اور نیک عادتوں کا ایسا عمدہ نمونہ پیش کر دیں جو چھوٹی چھوٹی ہستیوں میں غیر معلوم طور پر مضبوطی کے ساتھ سرایت کر جائے' ان کے ایثار و کسر نفسی ان کے زہد و تقویٰ' اُن کی راست بازی و راست گفتاری کی زندہ مثالیں بڑی اثر رکھتی تھیں اُن کی شخصیت میں مقناطیسی کشش تھی۔ اُن کے ہاتھ جس کو چھوتے' سنگ پارس کی طرح طلائے خالص بنا دیتے' ان کا ہر فعل شاگردوں کے واسطے ایک سبق ہوتا تھا اُن کا ہر عمل طلبا کے لئے ایک قانون اخلاق' ان کی بات بات میں حکمت' ان کا نقطہ نقطہ کلید معارف' وہ آفتاب تھے جس کی گرمی و روشنی سے تمام عالم مستفیض و مستنیر ہوتا تھا ابر نیساں تھے جن سے قومی غنچوں کی آبیاری ہوتی تھی۔ اِن بزرگواروں کے فیض صحبت نے ایسے ایسے صاحب کمال پیدا کئے جن کے علمی کارنامے صفحۂ روزگار پر زریں حروف میں تحریر ہیں "ان حصیر کہنہ" پر بیٹھنے والوں نے "بے سجادہ رنگیں کن" کا وہ سبق دیا جس نے ساری دنیا میں علم و فضل کے ساغر چھلکا دئے۔

دور حاضرہ کے مدرسین جو انہیں رہنمایان علم و فضل کے جانشین ہیں ایک بڑے نام کے سایۂ محض ہیں۔ کہلاتے تو مدرس ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ مدرسی کو بھی دوسرے سررشتوں کی نوکری کی طرح پیسہ کمانے کا ایک ذریعہ تصور کرتے ہیں۔ ان کی پستی و نکبت کا یہی کافی ثبوت ہے کہ آئے دن گشتیاں نکلتی ہیں۔ احکام صادر ہوتے ہیں' دستور المعلمین میں دفعات قائم کئے جاتے ہیں کہ "مدرس اخلاق حمیدہ سے آراستہ ہو کر خود نیک نمونہ بنے تاکہ لڑکے اس کی صحبت نیک سے عمدہ اخلاق اچھی عادتیں سیکھیں" مگر ان کے کان پر جوں نہیں رینگتی۔ ذاتی حظ نفس اور ہیجان حیوانیت کی مذبح پر قومی معاشرت و

تہذیب کو نہایت بیرحمی سے قربان کرڈالتے ہیں۔ افسران اعلیٰ کی تاکیدیں لاپروائی سے
سنی جاتی ہیں۔ ان کے احکام دفتری کارروائی سے زیادہ پراہمیت نہیں تصور کئے جاتے،
اور کبھی اپنی قلب ماہیت کا احساس نہیں کرتے کاش ہمارے یہ حضرات دیکھتے کہ
انہوں نے کس قدر اہم کام کا بیڑا اٹھایا ہے۔ ان کے ہاتھ میں ملک وقوم کی باگ ڈور ہے
ان کی تحویل میں ان نونہالان قوم کی ساخت و پرداخت ہے جو کل قوم بنیں گے
مگر یہاں تو

ہے علی قدر مراتب سب کو عشق　　　　تھوڑا تھوڑا ہر کوئی دیوانہ ہے

کے سیلاب میں سب بہے چلے جاتے ہیں۔

ہم مدرسین سمجھتے ہیں کہ چھ گھنٹے اگر مقررہ مضامین کی تعلیم دیدی گئی تو بس ہمارا
فرض ختم ہو گیا، مدرسہ کے باہر ہم پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ مگر یہ خیال غلط ہے۔
ہم جہاں اور جس حالت میں ہوں یاد رکھنا چاہئے کہ چھوٹی چھوٹی نگاہیں ہمارے عمل کی
جاسوسی کر رہی ہیں، ہمارے ہر فعل کا غور سے مطالعہ کر رہی ہیں، ہمارے ہر لفظ پر ان کے
کان کھڑے ہوتے ہیں۔ ہمارا ہر فقرہ ان کے سادہ دلوں میں نقش کالحجر ہو جاتا ہے یہ معصوم
ہستیاں معلمین کو نیکی و بھلائی، علم و کمال کا مجسمہ سمجھتی ہیں۔ اور اس کے قدم بہ قدم چلتی ہیں
پھر یہ مسلسل چھ گھنٹے استاد کی صحبت ونگرانی میں رہتی ہیں اور ان کو استاد کے عادات و
خصائل سے متاثر ہونے کے لئے کافی وقت ملتا ہے، یہ خیال کرنا کہ طلبا، استاد کے
عادات و اطوار سے متاثر نہیں ہوتے صحیح نہیں ہے۔ تعمیر عادات و خصائل کا ایک زبردست
عنصر ماحول ہے۔

پس ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے نیک نمونہ عمل سے اپنے شاگردوں کی اخلاقی و
علمی رہنمائی کرتے رہیں۔ راستبازی کا سبق دینے کے لئے سراپا صداقت ہو جائیں ایثار کی
تعلیم کے لئے اپنے مفاد کی قربانیاں کریں۔ محنت و مشقت کے عمدہ نتائج بتانے کے لئے

جانفشانی اور جگر کاوی کے مجسمے بن جائیں نیز علم و قوم ملت اور وطن کے صحیح مفہوم کو سمجھیں اور سمجھائیں اگر ہم صرف الفاظ سے نہیں بلکہ اپنے عمل سے تلقین کریں گے تو بچے اخلاق و حیا و غیرت کے پتلے اور حقیقی معنوں میں ہمارے بچے (؟) بن جائیں گے۔ اور صرف اسی طرح صرف نیک نمونۂ عمل پیش کرکے ہم اپنے شاگردوں کو تعلیم دے سکتے ہیں اور صرف اسی طرح ہم اپنی اہم ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو سکتے ہیں خوب یاد رکھنا چاہئے کہ ہم اشاعت علوم کے علمبردار ہیں ہم امانت کبریٰ کے حامل ہیں ہم آیہ کنتم خیر امت اخرجت للناس کے مخاطب صحیح ہیں ہم نعرۂ لاتخف انک انت الاعلی کے منادی ہیں ہم لا تھنوا و لا تحزنوا کی تفسیر ہیں ہم اقوام عالم کو سبق دے چکے ہیں تہذیب و روشنی کے بانی ہیں ہماری کل تاریخ درحقیقت تعلیم و تعلم ہی کی تاریخ ہے اور استاد ازل کے حقیقی شاگرد ہم ہی ہیں جو پیغام ورس دیکر بھیجے گئے ہیں پھر کیا سبب ہے کہ ہمارے اسلاف کی حرارت برودت ہو کر رہ گئی ہے اور ہم صرف شمع خموش کی صورت میں فراق صحبت شب کا جلا ہوا داغ بنکر رہ گئے ہیں !!!

اسکاؤٹنگ

از جناب مولوی ولایت علی صاحب بی اے صدر مدرس مدرسہ وسطیٰ آسنسول شاہ علی پنڈہ

اس مختصر سے مضمون میں میں اس عالمگیر تحریک کی تمام خصوصیات اور فوائد وغیرہ پر نہ تو بحث کروں گا اور نہ کر سکتا ہوں۔ اس مضمون سے میرا مطلب یہ ہے کہ اس عالمگیر تحریک کو ان حضرات کے گوش گزار کروں جن کی نظروں میں اسکاؤٹنگ محض ایک کھیل ہے

جس میں کم سن اور بڑی عمر کے طلبا رخاکی وردی پہنے۔ تسلہ باندھے۔ ہاتھ میں لٹھ یا جھنڈی لئے اِدھر اُدھر تفریح طبع کے لئے اور اپنے لباس کی شان دکھانے کے لئے گشت لگاتے ہیں۔ اِن حضرات کا یہ خیال کہ اسکاوٹنگ ایک کھیل ہے۔ درست ہے۔ حقیقت میں اسکاوٹنگ ایک کھیل تو ہے مگر اس کے ساتھ ہی وہ ایک ایسا کھیل ہے جو ایک بیقاعدہ تعلیم سے کہیں زیادہ مفید نتائج ملک و مالک کے سچے بہی خواہوں کی صورت میں پیدا کرتا ہے۔ جو ملکی ترقی کا باعث ہوتے ہیں۔ اور جن کی اب ملک کو سخت ضرورت ہے اگر دنیا کی موجودہ تہذیب کی برق رفتاری پر نظر ڈالی جائے تو پتہ چلے گا کہ عہد موجود نے اپنی ایجاد سمجھ کر بہت سے کام دنیا کے سامنے پیش کئے اور کر رہا ہے مگر ان میں سے اکثر زمانہ قدیم میں موجود تھے اور ایک معمولی دماغ کی محنت کا نتیجہ سمجھے جاتے تھے۔ زمانہ قدیم کے بعض دستوروں پر ہم اب تک ہنستے ہیں مگر جوں جوں زمانہ ترقی کرتا جاتا ہے باریک بینوں اور موجدوں کو یہ دیکھکر بڑی پشیمانی ہوتی ہے کہ جن چیزوں کو وہ اپنے دماغ کی ان تھک محنتوں کا نتیجہ سمجھتے تھے وہ پہلے ہی سے موجود تھیں۔ ہم نے دنیا میں آکر کوئی نیا کام نہیں کیا بلکہ ہم نے جو علوم وفنون نئے ایجاد کئے وہ پہلے سے تھے بلکہ آج سے زیادہ اچھی حالت میں تھے جو ہماری غفلت شعاری اور سہل انگاری کا شکار ہو کر کتم عدم میں پنہاں ہو گئے اور اب یکے بعد دیگرے ایجادات کی صورت میں ظاہر ہو رہے ہیں۔

اسکاوٹنگ کو عام طرز زندگی سے ممتاز اور ارفع و اعلیٰ ثابت کرنے کے لئے اس میں بہت سی خاص باتیں اختیار کی گئی ہیں چنانچہ اسکاوٹ لڑکوں کا ایک خاص لباس ہے ان کا سلام جداگانہ ہے۔ اِن کے ہاتھ ملانے کا طریقہ بھی انوکھا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی خیال رہے کہ لباس۔ سلام۔ اور ہاتھ ملانے کے طریقے جو جدا کر لئے گئے ہیں وہ صرف خصوصیت کی خاطر نہیں۔ بلکہ ان میں بھی کئی فوائد ہیں۔ اسکاوٹس کا شملا ان کی قمیصوں کی

بڑی بڑی جیبین ان کا بلٹ۔ ان کی رسّی۔ سیٹی۔ چاقو۔ یہ کئی کاموں میں مفید ثابت ہوئے ہیں
ان کا سلام اسکاوٹنگ کے بڑے "تین" وعدوں کو یاد دلاتا ہے۔ اور اس قسم کا سلام
اس وجہ سے رائج کیا گیا تاکہ ایک اسکاوٹ اپنے دوسرے بھائی اسکاوٹ کو فوراً
تمیز کرلے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ فائدہ بھی ہے کہ کسی چیز کی ہمیشہ کی یاد دہانی ضرور
پائدار اثر رکھتی ہے۔ اگر پتھر پر پانی کی بوند روزانہ ایک ہی جگہ گرا کرے تو وہ بھی باوجود
اپنی بے بضاعتی کے اثر کئے بغیر نہیں رہتی۔ اور اس کے متواتر اور مکرر گرتے رہنے کی وجہ سے نتیجہ یہ
ہوتا ہے کہ وہ تھوڑے دنوں کے بعد پتھر جیسی چیز میں سوراخ کر دیتی ہے۔ یہی حالت اسکاوٹس
سلام کی ہے، روزانہ اگر کسی شخص کو کسی خاص وعدہ کی طرف یا کسی قسم کی پابندی کی طرف
اشارۃً وکنایۃً متنبہ کیا جائے تو اس کا ضرور اثر ہوتا ہے۔ چنانچہ ہند میں بعض اقوام
اب تک ایسی ہیں جن کے سلام معمولی آپ کے ہمارے سلام نہیں ہوتے۔ بلکہ ان کے
سلام میں اِن وعدوں کا اور ارادوں کا اعادہ ہوتا ہے جو کئی صدی قبل اس قوم کے
گروؤں نے کئے تھے۔ اور جس کا پورا کرنا ہر شخص پر فرض ہوتا ہے، اس تحریک سے پہلے کی
دوسری اس سے زیادہ اہم تحریکوں کے نتیجہ خیز۔ عبرت انگیز۔ انجام کو دیکھکر یہ بات
اختیار کی گئی کہ اس تحریک میں ایسی باتیں داخل کی جائیں جو اس میں خصوصیت پیدا کر کے
اُس کو ایک خاص چیز بنا لیں۔

اسکاوٹنگ کی تاریخ سب سے پہلے جنہوں نے ۱۸ یا ۱۹ سال قبل اس تحریک کو دنیا میں
پیش کیا وہ سر رابرٹ بیڈن پاول ہیں۔

صاحب موصوف کو جب کہ وہ افریقہ کے ایک مقام میفکنگ پر کپتان تھے بور
قوم نے گھیر لیا۔ اس زمانہ میں ان کو پیغام رسانی اور دوسرے کاموں کے لئے آدمیوں کی
قلت کی وجہ سے سخت تکلیف ہوئی۔ صاحب موصوف نے گاؤں کے بچوں کو پیغام رسانی
اور دیگر اہم امور کی تربیت دی۔ انہوں نے اس تربیت کو بیحد کارآمد پایا۔ جب وہ وہاں سے نکلے

واپس آئے تو انہوں نے اس تحریک و تربیت کو امن کے زمانہ میں پھیلانے کی کوشش کی۔ اس غرض کے لئے انہوں نے تجربتاً سنہ ۱۹۰۷ء میں جزائر براؤن میں ایک اسکاؤٹ کیمپ ڈالا جس میں انہوں نے کامیابی حاصل کی۔ چنانچہ اس کے بعد انہوں نے اس فن پر پہلی کتاب سنہ ۱۹۰۸ء میں لکھی تاکہ دوسرے لوگ بھی اس سے واقف ہوں۔ اس کتاب نے جادو کا اثر کیا اور اہل ملک نے ان کی صدا کو لبیک کہا۔

امریکہ کے باشندوں کا یہ خاصہ رہا ہے کہ پہلے وہ کسی چیز کو نہایت باریکی اور تعمق سے سیکھتے ہیں اور سیکھنے کے بعد اس میں اتنی گلکاریاں کرتے ہیں اور ایسی ترقی دیتے ہیں کہ وہ چیز بالکل ان کی ہو رہتی ہے۔ انگلستان کے بعد امریکہ نے اس کی طرف توجہ کی۔ چکاگو کے باشندے ڈبلیو۔ڈی۔ باکس جب کہ وہ انگلستان میں مقیم تھے۔ ایک دفعہ راستہ بھول گئے ہوں وہ ایک سڑک پر پریشان کھڑے تھے کہ ان کی طرف ایک کم عمر بچہ بڑھا اور اس نے ان سے ان کی پریشانی کی وجہ دریافت کی جس پر صاحب موصوف نے فرمایا کہ میں راستہ بھول گیا ہوں بچہ نے اُن سے پتہ دریافت کیا اور لندن کی پیچ در پیچ گلیوں میں سے ہو کر اُن کو ان کے گھر پہونچا دیا۔ مسٹر باکس کو اس کم عمر لڑکے کی خدمت اور جسارت بیحد بھلی معلوم ہوئی گھر پہونچنے پر صاحب موصوف نے انعام دینے کی خاطر جیب میں ہاتھ ڈالا جس کا عام طور پر یورپ کے ممالک میں رواج ہے۔ لڑکے نے نہایت باقاعدگی سے سلام کیا اور انعام کے لینے سے انکار کیا۔ مسٹر باکس نے اس کی وجہ دریافت کی۔ اس لڑکے نے کہا کہ وہ ایک اسکاؤٹ ہے۔ اور یہ کہ انسانی ہمدردی کی خاطر یہ کام کیا کسی انعام کے لالچ کی خاطر نہیں اس پر مسٹر باکس نے اسکاؤٹنگ کے متعلق دریافت کرنا شروع کیا کہ وہ کیا چیز ہے‘ وہ لڑکا ان کو اسکاؤٹس کے صدر دفتر پرلے گیا۔ جہاں سے انہوں نے بہت سی کتابیں اس تحریک کے متعلق حاصل کیں۔ اور ان کتابوں کو وطن لے جاکر صاحب موصوف نے اہل ملک کو اس سے آگاہ کیا اہل ملک نے اس تحریک کو سر آنکھوں پر لیا۔ اور اس طرح سے اس کا رواج

امریکہ میں سنہ ۱۹۱۰ء میں ہوا گزشتہ دس سال کے عرصہ میں ہندوستان میں اسکاؤٹنگ کی کافی اشاعت ہوگئی ہے۔

اسکاؤٹنگ کی حقیقت و مقاصد

اسکاؤٹنگ ایک ایسا کھیل ہے جس میں کھیل کے ذریعہ ملک کی نوجوان ہونہار پود کو اچھے باشندے بننے اور ملک و قوم کی خدمت اور مالک کی وفاداری کے سبق نہایت لطیف اور دلچسپ پیرایہ میں دیئے جاتے ہیں اس تحریک نے ملک پر بڑا زبردست احسان کیا۔ اِس لئے کہ جو تعلیم مدرسوں کے کند اور تاریک حجروں میں دی جاتی ہے اس سے اتنے مفید نتائج نہیں برآمد ہو سکتے۔ جتنے کہ اس تربیت سے ہوسکتے ہیں تمام لوگ اس سے واقف ہیں کہ زمانہ قدیم کے بڑے بڑے معلم افلاطون۔ جالینوس۔ لقمان ارسطو وغیرہ اپنے طالب علموں کو کسی حجرہ میں تعلیم نہیں دیتے تھے بلکہ ان کی تربیت و تعلیم سبزہ زاروں میں۔ ہرے بھرے جھاڑوں کے نیچے ہوتی تھی۔اسی اصول کو اسکاؤٹنگ میں بھی اختیار کیا گیا۔ یہ ایک ایسی تحریک ہے جو کسی خاص مذہب اور سیاست سے بالکل بری ہے اس کا مقصد مخلوق خدا کو آرام پہونچانا اور اپنے آپ کو ہر طرح سے اچھی حالت میں رکھنا ہے۔ چنانچہ ایک اسکاؤٹ کو اس زمرہ میں داخل ہونے کے قبل قسم کھانی پڑتی ہے کہ وہ خدا۔ بادشاہ اور ملک کے فرایض ادا کرے گا۔ اسکاؤٹ کے قوانین کی پابندی کرے گا۔ اور ہر ذی روح کی مدد کرے گا اور اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنی اخلاقی۔ دماغی اور جسمانی حالت کو بھی اچھی حالت میں رکھے گا۔

اسکاؤٹنگ کے چار زبردست اصول ہیں۔ (۱) اخلاق کی درستی (۲) خدمت (ملکی اور قومی) (۳) صناعی تعلیم (۴) جسم کی حفاظت۔ یہ چاروں باتیں جس شخص میں پائی جاتی ہیں وہ "اچھا باشندہ" کہلانے کا مستحق ہے۔

طلبا میں افعال سیئہ سے گریز اور اعمال حسنہ سے انس پیدا کرنا اسکاؤٹنگ کا سب سے پہلا فرض ہے۔ یہ خوبیاں طلبہ میں کئی طرح سے پیدا کی جاتی ہیں تمام اخلاقی برائیوں کو

دفع کرنے کے لئے اسکاؤٹنگ میں سب سے اعلیٰ قسم کا اور سب سے مفید حربہ کھیل سمجھا گیا ہے اس لئے کہ بچپن کے کھیلوں میں جو خراب جذبات بچوں کی طبیعتوں میں راسخ ہو جاتے ہیں۔ وہی جذبات آگے چلکر جوانی کے زمانہ میں اس بچہ کی طبیعت ثانیہ بن جاتے ہیں اور ایسی صورت میں ان کا دفعیہ تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے۔ انگریزی میں ایک مثل مشہور ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جوانی کے زمانہ میں انسان میں وہی خصوصیات اور جذبات پائے جاتے ہیں جو اس میں لڑکپن سے ہوتے ہیں۔ بچوں میں اچھے جذبات پیدا کرنے کی خاطر مختلف قسم کے کھیل سکاؤٹنگ میں کھلائے جاتے ہیں اور ان کھیلوں کے ذریعہ سے طلباء کی دماغی تربیت ہوتی ہے۔ اور جسمانی حالت کا درست ہونا تو لازمات سے ہے۔ انہیں کھیلوں کے ذریعہ سے طلباء کو بردباری تحمل، غصہ کا ضبط کرنا۔ حسد کا مادہ دور کرنا اور رشک کا مادہ پیدا کرنا۔ غرض اسی قبیل کی اور اچھی عادتوں کا عادی بنایا جاتا ہے۔ اسکاؤٹنگ کے کھیل خاص خاص قواعد اور اصولوں پر مبنی ہیں جن سے مندرجہ بالا اعمال حسنہ کی ترغیب ہوتی ہے۔

اسکاؤٹنگ میں تمام کھیل ایسے کھلائے جاتے ہیں جن کی وجہ سے طلباء میں اتفاق واتحاد پیدا ہو۔ اس کے تمام کھیل ایسے ہوتے ہیں جس میں کوئی طالب علم خاموش نہیں رہتا بلکہ ہر ایک طالب علم کچھ نہ کچھ ضرور کرتا رہتا ہے۔ ایسے کھیلوں کے ذریعہ بچوں میں قومیت کی روح پھونکی جاتی ہے اور ان سے خود غرضی کا مادہ دور کیا جاتا ہے۔ ہر بچہ کے دل میں یہ جذبات پیدا کئے جاتے ہیں کہ وہ مخالف کی کمزوریوں سے فائدہ نہ اٹھائے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ خیال بھی اس کے دل میں پیدا کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے کالج یا اسکول کے لئے کھیل رہا ہے صرف اپنی خاطر نہیں۔

یہی جذبات آگے چلکر ترقی کرتے کرتے انسان کے دلوں میں اپنے ملک اور اپنی قوم کی محبت اور ہمدردی اور ایثار کا مادہ پیدا کرتے ہیں بعض کھیل ایسے کھلائے جاتے ہیں جس میں ایک جماعت کو دوسری جماعت کا پتہ چلانا پڑتا ہے۔ جو جماعت پہلے جاتی ہے

وہ اپنے راستہ پر نشان بناتی جاتی ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ دوسری جماعت کو غلط راستہ پر لگانے کے لئے بعض جگہ ایک سے زیادہ راستوں پر نشانات بناتی جاتی ہے۔ جو جماعت بعد میں ان کی تلاش میں جاتی ہے اس کے افراد کو نہایت احتیاط سے جانا پڑتا ہے اور ان نشانات اور علامات کو دیکھنے بھالنے میں غور کی ضرورت لاحق ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ بعض دفعہ ان کو چھپ کر جانا پڑتا ہے کہ کہیں دوسری جماعت جو ان کے گھات میں چھپی بیٹھی رہتی ہے ان کا پتہ نہ چلالے۔ غرض اسی طرح کے سینکڑوں کھیل ہیں جن سے بچوں کی جسمانی دماغی اور اخلاقی تربیت ہوتی ہے ایک اسکاوٹ رات دن ملکی خدمت کے لئے تیار رہتا ہے۔ یہ اس کا فرض اولین ہے کہ کسی اہم قومی یا ملکی ضرورت کے موقع پر کسی کے بلانے کا یا آدمی بھیجنے کا انتظار نہ کرے بلکہ بلا کسی طلب کے موقع پر پہونچ کر قوم اور ملک کی مدد کرے اور ایسے مواقع پر اسکاوٹ جو مدد کرے گا۔ وہ عام لوگوں کی مدد سے زیادہ سودمند اور باقاعدہ ہوگی۔

ممکن ہے کہ بعض حضرات یہ فرمائیں کہ ہم بھی ملکی خدمت کرتے ہیں۔ بیماروں کی دیکھ بھال کرتے ہیں مصیبت زدہ لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ ایسے حضرات کی مدد بعض دفعہ نادانی کی دوستی ثابت ہوتی ہے جو بجائے فائدے کے نقصان پہونچاتی ہے ہم اکثر یہ واقعات دیکھتے ہیں کہ سڑکوں پر اگر کوئی سیکل سوار سیکل سے گرتا ہے یا اور کوئی حادثہ ہوتا ہے تو ایسے وقت میں اکثر ہمدرد حضرات آبدیدہ ہو کر متضرر کے آس پاس جمع ہو جاتے ہیں اور آپس میں مشورے ہوتے رہتے ہیں کہ اب کیا کرنا چاہئے۔ مگر بدقسمتی سے کوئی ان کو عملاً کام میں نہیں لاتا یہاں تک کہ اکثر دفعہ یہ دیر مریض کے لئے نہایت مہلک ثابت ہوتی اگرچہ ان حضرات نے ہمدردی کی مگر ان کی ہمدردی نے اس مریض کے لئے زہر ہلاہل کا کام کیا۔

اس کے برخلاف ایک اسکاوٹ ایسے موقع پر کبھی اس قسم کی لیت ولعل میں نہیں پڑ سکتا

سب سے پہلے وہ مریض کو کھلی ہوا میں پہونچانے کی کوشش کرے گا اس لئے کہ تمام امراض میں کھلی ہوا اکثر دواؤں سے زیادہ مفید کام کرتی ہے۔

اس کے بعد وہ مریض کے زخموں کو دیکھے گا اور جو خطرناک زخم یا ضربات ہوں گے اپنے اسکارف کی مدد سے جو ہمیشہ اس کے گلے میں پڑا رہتا ہے۔ ان کو باندھنے کی کوشش کرے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ اگر مریض کے جسم سے خون جاری ہو تو وہ فوراً ایک نظر میں پہچان لے گا کہ آیا مریض کی شریانوں کو صدمہ پہونچا ہے یا ورید کو۔ ان تمام باتوں کے کرنے کے بعد وہ مریض کو ایسی حالت میں بٹھا دے گا یا لٹا دے گا جو اس کے لئے آرام دہ ہو اور اس کے بعد وہ فوراً اس کو رجوع شفاخانہ کردے گا۔ اسی قسم کی سینکڑوں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں کہ ایک معلومات رکھنے والے شخص کی مدد نے بہ نسبت دوسرے غیر معلومات والے حضرات کی بے اصول ہمدردی کے زیادہ لوگوں کو فائدہ پہونچایا۔ ان تمام مفید باتوں کے ساتھ ساتھ اسکاؤٹنگ میں تمام پیشے سکھائے جاتے ہیں تاکہ ایک اسکاؤٹ غربت اور عدم ملازمت کی وجہ سے ملک اور قوم پر بار نہ ہو۔ نجاری۔ معماری۔ بوٹ سازی۔ جالی بننا۔ رنگ سازی غرض اس قسم کے اور بہت سے پیشے سکھائے جاتے ہیں۔ ان کو پیشے میں کامیاب ہونے کے بعد تمغہ جات دئے جاتے ہیں۔

لندن کے ایک اسکاوٹس لیڈر کے پاس جوتے کے کام کا بیج دیکھا گیا۔ لوگوں نے اس سے وجہ دریافت کی کہ دوسرے اچھے پیشے چھوڑ کر تم نے یہ پیشہ کیوں اختیار کیا اس نے جواب دیا کہ میرے ٹرول کے تمام لڑکے غریب ہیں ان کے والدین کے پاس اتنا پیسہ نہیں کہ کہیں شہر سے باہر جانے کے لئے وہ ٹرام کا کرایہ دے سکیں اور نہ ان کے والدین ان کو ہفتہ کے روز باہر جانے کی اجازت دیتے ہیں اس لئے کہ خدشہ ہے کہ کہیں ان کے بچوں کے جوتوں کے تلے گھس کر جلد نہ پھٹ جائیں۔ ان مشکلوں کو رفع کرنے کی خاطر اور ان بچوں کے جوتوں کی ٹھیک کرنے کی خاطر میں نے یہ پیشہ اختیار کیا اگر میں ایسا نہ کرتا تو میرے کام میں مجھے کامیابی

امید نہ تھی اس مثال کو دیکھکر یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب کم سنی میں اپنی جماعت کی اتنی محبت ہے تو ایسی ہستی کے بڑھنے کے بعد اس سے ملک اور قوم کو کتنا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

ایک اسکاوٹ کے فرائض میں ہے کہ وہ اپنے بادشاہ۔ اپنے لیڈر۔ اور اپنے ماں۔ باپ۔ کی اطاعت اور خدمت کرے جس کے سبق اور جس کی یاد دہانی ایسے روزانہ کام شروع ہونے کے قبل کرائی جاتی ہے۔

کام شروع ہونے کے قبل تمام اسکاوٹ اپنے ملک کے جھنڈے کے اطراف جمع ہوتے ہیں۔ اور جب وہ جھنڈا کھولا جاتا ہے تو اُن کا فرض ہے کہ وہ اس کو سلام کریں اسی طرح جب کبھی وہ جھنڈا اتارا جاتا ہے تو اُن کا فرض ہے کہ وہ اس وقت بھی سلام کریں ایک اسکاوٹ کو ادنیٰ سے ادنیٰ کام کرنے کے لئے عار نہیں ہو سکتا بشرطیکہ وہ قوم، ملک اور افراد قوم کے فائدہ کا ہو۔ اگر کسی شرک کی مہری بند ہو گئی ہو جس سے خلق اللہ کی صحت کو نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہو تو ایک اسکاوٹ لیڈر اپنی جماعت کو لیکر اس کی صفائی میں مصروف ہو جائے گا۔ اگر لوگ اس پر ہنستے ہیں تو وہ اس کی کبھی پرواہ نہ کرے گا اس لئے کہ وہ ایک اہم قومی مفاد کا کام کر رہا ہے۔ اور جو لوگ ہنستے ہیں وہ نادان ہیں اور نادان آدمی قابل معافی ہوتے ہیں۔ اگر کبھی میلہ یا کوئی اور مذہبی جلسہ ہو تو اس اسکاوٹ پارٹی کا جو اس حصہ سے قریب ہو فرض ہو گا کہ وہ موقع پر پہونچ کر وہاں کے لوگوں کی جان و مال کی حفاظت کرے۔ جو بچے گم ہو جائیں۔ ان کو ان کے ماں باپ کے پاس پہونچائے اور جن لوگوں کی چیزیں چھوٹ گئی ہوں ان کو ان کے مالکوں تک پہونچائے۔

یہ ایک ایسا وسیع مضمون ہے جس پر کئی کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور ابھی اس میں اتنا مواد ہے کہ اس پر اور کتابیں لکھی جا سکتی ہیں، یہ مضمون اس غرض سے لکھا گیا ہے کہ وہ حضرات جو اسکاوٹنگ سے واقف نہیں ان کو اس کے متعلق سرسری معلومات ہو جائیں

متفرقات

موجودہ تعلیمی ضروریات: تعلیمی عمر کے ہر بچہ کو بلا استثنا کسی نہ کسی تعلیم گاہ میں داخل ہو جانا پر ضرور ہے اور اس جانب پوری پوری توجہ بحد سرگرمی کے ساتھ کی جانی چاہئے بلکہ اگر مناسب ہو تو مصارف کا سوال حل کرنے کے لئے مزید ٹیکس بھی لگایا جاسکتا ہے تاکہ آیندہ نسل کے لئے ابتدائی تعلیم کا ایک بہترین لائحہ عمل تیار کرایا جاسکے۔ اس غرض سے اگر ۵ پیسہ فی روپیہ وصول کیا جائے تو ایک عمدہ اسکیم بروئے عمل لائی جاسکتی ہے۔ ابتدائی عام تعلیم کے ساتھ ساتھ ایک مخصوص زراعتی نصاب کی بھی سخت ضرورت ہے جس کے بغیر اہل فلاحت پوری طور پر اپنی حرفت سے متمتع نہیں ہو سکتے اور دیہاتی حصۂ آبادی کا سخت نقصان ہوتا ہے۔

اس ضمن میں طبقۂ معلمین کی باقاعدہ محنت نیز ان کی ہمت افزائی کی بھی بہت بڑی ضرورت ہے عمدہ اساتذہ کے بہم پہونچانے میں اکثر تنخواہ کا سوال پیدا ہو جاتا ہے اور تا وقتیکہ معقول تنخواہ نہ ہو عمدہ مدرسین کا ملنا علی الخصوص آج کل دشوار بھی ہے۔ اساتذہ کی مختلف انجمنوں کا انعقاد بھی مجتمعاً تعلیمی مسائل پر غور کرنے اور ان کا حل سوچنے کے لئے بہت ضروری ہے اس قسم کی انجمنوں سے باہمی مشورہ کا بہت موقعہ مل سکتا ہے نیز عملۂ مدرسین میں بھی یہ خیال پیدا ہو جانا چاہئے کہ جہاں تک ہو انتظامی امور میں سہولت پیدا کر کے صدر مدرسین کو تعلیمی امور پر توجہ کرنے کا موقعہ دیں اور ایسی فضا پیدا ہونی چاہئے جس میں کشیدگی یا تعلقات کی ناخوشگواری پائی جاتی ہو۔ خانگی مدارس کی کامیابی کے لئے ان امور کے علاوہ اس امر کی بھی ضرورت ہے کہ انتظامی کمیٹی صدر مدرس کو ادائے فرائض میں ہر طرح کی سہولت بہم پہونچا دے۔

تعلیم نسواں کے متعلق جہاں تک اعلیٰ تعلیم کا تعلق ہے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ نسوانی و غیر نسوانی تعلیم میں کوئی خاص فرق نہیں ہے جنسی اعتبار سے جو تفریق کی جاتی ہے وہ نہایت سطحی ہے کیونکہ عورت

کے لئے تعلیم کا مقصود یہ قرار دینا کہ وہ ایک صرف عمدہ خانہ دار عورت بن سکے نہایت تنگ نظری
پر مبنی ہے تعلیم کا نفع اور برکات عام ہیں جن میں جنسی تفریق حائل نہیں ہو سکتی
(ماخوذ از خطبہ صدارت پروفیسر شی شادری اجلاس سوم انجمن صد مدرسین و اساتذہ احاطہ بمبئی)

نفس تعلیم

اہم ترین سوال یہ ہے کہ آیا ہماری تعلیمی یونیورسٹیاں کوئی "تعلیم" بھی دیتی ہیں؟
اس کے جواب کے لئے اولاً تعلیم کی تعریف معین کرنا ہوگی۔ اے جی سی لابن شاد اسپارٹا کا مقولہ
تعلیم کی نسبت یہ ہے کہ "وہ ایک مکمل انسان بنا دینے کا مادہ رکھتی ہو" لیکن انسانی مقاصد حیات کے
اعتبار سے تعلیم کے تین حصے کرتا ہے اول یہ کہ خود شناسی اور دنیا شناسی کی قابلیت پیدا ہو
دوسرے یہ کہ وہ مسرت و خرمی کا باعث بنے تیسرے یہ کہ اپنی اور دنیا کی اصلاح و تعمیر کرے
دیکھنا یہ ہے کہ آیا ہندوستان کی موجودہ یونیورسٹیاں ایسے طلبا پیدا کرتی ہیں جو جسماً
توانا، اخلاقاً قابل، اور ذہناً تیز ہوں، ہر چند کہ ہماری یونیورسٹیوں نے چند لائق فائق ہستیاں
ضرور پیدا کر دی ہیں مگر زیادہ تر ایسے ہی لوگ ہیں جو ملازمت یا وکالت پیشہ ہیں اور ظاہر ہے کہ
یہ دونوں امور تعلیم کا مقصد نہیں قرار پا سکتے حقیقت یہ ہے کہ جدید ضروریات کے لحاظ سے
تعلیمی گردش پر کلیتاً از سر نو غور کرنے کی ضرورت ہے مزید براں واسطہ اجرائی تعلیم بھی آج
تعلیمی ہندوستان کا نہایت اہم مبحث ہے۔ مختلف ممالک میں تعلیم و تعلم کے جو مباحث اور
طریقے اختیار کئے گئے ہیں ان پر غور و تبصرہ بیکار ہے البتہ ایک امر متفقاً طے پا گیا ہے یعنی
ذریعہ تعلیم اپنی زبان ہونا چاہئے۔ ہم عطایائے فطرت سے اسی وقت متمتع ہو سکتے ہیں جبکہ
اس کے قوانین کی متابعت کریں نہ کہ مخالفت۔ ابتدائی تعلیم کے متعلق تو ذریعہ تعلیم کا مادری
زبان میں ہونا مسلم اور ضروری سمجھ لیا گیا ہے البتہ یونیورسٹی کی تعلیم میں بھی یہی ذریعہ قائم ہونا
قدرے تامل طلب ہے کتب نصابیہ کی عدم موجودگی کچہریوں میں غیر وطنی زبان کا مروج ہونا
وطنی زبانوں میں علمی مواد کی بے بضاعتی اور سب سے بڑھ کر متعدد وطنی زبانوں کا موجود ہونا

اس مسئلہ کے حل ہونے میں سد راہ ہیں۔

یونیورسٹی کی تعلیم کے متعلق دو اور بھی نہایت اہم مسائل ہیں اول تو خصوصی تعلیم کا مسئلہ ہے۔ ہماری یونیورسٹیوں میں طلبا کو کسی فن یا علم کی مہارت خصوصی کے لئے تیار نہیں کیا جاتا اور ان کا جملہ زمانۂ تعلیم مختلف مضامین کے مطالعہ کے نذر ہو جاتا ہے جن میں ان کا کمال ناقص رہجاتا ہے گویا مہارت و کمال کو تنوع اور بوقلمونی کی قربانگاہ پر چڑھا دیا جاتا ہے اسی امر کو سر آشوتوش مکرجی انجہانی نے بیس سال قبل ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ تا وقتیکہ ہماری یونیورسٹیاں متحققین اور مخصوصین فن طلبا اور پروفیسر نہ پیدا کریں اس وقت تک وہ حقیقی معنوں میں درس گاہ نہیں کہلائی جا سکتیں۔ دوسرا اس سے بھی بڑھکر مسئلہ اتحاد کی تعلیم کا ہے اس قسم کی تعلیم سے جو بے اعتنائی کی جا رہی ہے وہ ایسے ناگفتہ بہ نتائج پیدا کرے گی جو ہماری معاشرتی بنیادوں تک کو کھوکھلا کر دیں گے اتحاد و روا داری تعلیم کا سب سے پہلا اور بہترین ثمرہ ہے ہمارے طلبا کو باہمی اخوت کا خالص نمونہ بننا چاہئے اور اپنے طرز عمل کا ہر قدم ملک کی ترقی کی جانب بڑھانا چاہئے۔ اگر تعلیم کا ملخص یہی قرار پا گیا کہ مذہب کے نام سے ہر قسم کی تنگ نظری کوتاہ بینی "لامذہبی" کا ارتکاب کرکے حیوانیت کے بدترین مظاہر کا تماشہ دنیا کو دکھلایا جائے تو ہمارے نوجوانوں سے مادر وطن کو کوئی امید نہیں رکھنا چاہئے۔ ہمارے نوجوانوں کو ہر قسم کے نفاق بدظنی اور تعصب کو کچل دینا چاہئے یہی ماحصل تعلیم ہے

ماخوذ از تقریر جناب سلطان احمد صاحب (کانووکیشن آف مسلم یونیورسٹی علیگڑھ)

مراسلات

پونہ کی زراعتی نمائش

ناظرین رسالۂ ہذا غالباً باخبر ہوں گے کہ حکومت بمبئی کی جانب سے ایک زراعتی نمائش حال ہی میں بمقام پونہ منعقد ہوئی تھی، میں تعلیمی نقطۂ نظر سے مجملاً وہاں کے حالات بیان کرنیکے بعد اُن خیالات کو جو اس عظیم الشان نمائش کو دیکھنے سے میرے دل میں جاگزیں ہوئے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ پونہ کے زراعتی کالج کے میدان میں نمائش کے مختلف شعبوں کے مظاہرات کا علٰحدہ علٰحدہ انتظام کیا گیا تھا مثلاً میدان نمائش آبرسانی، میدان نمائش آلات کشاورزی، میدان نمائش اتحاد باہمی میدان نمائش نیشکر وغیرہ

جو حضرات نمائش میں آئے تھے اُنمیں یا تو وہ لوگ تھے جو بطور خاص آئے تھے اور جن کو سبز رنگ کے علامتی نشانات دیے گئے تھے یا وہ حضرات تھے جو محض تفریحاً چلے آئے تھے البتہ اہم طبقہ وہاں پر ملک کے مزارعین اور کسانوں کا تھا جن کو سرخ رنگ کا نشان دیا گیا تھا اور وہ ماہرین زراعت کے ہمراہ نمائش کی سیر مفت کر سکتے تھے۔

سب سے پہلی بات جو ایک دلدادۂ تعلیم کو اس نمائش میں گرانقدر زراعتی آلات مع دیگر ملحقات کو دیکھکر اپنی طرف متوجہ کر سکتی تھی وہ یہ تھی کہ آیا یہ تمام باتیں صرف نمائشی ہی نمائش ہیں یا واقعی اس سے کسی فائدہ کی امید ہے۔ اس لئے کہ جب تک اُن قیمتی زرعی آلات کے دیہات میں پہونچانے اور ان کے بہ سہولت وارزاں فراہم کرنے کا انتظام نہ کیا جائیگا اس قسم کی عملی نمائش کا فائدہ نہایت محدود رہے گا میں سمجھتا ہوں کہ اس کے لئے بہترین طریقہ یہ ہوگا کہ اس قسم کے آلات کرایہ پر بہم پہونچانے کا انتظام کیا جائے جیسا کہ بڑودہ نے آجکل

اس کے بعد یہی یہ دِقت باقی رہجاتی ہے کہ زراعت پیشہ طبقہ میں ان آلات کے صحیح استعمال؛ اور فن زراعت کے جدید ترین مذاق کو کیونکر پیدا کیا جائے جس کی بہترین صورت یہی ہوسکتی ہے کہ ایک مخصوص زراعتی اور دیہاتی نصاب کی تدوین کی جائے جو معمولی نوشت وخواند کے ساتھہی جدید زراعتی معلومات اور عملی ضرورتوں کو اپنے اندر لئے ہوئے ہو۔

از ڈنگر نارائن صاحب بی۔ اے
صدر مدرس مدرسہ وسطانیہ دارالشفا

رسید

اجلاس عالیہ انجمن اساتذہ گلبرگہ کی مفصل سالانہ رپورٹ رسالہ کے دفتر میں موصول ہوئی ہے اسپر آیندہ تبصرہ کیا جائے گا

نرخ اشتہارات حیدرآباد ٹیچر حسب ذیل ہے

مقدار	سال بھر	۶ ماہ	فی اشاعت
پورا صفحہ	ـــہ	صہ ر	ـــہ ر
نصف صفحہ	صہ ر	۸ عہ ۱۲ ر	۸ عہ ر
ربع صفحہ	۸ لعہ ر	۶ عہ ر	۱۲ ر
فی سطر	۱۰ ر	۸ ر	۶ ر

---

this nature, Sir Atul Chatterjee is confident that its students who propose to proceed out of India for further study will find their chances of admission to a good University and securing a degree there considerably improved, whilst they will be in a much better position to utilize opportunities and facilities open to all students in Europe and America.

[*Extract from an article contributed by* DR. HADFIELD, *London, to the WOMAN TEACHER of September 1926.*]

Education is no longer a system by which the child sits quietly while information is poured into its mind. Education now means the giving of opportunities and the bringing out of energies latent in the child's mind and directing them to right ends.

Education is not only an intellectual process. The true and highest education must deal not merely with the child's mind, but with the whole personality. Mental health means the full development of all impulsive tendencies directed towards a common end.

[*Extract from an article written by* PROF. COMPAGNAE *of Liverpool University to THE TEACHERS' WORLD of September 1926.*]

THE PURPOSE OF EDUCATION.

If you ask me what is the purpose of education I would say that it is to be expressed in words you have known from childhood. It is to be in the world but not of it, to be concerned in its activities, to be aware of its life, to contribute to its interests, to be quick and responsive, to be in it but to escape from it, not to be held by it, to be able to shed it, to drop it and let it go, and still to preserve what the world can neither give nor take away—your own integrity, your own hope, your own vigour, your own belief that, come what will and go what may, the good things will prevail.

life. The difficulty becomes specially acute in the large number of instances where an Indian student as a recognition of his Indian degree is allowed to shorten his course for a degree in this country by one or more years.

5. Apart from the question of securing good degrees at British Universities it is hardly necessary to emphasise that for Indian students who come to Europe for Western instruction in such subjects as Science, Economics, Education, etc., a reading knowledge of French or German, or preferably both, is essential if they are to return to India adequately equipped with a competent knowledge of modern European developments and trends of thought. There is evidence to show that Indian students are now coming in increasing numbers to work under well-known authorities in their special subjects, not only in this country but also in France and Germany, and it has been found that even Indian graduates with distinguished records at their own Universities have been obliged to take up the elementary study of French or German after their arrival in Europe.

6. The High Commissioner had no accurate knowledge of the facilities at present available at the Indian Universities for learning modern European languages, but he hopes that the authorities of Indian Universities will give due consideration to this matter. It is suggested that if no facilities exist at present, arrangements might possibly be made for special classes in one or more of the modern European languages such as French or German being provided for students who intend eventually to come to Europe for further study. Students who attend these classes and satisfactorily pass such tests as the University consider it desirable to impose may perhaps be furnished with an official certificate, definitely testifying to an adequate reading knowledge of the selected language or languages for submission to the British or European Universities to which admission is desired. If the Universities of India find it practicable to adopt a system of

At the Scottish Universities a test of the candidate's ability to translate from French and German is included as part of the Honours examination, whilst all students who look forward to reading for Honours or to engaging in research are very urgently recommended to acquire at as early a period in their course as possible such a knowledge of French and German as will enable them to read scientific works in these languages with ease.

In the University of Wales, French or German is required for the Honours examination in Pure Science.

3. These particulars have been given in some detail in order to emphasise the fact that a knowledge of at least one modern European language is required by practically every British University from students reading for degrees in various subjects.

It may also be pointed out that the Preliminary examinations of the various professional bodies (Medicine, Law, Accountancy, etc.) in this country similarly involve a knowledge of at least one modern language.

4. An English student as a general rule studies at least one modern European language before proceeding to a University. Consequently an English student is not unfavourably affected by the regulations relating to admission or the granting of degrees which have been referred to above. An Indian student on the other hand has usually no knowledge of any European language other than English on his arrival in this country. In the case of some Universities, such as Oxford, it is in such circumstances exceedingly difficult to secure his admission. In other Universities, the Indian student finds it necessary after admission to begin the study of an entirely new language. He is thus handicapped by having to take an extra subject at a time when all his energies are required for the course of study or training he has embarked upon under conditions entirely different from those to which he has become accustomed during his Indian University or college

Similar requirements are prescribed by the various Faculties at other Universities. Thus in the University of London the regulations for the Faculty of Economics, which Indian students join in considerable numbers, lay down that no candidate at the Intermediate Examination shall be approved in the subject of Economics unless he can show the capacity to read with intelligence either French or German, whilst in the Final B.Sc. (Economics) Examination one paper consists of two passages from French and German works for translation and comment, and candidates are required to satisfy the examiners in both these languages. At the Intermediate Examination in Science, questions are set involving the translation of passages in French or German, whilst for the Final B.Sc. Examination both French and German are required.

The Regulations for the Honours B.Sc. degree in Pure and in Applied Science at the Armstrong College (University of Durham) prescribe a paper in French or German and (in the case of Applied Science) Spanish or Italian, to test the candidate's ability to translate into English unseen passages from technical or scientific works in these languages.

In the University of Birmingham, candidates before being admitted to the degree of B.Sc. are required to pass an examination in French and German showing that they possess a knowledge sufficient to enable them to read scientific treatises or memoirs in these languages.

At the University of Manchester, candidates before sitting for the Final Eamination for the degree of B.Sc. must produce satisfactory evidence to the Faculty that they can read scientific literature in French or German or in any other language approved by the Faculty.

In the Final B.Sc. Examination, both Pass and Honours of the Universitiy of Leeds, a paper is set containing passages of French and German for translation into English relating to the principal subject or subjects of a candidate's decree course.

Copy of a letter No. Edn. S. 89/1, dated the 18th May 1926, A.D. from the Joint Secretary to the High Commissioner for India, Education Department, to the Vice-Chancellors of all Indian Universities.

The attention of the High Commissioner has recently been called to the increasing difficulties experienced by Indian students in this country in obtaining admission into British Universities and in securing good degrees owing to their ignorance, on the commencement of their studies here, of any modern European languages other than English.

2. A knowledge of at least one modern European language is generally required from all students entering Universities in this country. Indian students, otherwise well qualified, who are unable to produce satisfactory evidence in this respect, often find it difficult to secure admission to a good University Thus at the University of Oxford, the authorities are anxious that all students should pass the first Public Examination not later than the end of the first academic year. As a knowledge of French is necessary for this purpose, the colleges are most reluctant to consider for admission applicants who have not already attained a sufficient standard in this language, and who, if admitted, would have to begin an elementary course, necessitating private tuition and consequent sacrifice of time from the real degree work with which the colleges are naturally most concerned.

3. At Cambridge the prescribed courses of study for the various Tripos examinations naturally involve an adequate knowledge of French and German, as well as, in some cases, of Italian and Spanish.

Shah Ali Bunda Middle School.

Two meetings are reported from this branch. The Head-master of Madrasai Diniat opened the discussion on the "Co-operation of Parents and Teachers." He likened the boy to the hospital patient in whom the Doctor and nurse—that is, the teacher and the parent—must take a joint interest to ensure recovery. The same speaker had much to say in appreciation of drawing. He pointed out the usefulness of illustrations in books, the pleasure to be derived from Drawing and the commercial asset that Drawing can become to a nation.

Shah Gunj Middle School.

During the period under report only two meetings were held. In Aban the election of the incoming managing committee was held and the result declared. The second meeting was held during the first week of Azur 1336 Fasli. The subject was 'The teaching of Drawing,' which was thoroughly discussed from different standpoints and the cultural value of this art was made clear with a reference to its development during the reign of the Moghals. Mr. Mohsin Khan Mateen recited a poem, which was much appreciated.

an effective teacher it was necessary that one should learn drawing.

Nampally High School.

At the meetings held during the quarter ending with Aban, 1335 Fasli, " Co-operation between Parents and Teachers, " and " The Teaching of Drawing " were discussed. Mr. K. R. Chari, Head-Master of the Nampalli High School, had many practical suggestions to make on the former subject. It is of the highest importance to get the parents to realize their responsibilities. They should be made to understand that the child is imitative and that therefore they should always give good example in their homes. They should also be induced to come to the school and see it at work, and if that is not possible, an extra item on the fee-receipt forms giving a brief report of the boys' progress should help to awaken the interest of parents.

Residency Middle School.

The subject " Co-operation between Teachers and Parents " aroused keen interest among a large number of members and all the speakers were unanimous in holding that without this co-operation the work done by a teacher in the class would be undone outside the school. Various means for furthering such co-operation were suggested, such as, the Annual Prize Distribution and the sending of the Progress reports to the parents and guardians once a month. The next subject discussed was the " Teaching of Drawing. " The value of this subject for developing the powers of observation of the boys and the importance of teaching it from the earliest stages were clearly shown by various speakers. It was pointed out that particular attention should be paid to the correct posture of the boys and to the rays of light proceeding from the left. It was also demonstrated how black-board illustrations facilitate the understanding of stories and the subject-matter of the Readers by boys in the lower classes.

The subjects discussed were as follows :—

1. School Hygiene.
2. Co-operation of Parents and Teachers.
3. The Importance of Drawing in Schools.

The first meeting which was held on the 28th of July was by far the best of its kind. Dr. M. Bharatan, under the Chairmanship of Major M. G. Naidu, spoke for quite an hour, dealing with the various aspects of the subject, such as, the selection of suitable sites for school buildings and the way in which they should be built. He then referred to the absolute necessity of proper light and ventilation and up-to-date furniture. He also dwelt on the need for good drinking-water and the need for the constant supervision of urinals and lavatories. He next spoke about personal hygiene and its importance. He wound up by saying that an intimate knowledge of the principles of hygiene was a great asset to any teacher. It is needless to add that the lecture was highly informing and interesting. The members of the Islamiah and Bolarum Branches were present at this meeting.

Considerable interest is being evinced at these meetings, and the discussions have always been very profitable.

Mustaidpura Middle School.

The discussions on "Co-operation between Parents and Teachers" and "The Teaching of Drawing" were very interesting and fruitful. Mr. Jamiluddin suggested that as many opportunities as possible should be given to parents to visit the school attended by their children, while Mr. Shaik Ali Husain, B.A., Head-Master, Mustaidpura Middle School emphasised the need for sending quarterly progress reports to the parents. The discussion on the teaching of Drawing was opened by Mr. Abdul Wahed, Drawing Master, Mustaidpura Middle School, who showed how Drawing helped in other school subjects. In his concluding remarks, Mr. Shaik Ali Husain observed that to be

were the subjects discussed at the ordinary meetings. There was a useful interchange of opinions ; but the want of co-operation on the part of parents was deplored by all.

Gosha Mahal Middle School.

Messrs. Abdul Hakeem, Azimuddin and Turab Ali who spoke on the subject of " Co-operation between Parents and Teachers " stressed the point that the aim of education would not be achieved if the parents did not take a special interest in moulding the character of their children.

" The Teaching of Drawing " was the subject for Aban. Messrs. Ghiasuddin and Ghulam Mahboob explained how a dry subject could be made interesting with the aid of Drawing.

Islamia High School, Secunderabad.

Speaking about the relationship between ' Parents and Teachers, ' Mr. P. Subramania Iyer of the Islamia High School regretted the absence of co-operation between them at the present time and suggested that meetings of the two parties should be arranged at least twice a year to discuss the progress and welfare of the boys concerned. At the second meeting, specimens of drawing in the Primary classes were shown and much appreciated. The speeches were made in English, Urdu and Telegu. Speeches in the vernaculars appealed more to the majority of the members than those in English.

During the quarter, there has been no increase in membership. All the arrears of subscription have been collected and the sum of O. S. Rs. 20-2-0 has been deposited with the Treasurer. This branch of the Association welcomes and appreciates the appearance of the journal, ' The Hyderabad Teacher. '

Mahbub College, Secunderabad.

Since the last report was submitted, there have been in all three meetings.

School, explained the value and method of instruction in Drawing respectively.

The Darul Uloom High School.

During the quarter ending with Aban, 1335 Fasli, two monthly meetings were held at this centre. At the first meeting the subject discussed was 'Co-operation between teachers and guardians.' A good many members took part in the interesting discussion that took place on this occasion. Eventually it was resolved that schools affiliated to this centre should try and work out a few practical suggestions which the members present agreed in regarding as likely to be useful. At the second meeting the discussion was largely theoretical. But before the break-up of the meeting, it was pointed out that other schools might follow with profit the example of the Primary Department of Darul Uloom, where co-ordination between Drawing and other subjects had resulted in keener interset in the subject on the part of boys.

Darus Shafa Middle School.

The members are taking more interest in the discussions and trying to make the meetings successful. The subjects discussed were "Co-operation between Parents and Teachers" and the "Teaching of Drawing." In connection with the latter subject, one of the speakers laid special stress on the establishment of a School of Arts in our Dominions on the same lines as the Bombay J. J. School of Arts.

Golconda Middle School.

The Golconda Branch held two meetings during the last four months of the year 1335 Fasli. In Shahrewar the members were invited to attend a lecture on "School. Hygiene and First Aid" at the Methodist Boys' High School which they found most interesting and practical. 'Parental Co-operation' and 'The Teaching of Drawing'

future, arrangements might be made to have the books in the library of the Normal School or in the Educational Office accessible to the members of the various branches."

Chaderghat High School.

As the substance of the Rev. Father Ryan's paper appears as a separate article in this issue of the magazine, we refer our readers to it. The Rev. Mr. Dudley, Principal of St. George's Grammar School, pleaded for a magazine for parents dealing in simple language with school affairs, while Mr. Hari Har Aiyar, B.A., 1st Assistant, Chaderghat High School, strongly advocated frequent interviews between parents and teachers at the school.

At the meeting on Thursday, 2nd Azur 1336 Fasli, the topic for discussion was "The advantages of Physical Education." This was in the capable hands of Mr. C. G. Goodwin, Secretary of the local branch of the Y. M. C. A. Mr. Goodwin's contribution to the discussion is printed on another page of this number. Various members advocated an increase of interest in English and Indian games on the part of the boys. Drill too must be looked upon as an important subject of the curriculum. Mr. Pickthall summing up said that there was no school so poor that it could not afford facilities for Indian games, which really required no costly apparatus, and which naturally appealed very strongly to Indian boys.

Chanchalguda Middle School.

At a meeting held on the 27th Mehir, 1335 Fasli, various measures for promoting co-operation between teachers and parents were considered. The importance of frequent interviews between parents and teachers, especially for improving the attendance of schools, was clearly shown by many of those who took part in the discussion. At the second meeting of the quarter, Mr. Fasihuddin, Head-Master of the Rain Bazar Primary School and Mr. Nooruddin, Drawing Master of the Chanchalguda Middle

The Hyderabad Teachers' Association.

BRANCH REPORTS FOR THE LAST QUARTER OF 1335 F.

A. V. High School, Bolarum.

THE programme drawn up by the Central Executive Committee of the Association was strictly followed. The attendance was good, as it never fell below 75 to 80 per cent.

In Shahrewar the members of this Branch attended a lecture on Hygiene organized by the Secunderabad Branch at the Mahbub College. The other subjects on the programme were considered and discussed in the A. V. School Hall on the dates appointed. The Secretary of the Branch presided over one meeting and the Head-Master of the Osmania School over the other. The subject of the relations between the Teachers and the Parents excited considerable interest. Every one present seemed to feel the need for the co-operation of parents in education.

Discussions in this Branch are carried on in all the languages taught here, *viz.*, English, Urdu, Telugu and Tamil.

The Secretary concludes his report as follows :—

" In my opinion, the Association is proving useful ; but it will take time for the maximum advantage to accrue. Complete success depends upon the co-operation and interest of the members. A circulating library would be a great boon. If one could not be got together in the near

The batsman is the person who plays the ball by spelling the words asked until he is "out" in one of the following ways :—

Bowled out :—When he fails to attempt a word or commits two or more mistakes in the same word.

L. B. W :—When he puts an extra letter or syllable in the body of a word.

Stumped :—When he adds a letter or syllable at the end of a word.

Run-Out :-When by omitting a letter at the end, he fails to complete a word.

Hit-Wicket :—When he omits a letter at the beginning or in the bódy of a word.

Caught-Out :—When he mis-spells a word by substituting one letter for another.

A bye is scored for a no-ball or for dropping a catch.

A wide-run is scored for a wide-ball.

A run is scored for answering a word correctly.

A boundary is scored when the batsman is correct, but the bowler is wrong.

An over-boundary is scored when the batsman spells a homonym correctly, but the bowler contradicts him.

Dropping a catch, occurs when the batsman mis-spells a word but the bowler also fails to correct him.

A no-ball is a word that is not uttered slowly, distinctly, audibly and correctly.

A wide-ball is a word that is uncommon, technical, scientific, or out of portion for the batsman.

When all the eleven players of one XI are "Out," their score is counted and announced. After the game has gone through two innings, the result of the match is declared.

The game has only to be made known to the boys to gain for it wide popularity. The boys will learn in a pleasant way and assiduously practise the more difficult "shots" for a coming match.

6. Particle, Tropical.
7. Six-pence, Expense.
8. Market, Ticket.
9. Dying, Studying.
10. Exit, Exhibition.
11. College, Cottage.
12. Rabbit, Habit.

and many others, not to speak of the ignorance shown in writing homonyms such as "hear" for "here;" "their" for "there;" "soul" for "sole;" "stationary" for "stationery;" "knew" for "new;" "tail" for "tale;" "right" for "write" etc.

Just as the scientist tries to combat disease, in the same way educationists endeavour to find the remedy for bad spelling. One such remedy would be the introduction of the games, "Word Making and Word Taking" and "Spelling Cricket" which would both go to make the spelling less or more instructive and interesting to the boys and would also afford a welcome relief to the teacher.

Messrs. S. N. Kulkarni, B.A., L.T., and V. G. Bhave, B.A., L.T., of a High School in Nagpur have been trying their best to give these games a wider circulation and from the experience I have had of them in my own school, I can say that "spelling cricket" matches can do a world of good both in improving spelling and in creating a healthy, intellectual rivalry on the basis of sport.

"Spelling-Cricket" is played almost on the same lines as our usual cricket with a ball and bat. Two captains choose their respective elevens and toss for batting or bowling. Only one batsman at a time has to face the bowling, there being no runner as in the ordinary game. The terms may be defined as follows :—

The bowler is the person who bowls a word for spelling, six words making an "over."

this country frequently find it difficult to bring home to their pupils the importance of good spelling. Spelling is not a matter of individual taste and those days are gone when Queen Elizabeth could write " Burleigh " in sixteen different ways and " Sovereign " in eight different ways on one and the same page. The teacher must impress upon his students that spelling counts in getting an appointment and in making a good impression generally. What " manners " are in the interview, " spelling " is in the written application. It is said that " Manners " maketh man." One may add that good spelling combined with good manners maketh a complete man. The causes of bad good spelling among Indian students are, first of all, that English is a foreign language to them, in consequence of which they cannot easily pick up correct forms ; secondly, that they are accustomed to hearing a bad pronounciation of English and thirdly, that they sometimes suffer from physical defects affecting the nose, throat, mouth and ear.

The teacher of English gives his pupils constant practice in reading, copy-writing, transcription and dictation, for improving their spelling. Rules of spelling are so numerous and admit of so many exceptions that they cannot be easily taught. So he has to rest content with writing a number of examples of the same kind to fix the rule indirectly in the memory of the pupils ; for example, the following groups of words :—

" Writing," " Having," " Coming," and " Swimming," " Hitting," " Beginning," are to be presented before them time and again as occasion arises.

The following are some of the words that present a constant difficulty to our boys : —

1. Exceed, Precede.
2. Traveller, Suitor, Labour, Theatre.
3. Citizen, Surgeon, Captain, Artisan.
4. Resistance, Existence.
5. Permission, Recitation

English Spelling

BY

V. V. HARDIKAR,

Head-Master, V. V. High School.

CONSERVATISM is born and bred in the flesh of man, and all reforms—whether religious, social, or educational—are very tardily taken up. Many of the teaching members of the present day were taught English, I suppose, in the old familiar way of saying the names of the letter of the alphabet and then spelling words letter by letter. The deficiency and redundancy of the English alphabet, however, suggested a newer method, the Phonic method, based on the knowledge of the sounds of the letters ; but as one and the same letter has more than one sound, and as the vowel sounds are so different and complicated, children were given books with lessons in sentences wherein a vowel has the same sound throughout, such as "The fat rat is in the hat ;" "The fox is in the box ;" "The king has a ring ;" "The nun saw the sun." Such a reading lesson fixes the sound and the word in the memory of the students, no doubt, but the sentences become uninteresting and unnatural and at times take the colour of doggerel verses. Apart from artificiality, another defect of this phonic method is that it does not help the children to express what their minds are full of. Hence came the "Direct" or "Look and Say Method," which enables a child to speak a word first and then read it. Writing and spelling follow easily and naturally as a result of this rational system.

Bad spelling is the sad and bitter experience of all teachers and examiners, especially in India. Teachers in

ing Camp, which it must be owned was a big success. The scouters had conducted themselves with praiseworthy discipline and caught the true scout spirit in the course of their training. In an undertaking where so many circumstances have contributed to the success, it is hard for one to put one's finger on this or that and say the success is due to it, but in this case it can be safely affirmed that the success of the camp was in no small measure due to the sweet and sympathetic personality of Mr. Hadi, the organizing capacity of Mr. Ali Musa Raza, the silent and well-informed guidance of Mr. Sivan and the active and tactful management of Mr. Varanasi. It will be unjust to omit mention, in this connection, of the attitude of genuine interest and good discipline shown by the scouters, which went a long way to bringing about the success of the camp.

There is no doubt that the scout spirit has now caught in Hyderabad, and every day the love of scouting is increasing among boys and teachers. Only a little trouble is occasionally experienced here and there with the old-fashioned guardians of boys. Time is slowly ringing the death-knell of this conservatism, and it will not be long before an army of scouts and scouters will be found in the Hyderabad State fighting against lingering evils and working for the common weal of their fellow-subjects. With the active interest and support of men like Nawabs Hydar Nawaz Jung Bahadur and Masood Jung Bahadur, one feels confident that there is a bright future for Scouting in these Dominions.

" Sun-Shine," Cuckoo Patrol
Editor, ' Camp Bulletin ' and
Keeper of the Camp Log.

Principals of the City College and the Chaderghat High School. All the existing scout Troops of the city were also present. On the arrival of the President, the General Salute was sounded. After the march past, the scouters gave some displays in Tent-Making, Fire Rescue and First Aid. The troop then rallied round the flag and took vows, which done, the scouters were all formally invested by Mr. S. M. Hadi, Director of Boy Scouts. Nawab Hydar Nawaz Jung Bahadur gave away the certificates to the scouters. Mr. Hadi made a short speech giving a brief account of the camp and thanking the various gentlemen who had co-operated in the work. Nawab Hydar Nawaz Jung Bahadur addressed the scouters and exhorted them to keep before them the high ideals of citizenship and service, which the scout movement stands for.

Here ended formally the work of the Second Hyderabad Scout-Masters' Training camp, but a pleasanter function was yet to follow and that was the entertainment given by Mr. S. M. Hadi to the Troop. After the Investiture ceremony, the scouters were photographed with their instructors and the Director. They then adjourned to the latter's bungalow, where they were treated to refreshments and music. They must have appreciated the function immensely after the rough time they had had at Umda Sagar. Mr. Hadi's drawing-room was literally invaded by the scouters, his photo albums ransacked, his innumerable trophies subjected to a searching examination and himself pestered with endless interrogations regarding his sporting experiences in England and elsewhere.

This over, the scouters once more sat in horse-shoe fashion round their 'chiefs' in the open space before Mr. Hadi's bungalow to listen to their final words of advice and suggestion and to talk to one another about their future plans. This brought the function to a fitting close and the Troop dispersed with its wild patrol cries.

Such in brief was the nature of the activities that characterised the Second Hyderabad Scout-Masters' Train-

ing the camp opened, one who saw the campers clearing up shrubs and rolling down boulders in and round their tents and decorating their ' wigwams ' to gain points at the time of kit inspection, could have realized what hidden qualities scouting could bring out in a man. Without doubt, the scouters liked the experience very well and did not mind in the least the winds that threatened their tents with collapse, the showers that crept under their very pallets at night, nor even the snakes and scorpions that were occasional visitors in some of the tents. And one must not forget to mention the ' breakfasts' taken amidst bushes and boulders, and the ' lunches ' and ' dinners ' taken sitting under trees and fighting with the gnats. But more enjoyable than all these were the camp games and the swimming parades. The swimming in the lake was so attractive that it led even those who knew little of it to venture forth into deep waters, but, thank God, there were no drowning fatalities, and the whole thing passed off only with a ducking or two. On the third day, Mr. Syed Ali Akbar visited the camp and inspected all the tents along with Mr. Hadi.

Here in the camp too there were some discourses on and practice in scouting. On the second day there were written and practical tests. On the third day, after the usual items, some displays were held and the results of the test were announced, all receiving scout-master certificates, except 4 who got Assistant Scout-master certificates. The camp broke up at 5 P.M., after which the campers trotted away to the Railway station, a distance of 2 miles, bearing their kits on their backs.

The next day the Investiture ceremony was held on the Nizam College grounds, Nawab Hydar Nawaz Jung Bahadur presiding. A number of distinguished visitors were present on the occasion, prominent among whom were Nawabs Akbar Yar Jung Bahadur and Masood Jung Bahadur, the Divisional Inspector of Schools, and the

them in the right spirit. It could never have appeared even to a casual observer that they were only practising them in order to give practice to their pupils later on. Another thing which interested the scouters very much was the camp-fire, which came off almost every alternate night with its sing-song, pow-vow, mimicry and fun. During the 15 days of their scouting, the scouters had the pleasure of visiting the club-rooms of four different schools—the Dharmawant, the All Saints', the City Collegiate and the Chaderght schools, the last three of which arranged for camp-fires also on the occasion of these visits. Some of these camp-fire circles were attended by a few scouters of the last Golconda Training Camp; and Messrs. Ali Akbar and Ahmed Husain Khan, Divisional Inspector of Schools and Principal of the Darul Uloom High School respectively, great friends of scouting, did the scouters the honour of being piesent at one of their camp-fire circles and talking to them on some aspects of scouting. Mention must also be made of the "Camp Bulletin," edited by a member of the Cuckoo Patrol, which afforded a good deal of humour and fun to the campeis night after night as it was read out.

We now come to the most important and interesting item of the programme, the three days' camp at Umda Sagar, which was immensely enjoyed by the scouters, in spite of the fact that it was perhaps the first time for most of them to live in such strange circumstances. A truly romantic spot was chosen for the camp, the lake stretching away like a huge S from end to end and the craggy hills on all sides as far as the eye could see affording just the sort of background which a scout camp calls up to one's mind. The tents were pitched, some by the edge of the lake, and some on the crest of a hill that bounded the lake on one side. The flag was hoisted on a central spot; and it was certainly a sight to see the scouters doubling up downhill and uphill in response to whistles and bugles. The morn-

were from 7 to 9 A.M. and 4 to 7 P. M. The camp lasted for 18 days altogether, including the three days spent at Umda Sagar. The first fifteen days the classes were held at the Y. M. C. A. Head-quarters. The work went on with clock-like regularity from start to finish and a good deal of information and practice in scouting and scout-craft were imparted to the scouters, literally not one minute being allowed to go waste during this whole period. In addition to the discourses on scouting and practice given by the three instructors, the following special lectures were also arranged for :—

Four lectures on First Aid by Dr. Lateef Sayeed, M. B. Ch. (Edin.), a talk on ' How to deal with boys' by Mr. Syed Ali Akbar, B.A., (Cantab.), Divisional Inspector of Schools, and a lecture on the 'History of the Ruling Dynasty and Administration of Hyderabad State' by Mr. G. A. Chandavarkar, B. A., Head-master, Residency Middle School, and two talks on 'Games and how to play them' and 'Hygiene,' respectively, by Mr. S. M. Hadi, B.A., (Cantab.), Director of Boy Scouts.

The scouters evinced a good deal of interset in every item of the programme through which they were taken, and when the whole thing was over, there was expressed a desire from every quarter that the period of training might be prolonged by a few more days, if possible. But, although the organizers of the camp themselves had felt the desirability of extending the period of training, this was not possible, as it would have meant serious inconvenience to the work of the schools from which the scouters had come. The scouters certainly made the best use of the time at their disposal, and eagerly devoured every piece of instruction which was given to them during their training. Special efforts had been made to make the programme interesting for them. The games which they were made to play every evening were among the most enjoyable items of the camp, the scouters taking part in

The Second Hyderabad Scout Masters' Training Camp.

BY

G. S. P.

IT had been notified by the Director of Boy Scouts that the Second Scout Masters' Training Camp would commence on the 20th August and that the Head-masters of the various schools in the Dominions might send up the names of intending scouters. The response was very encouraging. Almost every secondary school in the Dominions sent up the names of its candidates, many of whom arrived before the authorities were ready with their arrangements to commence the work. But as it would have meant much inconvenience for those who came from the districts to be asked to go back and come again, the work was begun, scout-like, straightway. Within two days of starting the troop, it was complete and the total reached on the third day when the entries were stopped was forty, the number from the city far exceeding that from all the Districts put together. Among the scouters who received training were two M.A.'s and ten graduates. The troop was divided into five patrols—the Tigers, Hounds, Lions, Cats and Cuckoos.

From the very first day the work began in right earnest on the part both of the instructors and of the scouters. Messrs. Ali Musa Raza, T. N. Sivan and S. Varanasi, scouters of standing and experience, were placed in charge of the camp, Mr. Hadi himself constantly supervising the camp activities morning and evening. The hours of work

a minimum of supervision. It would also then be possible for teachers to set free their attention for those subjects and grades which essentially need personal instruction.

Another problem in connection with the Primary schools is to find occupation for those who are just beginning the alphabet. For these tiny children no formal instruction in the three R's is yet possible, though some type of individual work is desirable. This is proposed to be done by arranging about two dozen occupations or games. A great deal of useful Primary apparatus has been made by the Drawing Instructor of the Teachers' Training College, Dacca, with the help of Sub-Inspectors in training. Some of the apparatus has been described in my Hints to Primary Teachers already mentioned. These occupations relate to sorting of colour, shape or size, to pairing by colour, and to a lot of educational games including pieces of knock-down furniture.

The tiny children sit on mats at three-legged small sloping desks, the inner side of which is marked to be used as a number-board. These desks are handy and have been specially designed by the Teachers' colleges for the use of little children.

The children are free to use any occupation they like. As soon as they finish one they take up another. There is no interference about choice or time. The teacher for the first time has to pass round showing children how to use the "occupations." Sometimes a clever child is of help. Some of these games lend themselves to be played in a group. Thus these occupations are of value as a means of social training.

the normal rate. This means great economy of time and money.

(*c*) The system tends to lessen excessive teaching and develop a power of independent study and a sense of personal responsibility in young learners.

(*d*) The problem which needs serious thinking in connection with individualizing instructions in Primary classes is that one teacher has to look after the work of two, and more often, of four different classes. This is a problem which has yet remained unsolved. The solution that has been suggested by me in my Handbook to Primary teachers* seems so far the only one. It is by pairing classes as "teaching" and "supervision" classes with a properly framed time-table that very good results are obtained. Sub-Inspectors in training at the Teachers' Training College at Dacca are taught to do it, and students at the Chittagong Normal school were trained to do it in 1919–21. The difficulty is to avoid occupying the supervision class in merely routine tasks of little educational value. This difficulty is to a certain extent met by carefully designed assignments. In fact assignments are the essence of individual methods. Even in the lower forms fortnightly assignments managed much after the system of the Dalton Plan, minus its complications, seem to work extremely well. But the success depends upon the assignments which must be very carefully set and constantly modified in the light of experience. Complete sets of similar assignments have now been worked by me in Reading and Arithmetic. But they may still need to be modified at the end of the experiment before they can be issued as text-books. If the Department takes the necessary steps to put them in the hands of Primary children as text-books it would be then possible for them to work on in the supervision subjects by themselves with

*The Bengali and Burmese Versions of this English original which is a typed copy have been published. The publication of the Hindi and Urdu versions is being arranged.

Type 2. Filling up blanks.

Type 3. Thinking out and writing out answer which is the only correct one.

Type 4. Marking out False or True.

Purpose.

The purpose of the Hygiene lessons is—

(1) to acquaint beginners with the essentials of personal hygiene;

(2) to train them in the art of obtaining knowledge from a printed page.

Remarks about cost.

It has been pointed out that the system is costly. First, the Printed Assignments, if obtainable on sale, will be priced very much higher than the books available on the market. But the advantage in the shape of economy of time, energy and efficiency justifies the cost to those who can afford and who want better education. As for the mass, standardised Primers issued departmentally may be sold cheap. Primary Education is already free in certain Municipal areas.

Possibilities and advantages.

The work done by beginners is motivated by a careful record of the progress of the individual pupils in graphs for each subject in which the instruction has been individualized.

It is not yet time to say definitely anything about the results of the future of the scheme. But the following points so far appear in favour of the system—

(*a*) The individual methods are likely to produce the greatest results in the shortest time.

(*b*) The graphs so far drawn seem to show that progress under individual methods is about four times

Principles involved in grouping material.

The exercises to be done have been grouped in psychological units as assimilative material embodying the principles or processes to be learnt. The pupils have to face not the work of the term, but tasks psychologically connected or linked up. The individuals as a group are taught together only when new prinicples or processes are developed or when common difficulties are encountered. This is the work of "the Class period" mentioned above. Otherwise the pupils work independently and advance at their own rate. All work is done in the presence of the Governess and no home work is set.

The new principles and processes have been explained and illustrated so simply that very little help is needed from the teacher to enable the learners to grasp them.

Hygiene: The Assignments. The selected text-book has been marked into sections (§§) and questions set on each. The arrangements are nothing but a series of questions on the matter of the sections. These assignments are intended for those who have advanced in reading.

Procedure.

The Governess explains the questions set on each section. The pupils read and understand the questions from the assignment sheets. The next step for the pupils is to read through the section in the text-book (of which each pupil has a copy provided free of cost) to underline the answers as they come across them. This prepares the pupils to shut the book and write the answers from memory against the questions in the assignment sheets. The answers are of course very short.

Types of Questions.

Questions are of various types :—

Type 1. More than one answers are given below the question. Pupils are required to underline the right answer.

the answers against each question on the slip. If they fail to answer any question from memory at the first attempt they open the book and look for the answer. When they find the answer they write it on the slip and put a mark against it to show that it was answered on the second attempt.

Purpose and Results.

The purpose of this experiment is to enable children to read printed matter at sight and comprehend the meaning quickly as a preparatory step to skimming. The experiment has yet to run on for six months more. It will be possible at the end of the experiment to discover what results can be obtained by ordinary teachers working in ordinary schools, what difficulties they experience and what improvements are possible.

Arithmetic. The Arithmetic assignments have been designed to achieve the purpose the Detroit Standard Practice Tests are calculated to achieve. The asssignments are exactly on the lines of Prof. Thorndike's Arithmetic books which admirably suit American children. These assignments have, however, been designed very carefully to fit in with the life of Bengali children. The ordinary text-books on the market are full of examples of the wrong type as illustrated by Prof. Thorndike in his New Methods in Arithmetic. These assignments have been constructed to suit Indian life and Indian requirements.

The assignments consist of a series of exercises in the four operations only for beginners. These operations are limited to numbers of two digits not exceeding 50.

The methods emphasise the processes which life will require and the problems which life will offer. They aim at developing speed and accuracy.

as units for fortnightly assignments, have been written and printed for distribution to the girls.

The principles followed in the construction of these pamphlets are given below :—

(1) The stories have been written with the help of a limited vocabulary of the 200 commonest words save a few unavoidable ones..............................
computed from a count of 22,000 words by a Research scholar of the Teachers' College. The list prepared is of the type of Thorndike's Word List.

(2) Each pamphlet is put in a cover with a loose sheet of paper containing a list of new words which occur in each section of the story, the stories being divided into sections as in the alphabet stage. The pupil first goes through the list of these unfamiliar words and then begins to read through. Whenever she comes across a new word in the course of her reading she notes and underlines it and puts the number assigned to the word in the list on top of the new word in the story.

There is another sheet containing questions on subject of lesson section by section. The pupil is expected to write out short answers (ordinarily one-word answer) from memory against each question in the sheet after finishing reading.

Method of Study.

Reading. First, the pupil reads a paragraph aloud quickly. Then she reads it expressively as if she were telling the story to a child sitting beside her in order to make the child understand. Third time the pupil reads over the paragraph silently without even moving her lips. She tries to read rather quickly this time trying to think only of the story not of the mere words.

Answering Questions. Pupils shut the story book and look at the questions on the loose sheet. Then they write

C. *The Story Stage.*

1. Revision of the last lesson.

(A pupil tells the story in his own words and stops where asked to ; another pupil takes up the thread of narration and continues).

2. Preparation of before-questions.

(A pupil reads a question relating to the section. Teacher explains if necessary. Other pupils repeat the question. In this way all the questions of the section are done).

3. Reading and answering questions.

(Pupils read the story section by section and underline answers in the sheet as they proceed).

4. Test.

(Pupils answer questions already done from memory).

Tests of Comprehension.

Devices have been used whereby pupils are made to match pictures and words (printed words provided for the purpose) pictures and sentences. They are also made to mark that portion of a story to which a picture relates.

Answer to Kansas Exercises.

Pupils are not expected to write out the answers at the early stage of their work. The teacher is to move to each pupil for the answer to each question and to note it against the question *as given by the pupil* without correction. Discussion follows after a lesson is thus finished and then corrections made.

Reading : The Post-Alphabet stage. The need for reading matter for this stage was felt because the aged girls under experiment finished their assignments quickly enough to pass on to something else if they were not to waste their time and advance at their own rate. To meet this need pamphlets, each containing one or more stories

7. Practice in writing.

(Teacher points to a word on the black-board : pupils write. Teacher shows the formation where necessary).

8. Writing from memory.

(Teacher wipes the black-board clean, dictates words: children write and show).

The need and utility of the " directed study " are here clearly seen. The lower grades must have " class periods" every day for some time in every subject. The pupils must advance at their own rate, so after class periods they have the whole time uninterrupted to do the assigned task from the printed sheets. The teacher is free to help those who need help at the time they need it.

To a casual observer it might appear that the teacher really conducts a mass lesson, but closer inspection would show that in a short time every pupil comes to different points of difficulty needing individual assistance.

B. *The Sentence Stage.*

1. Revision of the last lesson.

(Teacher writes a sentence on the black-board : pupils read at sight).

2. (*a*) Reading.

(Teacher writes the sentences of the lesson in order on the black-board : pupils read with him).

(*b*) Reading by changing the order of the sentences as directed by teacher.

(*c*) Reading from the printed sheet.

(Teacher points to a sentence on the black-board : pupils find it in their sheet and read).

3. Test.

(Teacher points to sentences on the black-board in a different order ; pupils find them and read from the sheet).

from the group correct answers to questions. Also there are exercises to mark True and False against statements which the pupils can read for themselves. (pp. 23, 29, 36, 44 and 58).

The purpose of the Assignments is to enable the beginners to recognise words and sentences at sight and to begin to read stories as early as possible. Thus story lessons have been introduced when about one-third of the sixty letters introduced in the Assignments have been learnt.

The Assignments are marked out by three stages— the word stage, the sentence stage and the story stage. At the third stage the pupils read stories which are divided into sections. To the left of each section are questions relating to it. They are distributed five or six words deep towards the beginning of the book and the depth increases as the pupil advances.

METHOD OF LEARNING.

Lesson Forms.

A. *The Word Stage.*

1. Test of the last lesson by flash reading.

2. Picking out words by underlining—,=,≡,

3. Learning new words.

(Teacher writes the words in order on the board. Pupils read after teacher— in unison and then individually).

4. Test.

(Teacher points to words on the black-board in a different order, pupils read).

5. Learning meaning of difficult words.

(Teacher writes and points to a word and gives the meaning. Drill).

6. Test of 5.

(As under 4).

The word-building exercises designed for the beginners prove of interest to them. For this purpose printed cut letters are used (see pp. 24, 44, 49, 53).

2. Words introduced are proposed to be learnt by practice in actual reading. So there is repetition of words even in narrative matter. In fact this feature is very prominent.

Pupils begin to read meaningful sentences when they are familiar with only nine letters—four consonants and five vowels.

3. The matter of the Reader is suited to the developmental stage of the pupils expected to attend Primary classes.

4. Every Assignment is for a fortnight and there is a revision lesson half way and a test is held at the end of a fortnight. The tests are so designed that the pupils can read the question paper unaided and answer the questions even without yet knowing how to write. Thus the pupils are brought to the active aspect of learning even at the first stage.

5. The Practice Method characterises the reading matter. This method which consists in reading and underlining answer speeds up reading.

6. Kansas Exercises have been introduced when pupils know only nine letters (page 11). Plenty of such exercises have been interspersed throughout the book.

7. Silent reading is more valuable than oral reading. Hence devices have been adopted to train the beginners to silent reading. The Silent drill in action is an effective means for that purpose. Pupils find it possible to read and perform actions as directed at the end of the first fortnight. Such exercises come at short intervals.

There are other devices for the development of Silent reading ability. Questions and answers are grouped separately. Children are trained to pick out and mark

The Dalton Laboratory Plan at Armenitola Government High School, Dacca.

BY

G. BHATTACHARYA,

Professor, Training College, Dacca.

CONSTRUCTION OF THE ASSIGNMENTS.

READING :—*The Alphabet stage* :—The following principles in the construction of the Assignments have been observed—

1. The pupils should as early as possible derive pleasure and a sense of power.

(*a*) This has been effected in reading by spreading out the letters of the alphabet over several lessons and not making children learn them in mass. Thus in the first lesson only four consonants have been introduced and in each subsequent lesson only one new letter. In case of a vowel it is, save one, the letter and its corresponding symbol. Thus the letters of the alphabet (sixty in all considering nine vowels as double letters) have been exhausted in 40 lessons or over three-quarters of the book.

(*b*) Meaningful material has been introduced even in the first lesson when the pupils have become familiar only with four letters. The next lesson introduces only one new letter, and meaningful material is constructed out of what has been learnt in the first lesson. This principle has been followed all through the book.

reasonable chance to an average pupil to pass with credit their examination tests. We all know what happens from overeating. Why force intellectual indigestion on our boys ? Give them a chance of exercising their young limbs in God's fresh air and leave the private tutor to the pupil who for some reason or another cannot attend a public school.

Teachers do not keep back pupils for a whim or on caprice or because they like to do it. We live, move and have our being for the good of our pupils and over-anxiety, impatience and inconstancy on the part of parents, as well as the evil of private tuition are very positive hindrances to our work.

home-work, who cannot explain difficulties and who possibly cannot read. Let them use their parental control and insist on the regular and punctual attendance of their children at school, and let them give us credit for knowing our work and for having the will to do it.

A school magazine, in popular form, reporting school events and discussing local problems, with invitations to parents for suggestions would be most useful. Out-of-school events, like organized games, scouting displays and school excursions usually arouse the interest of parents and full advantage should be taken of them. "Open-days" too, when the school is open to parents to come and see their children at work, and to talk with the class teachers are excellent, for then, there is a very valuable interchange of psychological information, that may well lead to complete education. Interest on the part of the parents and confidence in us is what we most want. That these are sadly missing in India is only too true. From a short experience, I have learnt that there is a terrible inconstancy on the part of parents with regard to the education of their children. If a boy is not promoted because he is not fit for promotion, they change schools and try somewhere else. The parents are impatient and look for regular promotions from class to class. And I find that they give ear to their children who usually put all the blame for non-promotion on their teachers. And I can't resist it—they permit their "swans" to breast the yielding waters of some other lake. Coupled with their impatience is their over-anxiety. They must have private tuition. And as all the world knows anybody can be a private tutor in India. But if even only the skilled were private tutors, the cramming of boys, out of school hours, of subjects taught in school is harmful and wrong. The local Education authorities, who must be credited with knowing their work, have decided that working at certain subjects for a certain number of hours a week, gives a

and simplicity of children. And here we would emphasise the subtle and refining influence of the child's mother, in particular. Who can measure the effect of mother-love on the child ?

Nature intended parents to be the teachers of their offspring ; but they ploughed the land, went to war and sailed the seas and left the education of their children to the mother and to strangers beyond the family. And because nature did intend the head of the family to teach his children, and because, there is so much romance and adventure in foraging abroad, the notion grew that teaching was trivial ; something indeed that parents could do in their spare time if they had a mind to do it. In consequence down the ages, parents felt capable of interfering and suggesting and advising teachers on matters concerning them very closely, but about which through their own arrangements, they knew little or nothing. So it has come to this, that even in the East, the teacher has lost much of the respect of olden times. Before co-operation between parents and teachers becomes really effective, we have to read just points of view. We are a profession and we want the same confidence from parents as they give to doctors or lawyers. And to do that we must first of all appreciate ourselves ; remove false impressions from the minds of the parents and let them know much more about our work. A school for parents might meet the case, but since that is impossible we must try some other means. Germany has organized committees of parents and teachers to run their schools in certain parts. They obtain an interchange of opinion, and in general terms, the wants of their particular town or district are discussed and so far as possible, the individual bent of pupils is discovered and developed. That is hardly possible in India just yet. What can we do ? For a beginning, I would suggest the broadest lines of co-operation, so as to include every parent. For we shall find parents who cannot supervise

The Co-operation of Parents and Teachers

BY

THE REVD. FATHER PAUL RYAN,

Rector, All Saints' Institution.

FORMAL education, that is, the education that is given in schools, is not sufficient to make the complete man. It must be assisted by what we would call "home-education," or that which is given at home. Or better still, the effectiveness of education is best obtained by the co-operation of these two distinctive forces. This "home-education" we have so long called home-influence, home-surroundings and such like, and the terms have become so familiar that we accept them without discussion. Somebody has recently made a plea for "by-education" as a further supplement, that is, the education that comes to us by chance or accident; something that we pick up by the way; something acquired in "the mere process of living." It is sufficient for our purpose to mention it with "home-education," to make the point that formal education is not enough, and to stress the importance of co-operation between parents and teachers.

If our work is to be a complete success, we must have the assistance of parents, not merely in the paying of fees, or in huge delight at a good report and a growl at a bad one; but in the work in-between. Insisting on regular and punctual attendance, showing an interest where possible with home-work and particularly in the home giving a good example and fostering the natural goodness

Burke and of Ruskin, has been brought about by individual effort, the very opposite of control in any form, whether academic, patriotic or logical. The English language is what it is by the energy of Malory, Chaucer, Shakespeare and the great translators of his age, Milton, Bunyan, Burke and Dickens, and innumerable others known and unknown,—a series of accidents" if you will, and yet, like all accidents, part of some great purpose, undivined because divine,—a purpose beyond human design, by which the ideals of humanity are preserved for the steadying and guidance and consolation of mankind, and it may be, as insisted upon by Indian literature, for the recognition of the unity and divinity of all life.

The very fact that words are dependent upon personality, that they are fortuitous, makes them untrustworthy for accurate scientific employment. It is said that on this account Faraday, the great scientist, was obliged to explain phenomena to himself by means of a symbolism instead of adopting the current scientific diction.

Well, we may admit the difficulty for science, which moves along from discovery to discovery, and each great discovery undoes much of our previous knowledge and changes our previous conceptions, so that many words and phrases come to have a different meaning and value for each generation of mankind.

But literature deals with central human facts, and these are not subject to such sweeping changes as scientific discovery and invention bring about ; the language of the heart remains the same. We do not wish anyone to fix down for us with so called scientific precision such things as life, death, the soul, nature, love, happiness and sorrow.

The English language, more than any other in the history of mankind, is the result of individual advance in every possible direction of activity. It is one of the vastest and most varied of languages, and it has never disdained to borrow from other languages what has been found serviceable or picturesque. Being a reflection of English character it has always resented control or restriction. It is true that the license of the Elizabethan period, a reflection of the European Renaissance alike in life and language, was followed by a Puritan period, accompanied by a conscious effort at purification and regulation of the language—we find Dryden improving on Chaucer and Shakespeare ; the nineteenth century gave us living fountains again, Blake, Shelley, Browning and Whitman.

All the wonderful range of English literature, from the simplicity of the early chronicles to the inspired and sustained eloquence of the seventeenth century divines, of

Language is a human creation, but life a divine one. It would indeed be a marvellous thing if language could be in all respects a representation of life, if it were a creation so varied in possibilities. It is vital, but not always or entirely so ; it has its accretions and its atrophies, as we can easily see by reading a newspaper or listening to the talk of people who are overworked or overfed. But there are experiences and intimations which are beyond the power of expression, and moreover, there are so many words which mean different things to different minds, words which it is of no use to define, as that only fetters them.

Why do we hear, every now and then, from even the keenest and deepest minds, the complaint that language is after all not a perfect medium of communication, that it often fails us when we most need it, that the finest selection and arrangement of words still leaves something unsaid ? The higher intelligences among mankind are constantly being troubled by this great truth. I call it a great truth, because if everything were subject to logical definition, if every idea and feeling could be readily captured and represented in words, life would be a very dull matter, as dull as it always is where imagination is not recognized and fostered. It is a great truth we realize when we feel that our thoughts are beyond our powers of utterance, for it means that there is more in life than we conceived, and in recognizing that we have raised ourselves spiritually.

There is some justice in the complaint that while other practical departments of life are organized and brought under control, language is not. It goes along its semi-conscious, haphazard way of development, adding to itself slowly in spheres where life is conservative and conventional, as in English-educated society, and rapidly in regions of physical transformation and tumultuous intermingling of races, as in America.

Words and sentences may have a peculiar suggestiveness when grouped together.

He went out.
His wife began to speak.

These sentences tell us nothing of interest. But when the two are put together in the following way, we suddenly learn a great deal :

'He always went out when his wife began to speak.'

Similarly :

She could play the piano.
She played it badly.

These sentences are as dull as anything you can find in any book of grammar.

But see how James Stephens puts them together with a flash of genius :

'She could play the piano with such skill that it was difficult to explain why she played it so badly.'

There you have language rising in power as the brow of man rises above those of

apes
With foreheads villainous low.

Now let us compare two verse passages of the Elizabethan period as revelations of very different minds. The first is by John Marston :

Now the Musicians
Hover with nimble sticks o'er squeaking crowds,
Tickling the dried guts of a mewing cat

[*Crowd*=fiddle. Hence the name Crowther.]

There you have vulgarity. Now see what Shakespeare can make of an action of human delight:

When you do dance, I wish you
A wave o' the sea, that you might ever be
Nothing but that.

No wonder a Russian officer in Siberia said to me : 'I love your Shakespeare, because he is so full of sunshine.'

‘ All the morning I have been digging maidenhair ferns with a boy I met on the rocks, who was in great sorrow because his father died suddenly a week ago of a pain in his heart.’

“ We would’nt have chosen to lose our father for all the gold there is in the world ” he said, “ and it’s great loneliness and sorrow there is in the home now.”

J. M. SYNGE.

In these two lines we have the primeval extravagance of utterance, and the dignity and pathos which so often mark Irish peasant speech.

‘ Fetch three ounces of the red-haired girl I killed last night.’

T. MIDDLETON.

What a strange mind he must have had to be able to think of such a thing !

‘ But if any man will be true brother to me, true brother to him I’ll be, come wreck or prize, storm or calm, salt water or fresh, victuals or none, share and fare alike ; and here’s my hand upon it, for every man and all ! ’

CHARLES KINGSLEY.

These words are spoken by one of the characters in a story, but in them we have the very spirit of Charles Kingsley himself.

How these last few simple words reveal the insight of the writer !

‘ She was afraid that if she looked at him any longer she would see him.’

JAMES STEPHENS.

This sentence suddenly makes us conscious that to this author words mean more than they do to ordinary people. For him the word *see* implies more than mere physical vision.

in reading him a sense of inflation, a touch of what we call the charlatan (Ital. *ciarlatano,* a great talker). Johnson can be earnest in his writing, but it is a heavy earnestness and this sense of pompousness is the more difficult to understand when we remember with what honesty and simplicity and directness he expressed himself in conversation. But the earnestness of Burke is that of an expert swordsman, master of his every movement, darting out at every turn of thought phrases that gleam like the flash of a swift rapier.

Words allow themselves in combination to be responsive to all moods, even as if they had been consciously made for the purpose. They can group themselves together like a cage of hissing serpents ; they will meander along like a brook warbling through soft cresses ; they can hold the thunder of the wrath of ages past, or croon like the dream-talk of a little child.

Sir Walter Raleigh, the late Professor of English Literature in the University of Oxford, in his little book on Style has said some very fine things about words, fine because they reveal truth it is not given to many to apprehend. For example :

'Language, this array of conventional symbol, loosely strung together, and blown about by every wandering breath, is miraculously vital and expressive ...... The same words are free to all, yet no wealth or distribution of vocabulary is needed for a group of words to take the stamp of an individual mind and character ...... The soul is able to inform language by some strange means other than the choice and arrangement of words and phrases.'

Let us gather together a few sentences from English writers of different periods, as revelations of human personality.

Now let us take a paragraph by Dr. Samuel Johnson, who alone of English writers has given his own name to a special style, effective at its best, but debased by generations of imitators, chiefly among newspaper writers, so that the term Johnsonese has come to be rather a byword. It is a paragraph that needs patience.

'Diffusion and explication are necessary to be the instruction of those who, being neither able nor accustomed to think for themselves can learn only what is expressly taught; but they who can form parallels, discover consequences, and multiply conclusions, are best pleased with involution of argument and compression of thought; they desire only to receive the seeds of knowledge which they may branch out by their own power, to have the way to truth pointed out which they can then follow without a guide.'

Wordsworth who was by no means laconic himself, has once for all dismissed the less worthy parts of Johnson's work with the phrase *a hubbub of words*, and in this passage we do not feel that things have been said in the best way possible. Tagore would have said it all in two lines, and left us happy.

Contrast with it this sentence by Edmund Burke :

'France when she let loose the reins of legal authority, doubled the license of a ferocious dissoluteness in manners, and of an insolent irreligion of opinions and practices; and has extended through all ranks of life, as if she were communicating some privilege, or laying open some secluded benefit, all the unhappy corruptions that usually were the disease of wealth and power. This is one of the new principles of equality in France.'

Do you not feel here a mind at work that is cool and rapid and masterful, never stopping to think more of expression than of truth and force of matter? You cannot compress Burke as you can Johnson; you never feel

and clear composition of the sentence and the sweet falling of the clauses, and the varying and illustration of their works with tropes and figures, than after the weight of matter worth of subject, soundness of argument, life of invention or depth of judgment. Then did Car of Cambridge, and Ascham, with their lectures and writings almost deify Cicero and Demosthenes, and allure all young men that were studious unto that delicate and polished kind of learning.

FRANCIS BACON.

In this paragraph we can read a great deal of the mind of Bacon, a mind so clear and sure that its records are of lasting worth, forming types rather than individual utterances. We know that the sentence could never have been written if the Latin language and literature had disappeared as so much of Greek literature has, and yet we feel the mastery of the native English brain over thought and word, just as we feel it in the case of John Milton, by whom the following sentence was written :

'To make the people fittest to choose, and the chosen fittest to govern, will be to mend our corrupt and faulty education, to teach the people faith, not without virtue, temperance, modesty, sobriety, parsimony, justice ; not to admire wealth or honour ; to hate turbulence and ambition ; to place everyone his private welfare and happiness in the public peace, liberty and safety.'

Reading this, we admire the power and balance of mental faculties which enabled Milton to say so many weighty and supreme things in such a short literary form. What he has expressed here many writers would have expanded into an essay or even a book, with less effect. And yet we know that this power is a resultant of Milton's personality and that of the great writers of old,—it reads almost like a passage from the noble funeral oration delivered by Pericles and reported by Thucydides.

Words

BY

PROF. E. E. SPEIGHT, B.A.

(Continued from previous issue).

THE vast philosophy of India has never produced anything nobler than the songs of Kabir, the poor unlettered weaver of Benares.

> O my heart! the supreme spirit, the great Master, is near you:
> Wake, Oh wake!
> You have slept for unnumbered ages; this morning will you not wake?

And:

> He is dear to me indeed who can call back the wanderer to his home......
> The home is the abiding place; in the home is reality;
> The home helps to attain Him who is real. So stay where You are, and all things shall come to you in time.

Even when men are so strongly influenced by classical examples that their writing reads with a stately solemnity foreign to English nature, and seems to be a new creation full-charged with alien culture, this does not prevent individual character from appearing,—we can read between the lines in spite of the reverberation of the phrases. Let us just look at specimens of the writing of four masters of English prose who were steeped in classical spirit, Bacon, Milton, Johnson and Burke.

Men began to hunt more after words than matter; and more after the choiceness of the phrase and the round

ion. As a suggested programme for the drill classes in the schools I should like to offer the following :—

1.	Attentive Exercises	5 min.
2.	Calisthenics and Gymnastics	..15—20 min. varying with age.
3.	Games	..15—20 min.

If this programme is followed and the physical director or drill-master, conducts the classes in a way that will make these attractive and interesting, I am sure that good results will be obtained.

I should like to enumerate some of the advantages which will result from following a rational course of physical education.

1. A thorough knowledge of our body and how to care for it.
2. A strong healthy body that will enable us to carry out our ideals of life.
3. A control over our muscles that will of times enable us to avoid an injury in cases of accidents and emergency and also develop a graceful appearance.
4. Vitality.
5. Accuracy and quick thinking.
6. Courage.
7. Self-control : (*a*) of temper, (*b*) of sex life.
8. Co-operation and unselfishness in accomplishing a desired end.

course in physical education in order to help to raise the standard in our State.

Kinds of Exercise.

Exercises are of various kinds and produce different results. Therefore, to obtain the proper results one must have a knowledge of these various kinds of exercises and their purpose. In the first place, we have attentive exercises with a view to securing the attention of the boys in the schools. Secondly, there are exercises for mental training which require dissimilar movements of the various parts of the body thus giving the mind control over each of the muscles. Thirdly, there are corrective exercises which develop correct carriage and enable us to use our lungs to the fullest capacity. Fourthly, there are exercises of skill which enable us to handle our body under all conditions. Fifthly, there are exercises to develop strength, such as weight lifting and using the large muscles of the body. Let me say here, however, as a caution, that too often this kind of exercise is overdone and proves a detriment to our best welfare. Sixthly, exercises of endurance and vitality, such as long-distance running and games like football, hockey, basket ball, etc. Seventhly, exercises of speed such as swimming, running. Eighthly, there are exercises which demand team work. While this may not be a physical stimulus yet it is very important, as it develops in us a feeling of altruism and of ability to work with others, which is very necessary to a successful life.

As I have intimated previously, all exercises should be pleasurable and attractive. The things that one likes to do are the things which one will find time for and which will do one the most good, and therefore, if in our schools, exercises are made attractive the result will be that the boys on leaving school will continue to secure a proper amount of exercise to keep their body in a healthy condit-

are held after school hours ; the work given is uninteresting and affords very little real exercise for the boys. In arranging our schedules time should be given for physical exercises during the school hours and the exercises should be of the kind that will stimulate in the boys an appetite for exercise which develop in them health and endurance.

In order to do this, however, it is necessary that young men of high educational qualifications be recruited and trained to become physical directors (not drill-masters) in the schools. Not realizing the value of an adequate system of physical education, drill-masters have been recruited for the schools in many cases with very little education ; such men have no idea of physiology, anatomy or hygiene and what physical education really means, and consequently in most of our schools, instead of looking forward to the time allotted for drill classes with eagerness, the boys dread it and endeavour to be excused from it as often as possible : and, I am sure, personally, that I do not blame them. However, this can be changed and exercises can be made attractive and profitable and something to look forward to with pleasure if conducted in the right manner.

Three years ago a school, in which all the drill-masters in the State were given one month's training, was conducted and an effort was made to show them how physical education could be made attractive. I am sure a great deal of good resulted from this training school, but it is impossible to give suitable training along these lines in one month.

There is a Y. M. C. A. School of Physical Education in Madras, which offers a course of a year's training for physical directors and many of the Governments, in their efforts to develop an adequate system of physical education, are sending men of high educational qualifications to this school for training. I would recommend that the educational authorities in Hyderabad State select several men with at least a High School education and send them for a

cannot expect to be masters of our physical lives without first understanding the mechanism of our body and the things that are necessary to keep it in a healthy condition.

History would seem to bear out that we have failed to realize the importance of a strong healthy body. We believe that our body is the temple of our spirit. It is really the home of our self and foundation-stone of our life. A man may have a thoroughly trained mind, desire to serve his fellow-men and be fully equipped to do this, and yet, if he does not have a strong healthy body, which can stand the strain and stress of the world to day, it is impossible for him to use his knowledge and carry out his desires. So we see that in a real sense our body is the corner-stone to our whole life. However, let me warn you at this time that no building is ever complete that stops with the corner-stone. It is equally necessary that we develop every side of our life if we wish to build an efficient structure.

As a definition for the objective of physical education I should like to offer the following :—

" It is to acquire and to impart to others a thorough knowledge of the structure, function and care of our body and to develop a strong and healthy physique which will enable us to contribute our part to the best development of mankind."

How can this be accomplished ? It is to be achieved, first by including in the curriculum of our schools a good course in anatomy, physiology and hygiene. (The fact that there is practically no instruction whatever given in anatomy and physiology in our public schools is an appalling and conclusive evidence of the fact that we do not realize the importance of Physical Education). Secondly, we are to include in the daily time-table ample time for physical exercises in some form. According to the Educational Rules a certain amount of time must be given each week to drill classes. Too often, however, the drill classes

Advantages of Physical Education

BY

C. H. GOODWIN, B. P. E.,

General Secretary, Y. M. C. A., Hyderabad—Secunderabad.

WHEN we speak of Physical Education the ideas conveyed to the minds of various individuals undoubtedly differ very much. To a great many it simply means the drill classes such as are conducted by the drill-masters of our schools. To others it means only sports and games as we see them played on the various athletic fields. Still others think that it means ability to perform gymnastic feats on various kinds of apparatus prepared for that purpose. But let us look for a few minutes as to the real meaning of physical education. If we look up the definition of education in the dictionary we will find that it means cultivation and training; and the acquisition or imparting of knowledge. Therefore Physical Education would be the cultivation and training, and acquisition or imparting of knowledge regarding our body and its welfare. Considering our subject in the light of this definition we readily see that it covers a much larger scope than we are often apt to think. In the first place, it must include a knowledge of the structure of our body; and after learning the mechanism of this body of ours it is necessary that we know the functions of the different organs and how they react to different stimuli, such as, exercise, food, rest, etc.

No one would attempt to be an automobile mechanic without first fully understanding the mechanism and purpose of the various parts of a motor car, and likewise we

ive corrective of this weakness. He gives out to his class for correction and marking cyclo-styled sets of completed sums purporting to have been worked by a youth with the fanciful name of Jack Hasty. These sums contain many mistakes of working and method. Usually they also contain one or two sums that are correctly worked. It is found that the pupils—adopting the note of examiners with enthusiasm—attack the papers with gusto and when they have finished often ask for more. It is claimed that these papers cultivate accuracy and a scorn for inaccuracy and considerably quicken the intelligence.

How long should a teacher teach.

It all depends. The answers given by well-known educationists vary from a term of four to forty years. The longer periods are fixed by educational authorities, having due regard to pensions and the annual wastage in the teaching profession. The shorter ones are suggested from the individual stand-point and fourteen years have been put as the limits of a teacher's usefulness.

It is said of us, as a profession, that after a few years of enthusiasm we get into a groove, lose our initiative and that we are out of touch with the realities of life. Our work, of its very nature, gives colour to this accusation. For the ease which an experienced teacher acquires in technique through years of service must tend to destroy effort and weaken his enthusiasm. But it need not. Education and educational methods are so continuously changing; its psychological aspects are becoming so manifest; and with the changed and changing conditions of life, it is possible to be alive in the profession even after fourteen years' service. Besides, with the many opportunities now afforded for an interchange of opinions, a teacher need not get into a groove nor solely rely on his own stock of initiative.

Circumstances compel us to postpone the publication of a sketch of the late Nawab Imadul Mulk Bahadur's life to a subsequent issue.

a march past, the President receiving the salute at the flagstaff.

A few minutes later one bugle call from the base turned the whole compound into a splendid scene of numerous scout activities. At one end was seen a fire-brigade party running to the rescue of some burning huts ; at another, some scouts were building a thatch hut ; in another place, First Aid was being given to the injured ; some were preparing bridges and others were setting up signal stations ; at another corner, tents were being pitched and flag-staffs erected ; some scouts were erecting human pyramids and others were showing staff-dances. In this way, some twenty different scenes were witnessed simultaneously by the numerous admiring spectators, who were particularly impressed by the quickness with which this moving picture changed. The President then visited the different units and inspected their workmanship.

Mr. S. M. Hadi, Director of Scouts, who was in charge of the Rally, then made a short speech in which he described the work done by the scouts since the inauguration of the movement in Hyderabad. After distributing the Charters and Warrants to troops and Scoutmasters respectively, the President in a happy speech congratulated the Director of Scouts and his assistants on the success of the function. With hearty cheers for His Exalted Highness the Nizam and the President of the Council, the Rally came to a close.

In our opinion, displays of this kind serve a very useful purpose in that they show parents and guardians what scouting means and what it can do for boys.

A Novel Accuracy Test.

We have come across a novel accuracy test and we pass it on with pleasure. We are told that 50 per cent. of mistakes in arithmetic in our schools is due to want of thought, jumping to hasty conclusions and need of careful checking and revision. Experience bears this out. One teacher has found an effect-

private school is eligible to compete in the tournaments. The recognised High Schools in Secunderabad can also join in all competitions of the High School section.

The Football Tournaments of the College, High, Middle and Primary Sections have recently been concluded. Forty teams from different schools took part, the winners in each section being as follows :—

College Section—Osmania College.
High School Section—City Collegiate School.
Middle School Section—City Collegiate School.
Primary A Section—City Collegiate School.
Primary B. Section—All Saints' School.

The handsome shield and cups awarded by the Association were given away to the winners by Nawab Fakhr Yar Jung Bahadur at the close of the games.

Scout Day Celebration in Hyderabad.

The 4th of October 1926 will always be remembered as an eventful day in the annals of the scout movement in this State. On that day all the schools in Hyderabad were closed to enable the students to witness the Scout Day Celebration held at the Nizam College under the distinguished patronage of Nawab Wali-ud-Dowlah Bahadur. The functions both in the morning and evening were open to the public, and the displays gave one a very favourable impression of the training the boys were receiving in outdoor life and scoutcraft.

The morning Rally was devoted to the renewal of the oath that every scout has to take before he is admitted as one of the members of this great world-wide Brotherhood. Scouters who were in charge of different troops were sworn in and invested with badges of their rank. The evening function was attended by Nawab Wali-ud-Dowlah Bahadur, the then President of the Council, and many other distinguished visitors. In all, 18 troops took part. On the arrival of the Nawab Saheb, the troops with their colours flying gave the general salute. Then followed

hour proved not only very instructive but also highly entertaining.

The evenings were given over to lantern lectures depicting the life in China and Malaysia, the Panama Canal, and one evening Dr. Subba Rao gave an illustrated talk on malaria and its prevention.

The Institute closed with a resume of the findings of the different groups in each department, and with a hearty vote of thanks to those who had so liberally given their services to make it a success.

The Honourable the Resident has been pleased to sanction a monthly grant-in-aid of O. S. Rs. 120 for the Methodist Boys' High School out of the Residency Local Fund.

The Hyderabad Athletic Association.

With a view to foster clean sport amongst young men in Hyderabad, an association called "The Hyderabad Athletic Association" was formed in 1920 under the Presidentship of Nawab Masood Jung Bahadur, the Director of Public Instruction. The membership is limited to thirty, the annual fees being Rs. 12. An Executive Committee is elected annually to carry out the purpose of the Association according to the Constitution sanctioned by the general body.

The following are the members of the Executive Committee for this year :—

Nawab Masood Jung Bahadur, President.

Mr. S. M. Hadi, Honorary Secretary and Treasurer.

Messrs. H. W. Shawcross, S.M. Azam, P.F. Durand, Syed Ali Akbar, and Rev. G. Brown.

The Government has been pleased to sanction an annual recurring grant of O. S. Rs. 3,000, limiting the payment to actual expenses incurred by the Association. The Association conducts football and hockey tournaments and athletic sports every year. Any educational institution in Hyderabad and any Government, Aided, or Recognised

them. While their work done thus independently might be far from perfect, the reaction on the student's mind would be worth much more in character building than a more finished product done under the strictest supervision. " The school room is the place to make men and women " was her slogan.

Miss Birdseye, B. Sc., of Madras has done post graduate work in Geography and proved herself a specialist in teaching this subject. She approached the subject from the point of the human interest, outlining first the general crops of India, such as rice, wheat, cotton, jute, etc. Taking each one separately, the conditions required for growing them were briefly enumerated. Then with a map of India the class found the sections which filled these conditions and learned not only the crops grown in the different parts of India, but also the physical features of elevation, rainfall, soil, and climate. The industries came in for attention as the uses of jute, etc., were discussed. She stressed the value of map-making to illustrate every phase of the country, climate, rainfall, crops, etc., and then a comparison of these maps to make suitable deductions. Geography took on a new fascination and we hope Miss Birdseye will continue the subject at the next session of the Institute.

Miss Bullard of Kavali gave most helpful lectures on the use of the Project Method in the Primary Department, relating the life and habits of the students to the studies in hand. Very suitably following this series, she gave an address on Manual Training for students, emphasizing the idea that the teacher's aim should be character and independent ability more than the finished product, such as mats, baskets, cloth, furniture, etc.

Misses Clough and Volkman of the Wesleyan Girls' School, Secunderabad, brought a class of girls each afternoon to demonstrate the value of dramatization in the teaching of English, History, Nature Study, etc. This

Miss Ashbrooke of Shahjahanpur is a specialist on making play out of the hard things in the school-room. Some of her methods quite startled her hearers but later they were convinced of their practicability. For instance, a class of boys in the third standard was very weak in Arithmetic. They had reached short division, but bid fair to fail hopelessly. Special explanations and help were given and then the spirit of play was introduced by appointing two captains who chose their teams from the class. A black-board were assigned to each side and a card with a sum in short division thereon together with a piece of chalk was given to each captain. He rushed to his board, transferred and solved his sum, ran back, handed his chalk to the boy next in line, who was then given his card with a sum. He in turn ran to the board, came back and handed his chalk to the next in line until all the class had finished. The honours went to the team who had the most sums correct when they had finished time being an important factor. The class developed such a keen interest in the subject that they practised short division at all hours and places, each captain drilling his team so that they might win. Afterwards, they asked permission to challenge the fourth standard to a game of short division and gave them a good drubbing. Then they challenged the fifth standard and were again victorious. The sixth standard also failed to get the laurels, so the third standard are now challenging the different classes of High School boys to games in short division. Comments are unnecessary, but one might well term it the Evolution of Mathematics Champions. Would it ever have been accomplished by the old methods? This is but an illustration of the many original plans which Miss Ashbrooke gave to the teachers, using demonstration classes after her lectures. In her lecture on the Uses of Drawing, she stressed the idea of developing originality and a love of the beautiful in pupils by encouraging them to use water-colours, crayons, etc., to represent the things all about

The benefits of united effort for the development of the various areas made a deep impression. The visualization of the work which had been done to ascertain the kinds of products suited to the soil and to increase the fertility and crops of a certain taluq, together with the explanations given by the attendant, seemed to hold their attention well.

The type of school needed for rural sections was visited and who knows but what its message may be the means of some day helping to work out the same general principles in some community in this State. The court of subsidary occupations had a strong appeal and we would gladly have spent more time there.

Our grateful thanks are due to the Director of Agriculture and the Agricultural Engineer of H. E. H. the Nizam's Government for the comfort provided for our party.

In all probability, if the Exhibition is held again next year, the same group will be eager to attend again, which is sufficient proof of their interest and enjoyment.

The Hyderabad Teachers' Institute.

The Hyderabad Teachers' Institute was started last year conjointly by the Methodist Boys' High School and the Stanley Girls' High School. It aims at giving new inspiration in the great work of character-building in boys and girls and new practical and concrete ideas with which to achieve this end in the schools.

The second session of the Institute was held in the Stanley Girls' High School October 6th to 13th. Much effort was put forth to make the programme practical, helpful and inspiring. Two divisions were conducted simultaneously, one for teachers of Middle and High Schools and the other for Primary Teachers, including therein all classes from the Kindergarten to the fourth standard.

Miss Elizabeth J. Wells, Principal of the Stanley Girls' High School, has kindly sent us the following account of the recent Poona Agricultural Exhibition for publication :—

The Poona Agricultural Exhibition.

The Poona Agricultural Exhibition was a great educational centre, not only to farmers and land-owners but to school children as well. Probably many are led to wonder what benefit teachers and girls would derive from a visit to such a place, but those who went from the Stanley Girls' High School felt well repaid for the trip. While it would be impossible to enumerate all the benefits, a few salient points may be mentioned.

Their knowledge of the geography and physical features of their own land has been increased. Poona and the Bombay Presidency are no longer mere parts of the map of India.

They have received a new vision of the importance of agriculture in India.

The agricultural implements made a strong impression on their minds and when one day there was a choice between that and another place, they chose to go to the machinery court and learn more about the wonderful things that could be done by the engines, tractors, reapers, threshing machines, etc., displayed there.

While the range of animal exhibits was disappointing, yet the two classes which were well represented, *viz.*, cattle and poultry were interesting and instructive.

The care of milk and its products proved to be a fascinating study and the students took notes on the displays and comparisons which they saw. The value of milk as a diet had been studied many times in Domestic Science classes, but when they saw before them a pint bottle of milk and, as its equivalents in food value, a large plate of potatoes, beans or a dozen other vegetables and food stuffs, the subject took on a new meaning.

Notes and News

WE regret to say that owing to want of time, Mr. Marmaduke Pickthall has been obliged to resign the editorship of the 'Hyderabad Teacher,' but he has very kindly promised to continue to help the magazine.

Admission of Indian students to British Universities.

We are indebted to Mr. Burnett, Principal of the Nizam College, for sending us a copy of the important letter we publish elsewhere regarding the need for an early study of a modern European language on the part of Indian students who intend to proceed to the British Universities for further study. At present the number of students who take up modern European languages for their examinations in India is very small, but we hope that in view of the importance which is now being attached to these languages in Great Britain, such Indian students as wish to join British Universities will make it a point to equip themselves with a knowledge of at least one modern European language before they leave India. In our opinion, it is necessary that they should make an early start by taking up a modern European language for their High School course. We find that French is already included as an Additional Language in the Hyderabad H. S. L. C. course. We trust that German will also be added to the list and that facilities for a study of these languages will be provided in some of the important High schools in Hyderabad. We shall be glad to supply further information to students interested in this matter.

THE HYDERABAD TEACHER

CONTENTS

Hyderabad Teacher

ADVERTISEMENT RATES.

Space	Whole year			6 months			Per issue		
	Rs.	A.	P.	Rs.	A.	P.	Rs.	A.	P.
Full page	10	0	0	5	8	0	3	0	0
Half page . ..	5	0	0	2	12	0	1	8	0
Quarter page ..	2	8	0	1	6	0	0	12	0
Per line	0	10	0	0	8	0	0	6	0

SUBSCRIPTION RATES.

O.S. R. 3 including postage for the Nizam's Dominions annually.
B.G. Rs. 3 do do Birtish India annually.
O.S.12 AS. excluding postage for the Nizam's Dominions per single coppy
B. G. 12 AS. do do British India do

Regtd. Asafia No. 47.

Vol. I.] Bahman 1336 Fasli. / December 1926 A.D. [No. 3.

Under the Patronage of

Nawab Masood Jung Bahadur, B.A., (Oxon.),

Director of Public Instruction

The Hyderabad Teacher

Quarterly Magazine of The Teachers' Association,

Hyderabad-Deccan

S. ALI AKBAR, B. A., (Cantab.), *Editor.*

FATHER PAUL RYAN, O. F. M., *Joint Editor.*

HYDERABAD-DECCAN

GOVERNMENT CENTRAL PRESS

1926

رجسٹری شدہ ٹپہ سرکار عالی نمبر ۴۷

زیر سرپرستی عالیجناب نواب مسعود جنگ بہادر

حیدرآباد ٹیچر

انجمن اساتذہ حیدرآباد دکن کا سہ ماہی سالہ

مرتبہ

سید ندیم الحسن تاثیر رضوی بی۔اے (عثمانیہ)

سید ولایت علی بی۔اے (عثمانیہ)

اعظم اسٹیم پریس چار مینار حیدرآباد میں طبع ہو کر دفتر انجمن اساتذہ واقع مدرسہ مہتمم تعلیمات سے شائع ہوا

غایات

(۱) طبقۂ اساتذہ کے احساس معلمی کو بیدار کرنا۔

(۲) طبقۂ اساتذہ کے مخصوص انفرادی تجربات معلمی کو شائع کرنا۔

(۳) فن معلمی پر نفسیاتی حیثیت سے نقد و نظر۔

(۴) انجمن اساتذہ کے مفید مضامین کی اشاعت۔

(۵) انجمن اساتذہ کے مقاصد و اغراض کو ملک کے طول و عرض میں مکمل طور پر پہنچانا

اصول

(ا) رسالہ کا نام "حیدرآباد ٹیچر" ہوگا اور ہر سہ ماہی پر دفتر انجمن اساتذہ بلدہ سے شائع ہوگا

(ب) رسالہ کی سالانہ قیمت بہ تفصیل ذیل ہوگی :-

(۱) اندرون و بیرون ممالک محروسہ سرکار عالی ۳ روپیہ معہ محصول ڈاک سالانہ (سکہ رائجہ)

(۲) " " " " ۱۲ ؍ علاوہ محصول ڈاک فی پرچہ (")

(ج) رسالہ نصف انگریزی و نصف اردو ہوگا جس میں حسب صوابدید تغیر بھی ہوسکیگا۔

(د) صرف وہی مضامین درج ہوسکیں گے جو تعلیم و تعلم سے متعلق ہوں اور جن میں ملک کے مفاد تعلیمی کے لحاظ سے ندرت اور جدت ہو۔

(و) اشتہارات کا نرخ حسب تفصیل اشاعت ہذا رہے گا۔

(س) جملہ مضامین و مراسلت دفتر کے پتہ سے ہونی چاہیئے۔

فہرست مضامین

جلد (۱) | ماہ اردی بہشت ۱۳۳۶ف مطابق مارچ ۱۹۲۷ء | نمبر (۴)

ہندوستان کوآپریٹو انشورنس کمپنی لمیٹڈ

(صدر دفتر کلکتہ)

خالص ہندوستانی بیمہ کمپنی

سرمایہ زائد از ۸۰،۰۰،۰۰۰ روپیہ۔ جدید کاروبار (بابتہ ۱۹۲۵ء

۱۹۲۶ء زائد از ۶۰،۰۰،۰۰۰ روپیہ

آخری منافعہ بحیالد بابتہ ۱۹۲۲ء ۷۵ روپیہ فی ہزار آئندہ منافعہ (بابتہ ۱۹۲۶ء) اسمیں ایک معتدبہ رقم کی توقع کیجاسکتی ہے

توسیع بالذات بابتہ ادائی قسط بیمہ، قرض، قیمت بازگشت اقساط، و تمہید پالسی منقضی شدہ وغیرہ کے متعلق فیاضانہ شرائط۔ شرح قسط بیمہ (یا منافعہ) کافی کم رکھا گیا ہے اور شرح بلا منافعہ تقریباً سب سے کم ہے۔ لہذا

"ہندوستان" ہی میں اپنی زندگی کا بیمہ کروا کر اپنی ذات اور خاندان کی کفالت سے مطمئن ہو رہیئے۔

سب ایجنسی کیلئے درخواست مطلوب ہیں۔ ماہانہ تنخواہ (صہ سے مار تک مد بہترین شرائط گارنٹی شدہ کاروبار کے لئے۔

تفصیلی معلومات کیلئے مندرجہ ذیل پتہ پر دریافت فرمائیے۔

یس جی۔ تائیڈو۔ نارایں آشرم (ترپ بازار حیدرآباد دکن)

نرخ اشتہارات حیدرآباد دیچر حسب ذیل ہے۔

مقدار	سال بھر	۶ ماہ	فی اشاعت
پورا صفحہ	ـــہ	صہ	ـــہ
نصف "	صہ	عا ۱۲ار	عہ ۸ر
ربع "	عما ۸ر	عہ ۶ر	۱۲ر
فی سطر	۱۰ار	۸ر	۶ر

مملکت سرکار عالی

کا

تاریخی و جیاگرفیکل اٹلس اردو

اس اٹلس میں مملکت سرکار عالی اور اس کے جملہ اضلاع و نیز پائیگاہوں اور سمستانات و ملک براڑ کے نقشہ جات نہایت صحت کیساتھ طبع ہوئے ہیں اور ہر نقشہ کے محاذی پورے صفحہ پر اس کے متعلقہ جغرافی معلومات باتفصیل درج کئے گئے ہیں ناظرین اٹلس ہٰذا کو آیندہ ہر ایک حصہ ملک کے ضروری جغرافی حالات معلوم کرنے کیلئے کسی مزید جغرافیہ کے ملاحظہ کی ضرورت داعی نہ ہوگی یہ پہلا موقع ہے کہ اس اہتمام کے ساتھ ہمارے ملک کا اٹلس طبع ہو کر پیش ناظرین ہو رہا ہے۔

توقع ہے کہ ملک کے قدر دان اصحاب اور مدارس کے طلباء و مدرسین اس نادر تحفہ کے طلب کرنے میں عجلت سے کام لیں گے تاکہ موجودہ نسخے ختم ہونے پر انہیں طبع ثانی کا انتظار نہ کرنا پڑے۔ اس اٹلس کی قیمت صرف (عہ) ایک روپیہ چار آنہ سکہ عثمانیہ ہے۔

المشتہر

سید عبد القادر تاجر کتب و پبلشر چار مینار حیدرآباد دکن

بسم اللہ الرحمن الرحیم

خطبۂ گرانمایہ

[نہایت فخر و مسرت کے ساتھ سرمین السلطنۃ مہاراجہ بہادر
کا وہ پُر مغز خطبہ گرامی زیب صفحات ہذا کیا جاتا ہے جو
مدرسۂ فوقانیہ چادرگھاٹ کے جلسۂ تقسیم انعامات میں
۲۴ر فروردی ۱۳۳۶ف کو عزت افزائے سامعین و حاضرین ہوا،
اس ملک کی خوش نصیبی میں کیا کلام ہے جسکے پُر مغز اور روشن خیال
مدار اعظم کی ہمدردی اور تعلیمی بصیرت ہمارے تعلیمی مستقبل کی کفیل اور ضامن ہو]

مسٹر پکھتال اور حاضرین!

میرے لئے یہ نہایت مسرت وہ موقع ہے کہ میں ملک کے اس قدیم ترین مدرسہ فوقانیہ کے جلسۂ تقسیم انعامات میں آج شریک ہوں۔ گورنمنٹ ہائی اسکول کی اس سرگزشت ترقی کو جس کا مسٹر پکھتال نے اپنی تقریر میں بالاختصار ذکر کیا ہے۔ سننے کے بعد اس کے مستقبل کے متعلق میری یہ توقع بیجا نہ ہوگی کہ وہ نہایت شاندار ہوگا۔ یعنی اعلیٰ پیمانہ پر ایک کامیاب کالج انتظامات دارالاقامہ کے ساتھ قائم ہوگا جس میں نواب مسعود جنگ بہادر

کے عام تجربات تعلیم خاص تجربہ طریقۂ تعلیم جاپان کے قیمتی اور عملی مشورے بھی اپنا حصہ رکھیں گے۔
اس عمل پر ایک اشارہ بیجا نہ ہوگا کہ سرکار ہر شخص سے جس پر سرکار کا روپیہ بنظر مفاد
ملک تجربہ حاصل کرنے کے لئے صرف ہوا ہے۔ عملی خدمت کی بھی توقع رکھتی ہے۔
سالہائے گزشتہ کے تعلیمی نتائج کو معلوم کرتے ہوئے مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ باوجود چند
در چند مشکلات اور موانعات کے مدرسہ کی تدریجی ترقی نہایت اطمینان بخش ہے۔
اس بناء پر میں یہ ضرور کہوں گا کہ معلمین اور متعلمین کی دلچسپی اور سرگرمی لائق تحسین ہے۔

میں ہر طرح سے ان تمام تحریکات اور تجاویز سے ہمدردی رکھتا ہوں جو
اس مدرسہ کی واجبی ضروریات کی تکمیل سے متعلق ہوں۔ اور مالی مشکلات کی میرے
نزدیک چنداں اہمیت پچھلے تجربہ کی بناء پر اس لئے نہیں ہے کہ اس مبارک دور عثمانی
میں یقیناً آپ سب کو معلوم ہے کہ تعلیمات کا موازنہ دس لاکھ روپیہ سے شاید تقریباً
ستر لاکھ تک پہنچ گیا ہے۔ اور بوجوہ احسن ابھی ترقی پذیر ہے۔ ہمارے وزیر مالیہ
نواب حیدر نواز جنگ کا یہ عقیدہ کہ فینانس تعلیم کی ایک کنیز ہے۔ صورت حال کو اور
بھی اطمینان بخش بناتا ہے۔ اس موقع پر طلبہ اور اساتذہ کو یہ مشورہ دیتا ہوں کہ وہ
صرف درسی نصاب کی تکمیل اور کھیل کود میں شہرت حاصل کرنے کو اپنا نصب العین قرار
نہ دیں بلکہ اس بات کا ہمیشہ خیال رکھیں کہ جسمانی۔ ذہنی۔ اخلاقی اور روحانی نشو و نمو
تعلیم کا مقصد حقیقی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے نظام تعلیم
ایسا ہونا چاہیے کہ ابتدا ہی سے ہر طالبعلم کی انفرادی کمزوری اس کی ذہنی خصوصیات
اور رجحانات ارباب تعلیم و تربیت کے مد نظر رہیں۔

میں جہاں تک خیال کرتا ہوں۔ ایسی تعلیم کے لئے جیسی کچھ سہولتیں درکار
ہیں وہ بالفعل ہمارے ملک کے نظام تعلیم میں خاطر خواہ موجود نہیں ہیں۔ اور ان کا
فراہم کرنا بھی بعض وجوہ سے نہایت دشوار گزار تعلیمی اور انتظامی مراحل کو طے کرنا ہے

پھر بھی اہالیانِ تعلیم اور اساتذہ اپنی اجتماعی کوشش اور دلچسپی سے وہ ماحول پیدا کرسکتے ہیں جو تعلیمی اغراض کے مقصدِ حقیقی کا اصل پیش خیمہ بن سکے۔

ایک ایسے ماحول اور فضا کا ابھی سے پیدا کرنا جس میں طلبہ کی جسمانی، ذہنی اور اخلاقی کمزوریوں کا بحد ممکنہ علاج ہو سکے۔ اسی وقت ممکن ہے جبکہ یہ بات طلبہ کے ذہن نشین ہوتی رہے کہ وہ ملک و ملت۔ مالک اور مذہب (یعنے عام انسانی برادری باہمی عزت ہمدردی اور رواداری) کے مقدس فرائض کی انجام دہی کے ذمہ دار بننے والے ہیں۔ اور ساتھ ہی طلبہ اور اساتذہ اس اعلیٰ جدوجہد میں ایک دوسرے کی واجبی اور حقیقی امدادمیں باہمی دلچسپی لیتے رہیں۔

تعلیم وہی ہے جو ہر ایک انسان کی طبعی خصوصیات کو اس طرح اُبھارے اور عملی جامہ پہنائے کہ وہ انفرادی طور پر خود اس کے لئے اور اجتماعی طور پر اُس کے ملک و ملت کے لئے مفید ثابت ہو۔

کسی طالب علم کے ذہن نشین یہ بات ہرگز نہ ہونی چاہیئے کہ تعلیم کا منشا اور منتہا معاش کے صرف ایک محدود دائرے میں جیسے ملازمت ہے کامیابی حاصل کرنی ہے۔ حقیقی معنوں میں تعلیم یافتہ وہی ہے جو ہر قسم کی محنت و مشقت کو اصول معاش کا باوقار ذریعہ سمجھے۔

ہونہار ہیں وہ نوجوان جن کے دلوں میں حصول معاش کے باوقار ذرائع پیدا کرنے اور ان کو وسعت دینے کی امنگیں ہوں اور خوش نصیب ہے وہ ملک جہاں ایسے نوجوان پیدا ہوں۔

خوش نصیب ہیں وہ طلبہ جو مدرسہ کی تعلیمی جدوجہد میں بہ کامیابی مشغول ہیں۔ اس موقع پر مجھ کو اپنے زمانۂ طالب علمی مدرسۂ عالیہ کا ایک خوشگوار واقعہ یاد آیا کہ میرے شفیق استاد مسٹر کرون نے کہا تھا کہ مدرسہ کی لائف ایک ایسی لائف

ہوتی ہے کہ جس کے گزر جانے کے بعد حسرت و آرزو بڑے بوڑھوں کو بھی ہوتی ہے کہ پھر زمانہ طالب علمی عود کر آئے۔ اور مدرسہ کے فضا و ماحول پھر نصیب ہوں حقیقت میں مدرسہ کی طالب علمی کا زمانہ ایک ایسا خوشگوار خواب ہے۔ جس کی تعبیر بعد فراغ تعلیم کاروباری زندگی میں نمایاں ہوتی ہے۔

آخر میں مسٹر چھتال اور ان عہدہ داروں کی دلچسپی پر جن کا مسٹر چھتال نے ذکر کیا ہے اظہار خوشنودی کرتا ہوں۔ اور طالب علموں کے لئے دعائے توفیق نیک پر اپنی تقریر ختم کرتا ہوں۔

آل انڈیا فیڈریشن آف ٹیچرس کانفرنس کا دوسرا سالانہ جلسہ

از جناب مولوی سید علی اکبر صاحب بی اے (کینٹب)
صدر مہتمم تعلیمات بلدہ

آل انڈیا فیڈریشن آف ٹیچرز ایسوسیشن (ہندوستان کی حدیقہ اساتذہ کی انجمن) سنہ ۱۹۲۵ء میں قائم ہوئی۔ اس انجمن کے دو اہم مقاصد ہیں۔ اولاً یہ کہ ہندوستان کے مختلف انجمنہائے اساتذہ کے کام میں اجتماعی عمل پیدا کرے۔ ثانیاً یہ کہ بین الاقوامی انجمن ہائے اساتذہ میں ہندوستان کے لئے ایک ذریعۂ نیابت قرار پا سکے۔ انجمن مذکور کا دوسرا سالانہ جلسہ پٹنہ میں بمقام ڈہیلر سینٹ ۲۹ اور ۳۰ ڈسمبر سنہ ۱۹۲۶ء کو منعقد ہوا اور تمام حصص ہندوستان کے مندوبین نے اس میں شرکت کی۔

کانفرنس نہایت کامیاب ہی۔ جس کے لیے جمعیت کے سرگرم معتمد مسٹر کھتری
صدر پرتھی ناتھ ہائی اسکول کانپور و مدیر رسالہ "ایجوکیشن" قابل مبارکباد ہیں۔ کانفرنس
کی صدارت جامعہ میسور کے پروفیسر مسٹر داڈیا نے کی۔ مسٹر سین پرنسپل بی۔ ان کالج
پٹنہ نے اپنے خطبۂ استقبالیہ میں خاص کر چار امور پر حاضرین کی توجہ مبذول کی:۔

(۱) انھوں نے استاد کے فرائض پر بحث کی۔ اور کہا کہ استاد کا مطمح نظر یہ ہونا
چاہئے کہ بچوں کے فطری قواء کو نشو و نمو دے (۲) نظام تعلیم میں اس امر کا انتظام
کیا جائے کہ طلبا زندگی کی حقیقی ضروریات کی تربیت حاصل کریں۔ اور اختتام تعلیم
پر معاش پیدا کرنے کی صلاحیت ان میں پیدا ہو جائے۔ (۳) ہم کو نظام تعلیم قومی کی
ضرورت ہے جس میں ہمارے قومی خصوصیات و اغراض پوری طرح ملحوظ رہیں اور
اس کے ساتھ ان عالمگیر قوتوں کا بھی لحاظ رکھا جائے جو بین الاقوامی حیثیت رکھتی ہیں۔
(۴) آخر میں مسٹر سین نے اساتذہ سے اپیل کی کہ وہ ہندوستان کی قدیم روایات کے
مطابق ایثار سے کام لیں اور محض معاوضہ کی خاطر کام نہ کریں۔ لیکن اس کے ساتھ
ہی مسٹر سین نے اس امر کی جانب توجہ دلائی کہ اساتذہ کے ذمہ ایک بہت بڑا قومی
کام ہے جس کے مدنظر یہ ضروری ہے کہ اون کو مالی مشکلات سے نجات دلائی جائے۔
نیز ان کے لئے ایک ایسا ماحول پیدا کیا جائے جس میں وہ اپنے فرائض کو باحسن وجوہ
انجام دے سکیں۔ مسٹر سین نے اعداد و شمار کے ذریعہ سے بتایا کہ انگلستان میں تنخواہوں
کے اضافہ کے ذریعہ سے اساتذہ کے مشکلات کو کیونکر کم کیا گیا۔ اور ہندوستان میں
بھی اس نظیر پر عمل کرنے کے لئے زور دیا۔

پروفیسر داڈیا صدر کانفرنس نے اپنے پر مغز خطبۂ صدارت میں اکثر ان مسائل
پر بحث کی جو ہندوستان کے ماہرین تعلیم کو آجکل اپنی طرف متوجہ کئے ہوئے ہیں
لیکن ایک خیال جو پورے خطبہ پر حاوی تھا وہ قومی اتحاد کا خیال تھا۔ پروفیسر صاحب موصوف

نے فرمایا کہ ہندوستان متعدد اختلافاتِ تہذیب، مذہب اور روایات سے پُر ہے۔ اور اس کے لئے ایک ایسے نظام تعلیم کی ضرورت ہے جو اتفاق و اتحاد پیدا کرے۔ ہندوستان میں جو اتحاد کا جدید احساس پیدا ہوگیا ہے۔ وہ مغربی تہذیب اور انگریزی تعلیم کا نتیجہ ہے۔ اس احساس کو بہر طور قائم رکھنا چاہیئے۔ ہم کو ہر قسم کی تنگ نظری نظر انداز کردینا چاہیئے۔ اور مختلف تہذیبوں سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ تہذیب کا جذبہ قوم کی رُوح رواں ہے اور ہم کو بلالحاظ ملک وملت اس کو اختیار کرنا چاہیئے ہمارے ملک سے فرقہ بندی اُسی وقت دور ہوسکتی ہے جبکہ تہذیب (کلچر) یہاں غالب آجائے۔

وہ اشخاص جن کو ہندوستان کی فلاح و بہبود کا حقیقی احساس ہے پروفیسر واڈیا کے اس خیال سے اتفاق کریں گے کہ قومی اتحاد کا تقاضا یہ ہے کہ کسی خاص فرقہ کی تہذیب (کلچر) کے بجائے ایک ایسی تہذیب کو نشو و نمو دیجائے۔ جو مختلف فرقوں میں مشترک اور وسیع النظری پر مبنی ہو۔ مگر اس کے بعد پروفیسر واڈیا نے قومی اتحاد کی بناء پر دیسی زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کی جو مخالفت کی ہے وہ غور طلب ہے اون کا استدلال یہ تھا کہ ہندوستان میں متعدد زبانین ہیں۔ اور بغیر ایک مشترکہ زبان کے قومیت پیدا نہیں ہوسکتی۔ نیز یہ انگریزی زبان ہی کو جس نے ڈیڑھ سو برس کے عرصہ میں اس ملک میں مضبوط جڑ پکڑ لی ہے۔ مشترکہ زبان قرار دیا جاسکتا ہے۔ ممکن ہے کہ ہندی شمالی ہندوستان کی مشترکہ زبان ہو۔ لیکن جنوبی ہند کے باشندوں کے لئے وہ ایک اجنبی زبان ہے۔ بلکہ ان کے لئے اس کا حصول انگریزی سے زیادہ مشکل ہے۔ پروفیسر واڈیا کا یہ خیال حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔ جنوبی ہند کی زبانین اس میں شک نہیں کہ ہندی سے مختلف ہیں لیکن وہ ہندی سے ایسی مختلف نہیں ہیں جیسی کہ انگریزی سے ہیں۔ مگر یہاں قابل غور نکتہ یہ ہے کہ

پروفیسر واڈیا کو دیسی زبانوں کے ذریعۂ تعلیم بنائے جانے کے متعلق سراسر غلط فہمی ہوئی ہے۔ اس تحریک کا منشا یہ نہیں ہے کہ کسی خاص دیسی زبان کو تمام ہندوستان میں ذریعۂ تعلیم قرار دیا جائے بلکہ اس کی غرض وغایت یہ ہے کہ ہندوستان کے مختلف حصص کے باشندوں کو اُن کی مادری زبان میں تعلیم دی جائے۔ خواہ وہ زبان ہندی ہو یا کنڑی۔ مرہٹی ہو یا بنگالی۔ تاوقتیکہ ایسا نہ کیا جائے تعلیم نہ تو اصولی ہو سکتی ہے اور نہ قومی۔ اب رہا اتحاد کا وہ احساس جس کا باعث انگریزی زبان ہوئی ہے۔ تو وہ نصاب تعلیم میں انگریزی کو صرف بحیثیت زبان کے قائم رکھ کر باقی رکھا جا سکتا ہے۔ اگر انگریزی کو ہندوستان کی مشترکہ زبان قرار دینے کے سوائے چارہ نہیں ہے تو اس سے لازم نہیں آتا کہ اس کو ذریعہ تعلیم ہی کی حیثیت سے جاری رکھا جائے۔

قومی اتحاد کی بنا پر پروفیسر واڈیا نے مذہبی تعلیم کی بھی مخالفت کی۔ صدر صاحب موصوف نے فرمایا کہ ہندوستان میں سب سے بڑی ضرورت اس امر کی ہے کہ ہر ایک ہندوستانی یہ محسوس کرے کہ وہ بجائے کسی خاص فرقہ کا فرد ہونے کے ہندوستان کا فرد ہے۔ اگر مختلف مذاہب کے فروعات کی تعلیم دی جائیگی تو یہ ضرورت پوری نہیں ہو سکتی۔ علاوہ بریں مذہب ایک ایسا نازک بحث ہے کہ مدارس میں اس کی تعلیم خطرہ سے خالی نہیں ہے۔ پس مناسب ہوگا کہ بچے کی مذہبی تعلیم اس کی ماں پر چھوڑ دی جائے۔

ہر شخص اعتراف کرے گا کہ ہندوستان کے مدارس میں مذہبی تعلیم قومی اور روحانی نقطہ نظر سے بہت کچھ نزاکت رکھتی ہے۔ لیکن یہ امر بہت مشکوک ہے کہ آیا ماں بہ نسبت مدرسہ کی تعلیم کے گھر پر بہتر تعلیم دے سکتی ہے خصوصاً ہندوستان میں جہاں تعلیم نسواں اسقدر پستی میں ہے۔ اگر مذہبی تعلیم کو مدارس میں ایسے اساتذہ کے حوالہ کیا جائے جو تعصب سے بری ہوں اور بچوں کو انکا

مذہب سکھانے کے ساتھ ان کے دلوں میں دیگر مذاہب کا وقار پیدا کریں تو قومی اتحاد میں اس سے خلل واقع ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ مذہبی تعلیم پر پروفیسر واڈیا کے خیالات کی توثیق کانفرنس نے نہیں کی۔ چنانچہ منجملہ دیگر تجاویز کے کانفرنس میں یہ قرارداد منظور ہوئی کہ اسکولوں اور کالجوں میں مذہبی تعلیم کا انتظام ہونا چاہیے۔

پروفیسر واڈیا نے موجودہ نظام تعلیم کے نقائص پر بھی بحث کی اور ان کے ارتفاع کے لیے قیمتی مشورہ دیا۔ ان کی رائے میں موجودہ نظام تعلیم کا بنیادی نقص یہ ہے کہ ہندوستانی ذہن اور ہندوستانی زندگی کے خصوصیات کا اس میں لحاظ نہیں رکھا گیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک طرف تو تعلیم یافتہ ہندوستانی جمہور سے بالکل الگ ہوگئے ہیں۔ اور دوسری طرف اول الذکر جدید آزاد خیالی کو گذشتہ زمانہ کی قدامت پسندی ہے جس سے وہ اپنے کو علحدہ نہیں کر سکتے تطبیق نہیں دے سکتے۔ بعدازاں پروفیسر واڈیا نے فرمایا کہ ہندوستان میں معلم اور متعلم کے مابین وہ روابط نہیں ہیں جو ہونے چاہئیں تعلیم یافتہ نوجوانوں کی بیکاری کے مسئلہ کے متعلق جناب صدر نے فرمایا کہ اس مسئلہ کے حل کے لیے صنعتی و پیشہ کی تعلیم کی ضرورت ہے لیکن اس کیساتھ اس امر پر زور دیا کہ یونیورسٹی کی تعلیم کا مقصد طلبہ میں اکلچر ا تہذیب کا پیدا کرنا ہے نہ کہ حصول معاش کے لئے ان کو طیار کرنا صاحب موصوف نے اسی پر افسوس ظاہر کیا کہ ہر قسم کے طلبہ یونیورسٹی میں داخل ہوجاتے ہیں۔ اور فرمایا کہ صرف ان ہی طلبہ کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنی چاہیے۔ جن کو اس کا ذوق ہے۔

سلسلہ تقریر کو جاری رکھتے ہوئے پروفیسر واڈیا نے فرمایا کہ موجودہ نظام تعلیم کے نقائص رفع کرنے میں تین مسائل درپیش ہوتے ہیں (۱) اولاً استاد کی معاشی حالت: اساتذہ کو مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ انکی خانگی ضروریات

پورا کرنا کافی نہیں ہے۔ انکو کتابیں خریدنے کی بھی استطاعت ہونی چاہئیے۔ جس کے بغیر وہ علمی مضامین میں کامل نہیں ہو سکتے اور نہ اپنے پیشہ کے فرائض کو باحسن وجوہ انجام دے سکتے ہیں (۲) دوسرا مسئلہ پیشۂ معلمی کے لئے موزوں افراد کی فراہمی کا ہے عموماً لوگ اس پیشے کو اسی وقت اختیار کرتے ہیں جب دوسرے ذرائع معاش کو اپنے لئے مسدود پاتے ہیں ایسے اشخاص میں اس جوش اور ولولہ کی کمی ہوتی ہے جو اس پیشہ کیلئے ضروری ہے پس، اساتذہ کے انتخاب میں شدید احتیاط کی ضرورت ہے۔ (۳) تیسرا مسئلہ اساتذہ کی ٹریننگ (تربیت) کا ہے۔ آن ٹرینڈ (غیر تربیت یافتہ) اساتذہ یہ نہیں جانتے کہ ان سے کیا توقعات وابستہ ہیں۔ یہ مطمح نظر کہ امتحانات مقصد نہیں بلکہ ذریعہ حصول مقصد قرار پائیں۔ اسوقت پورا ہو سکتا ہے جبکہ موزوں اساتذہ جنھوں نے معقول تربیت حاصل کی ہو مہیا کئے جائیں۔

آخر میں مسٹر واڈیا نے ملک کی تعلیم کی اصلاح کیلئے حسب ذیل تجاویز پیش کیں

(۱) طلباء کو ان کے رجحان اور استعداد کے مطابق تعلیم اور تربیت دیجائے۔

(۲) طلباء کو دستی کام سکھانے کا کافی انتظام کیا جائے تاکہ اگر ایک طرف انکی جاہ طلبی جسکی وجہ سے وہ اس کام سے نفرت کرتے ہیں زائل ہو تو دوسری جانب محنت کا وقار ان کے دلوں میں قایم ہو جائے۔

(۳) ہندوستانی طلبہ کا وہ میلان جو محض کتابی مطالعہ کی طرف ہے۔ دور کیا جائے اور اُن کے ذہن کی نشو و نمو کے ساتھ جسمانی نشو و نمو کو بھی ملحوظ رکھا جائے۔

(۴) طلبہ کو حفظان صحت کی تعلیم دیجائے جس کے ساتھ بالغ طلبہ کو مزید ضروری امور سے بھی باخبر کیا جائے۔

منجملہ دیگر اہم تجاویز کے جو جلسہ میں قرار دادوں کی شکل میں منظور ہوئیں۔ حسب ذیل قابل ذکر ہیں:-

(۱) اس کانفرنس کی رائے ہے کہ ایک وسیع پروگرام کے تحت پختہ عمروں کی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔

اس تجویز کے پیش کرنے کی عزت مجھے حاصل ہوئی۔ میں نے پختہ عمروں کی تعلیم کے فوائد بتائے۔ اور مسٹر بنرجی (مالیر کوٹلہ پنجاب) نے اس کی تائید کرتے ہوئے پنجاب میں اس بارے میں جو کام ہو رہا ہے۔ اسکی تفصیل بیان کی۔

(۲) کانفرنس ہذا ٹیچرز رجسٹریشن کونسل انگلینڈ کے اصول کی تائید کرتی ہے اور مختلف صوبہ جات اور ریاستوں کی حکومتوں سے استدعا کرتی ہے کہ ہندوستان میں بھی اس قسم کی ایک کونسل کے قیام کی جلد تدابیر اختیار کی جائیں۔

اس قرارداد کو پیش کرتے ہوئے مسٹر کھتری بی۔ اے۔ ال۔ ٹی صدر پرھی ناتھ ہائی اسکول کانپور نے فرمایا کہ اگر قانوناً اساتذہ کی رجسٹری کا انتظام ہو جائے تو ان کے مرتبہ اور وقار میں معتد بہ اضافہ ہو جائیگا۔ مختلف طبقوں کے اساتذہ کے مفاد باہم بہت کچھ مشترک ہیں اور مثل اساتذۂ انگلستان کے، ہندوستان کے اساتذہ کو بھی اپنی تنظیم کرنی چاہئے تاکہ ان تمام امور کی نسبت جو ان کے پیشہ سے متعلق ہیں، ان کو اپنی رائے کے اظہار کا موقعہ اور مسلمہ حق حاصل ہو۔ پس اس امر کی ضرورت ہے کہ انکے پاس پیشۂ معلمی کو انجام دینے کی اہلیت رکھنے والوں کا ایک رجسٹر ہو، مسٹر کھتری نے اعتراف کیا کہ ہندوستان میں ٹرینڈ اساتذہ کی کمی ایسی تنظیم میں سدِ راہ ہے۔ لیکن انھوں نے فرمایا کہ تجربہ کو کافی ٹریننگ قرار دیکر اس مشکل کو دور کیا جا سکتا ہے۔

(۳) مدارس ثانویہ کی انتظامی کمیٹیوں کی ترکیب کے متعلق کلکتہ یونیورسٹی نے جو قواعد منظور کئے ہیں انکی یہ کانفرنس تائید کرتی ہے اور ہندوستان کے دوسرے حصوں میں اسکی ترویج کی سفارش کرتی ہے۔

رائے صاحب سری رام داس گوسوامی (بنگال) اس قرارداد کے محرک تھے،

صاحب موصوف نے فرمایا کہ اساتذہ اور انتظامی کمیٹیوں کے مابین آئے دن جھگڑے پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ جن میں اوّل الذکر کو بالعموم نقصان پہونچتا ہے، شکست اُٹھانی پڑتی ہے۔ بنا بریں بنگال کی انجمن اساتذہ کے توجہ دلانے پر کلکتہ یونیورسٹی نے مدارس کے لئے ایک ضابطہ بنایا ہے۔ جس کی رو سے ہر ایک غیر سرکاری مدرسہ کی انتظامی کمیٹی میں چند ایسے اراکین کا ہونا ضروری ہے۔ جو مدرسین، طلبہ اور سرپرستوں کے منتخبہ ہوں۔

(۴) مرکزی اور صوبہ جاتی مجالس وضع قوانین میں مدرسین کو حق نیابت دیا جائے۔

(۵) جن اساتذہ کی مُدت ملازمت تین سال یا اس سے متجاوز ہو انکو امتحانات معلمی میں خانگی طور پر شرکت کی اجازت دیجائے۔

اس کے علاوہ حسب ذیل امور کے متعلق بھی تجاویز منظور ہوئیں:-

ا بوائے اسکاؤٹنگ (طلیعہ) کی اشاعت و ترقی کیلئے ممکنہ کوشش کیجائے۔

ب سرکاری و غیر سرکاری مدارس کے اساتذہ کے تنخواہوں اور دیگر شرائط ملازمت کی عدم مساوات کو دور کیا جائے۔

ج مدارس کے تسلیم کرنے کے لئے ایک یہ شرط بھی لگائی جائے کہ معلم اور انتظامی کمیٹی کے مابین ایک صریح معاہدہ ملازمت ہوا کرے۔

د صوبجات کی انجمن ہائے اساتذہ کو چاہیئے کہ اساتذہ کی معاشی حالت کو دریافت کریں۔

ہ ہر مدرسہ میں ایسا انتظام کیا جائے کہ اساتذہ کو باہمی تبادلہ

خیالات اور معلومات کو بڑھانے کا موقع ملے۔

سر محمد فخر الدین صاحب وزیر تعلیمات بہار و اڑیسہ کانفرنس کی پہلی نشست میں تشریف فرما تھے۔ اور ایک مختصر تقریر میں انہوں نے وعدہ فرمایا کہ کانفرنس کی تجاویز پر خاص توجہ فرمائینگے۔ خصوصاً اسوجہ سے کہ یہ قرار دادیں ہندوستان کے تمام حصص کے اساتذہ کی متحدہ مشورہ پر مبنی ہیں۔

کانفرنس کا دوسرا دن لکچروں کے لئے وقف کیا گیا تھا۔ چونکہ پروفیسر واڈیا کسی خاص ضرورت سے شب گذشتہ پٹنہ سے چلے گئے تھے۔ اس لئے پروفیسر سی شادری صدر آل انڈیا فیڈریشن آف ٹیچرز ایسوسی ایشن نے صدارت کی کرسی کو رونق بخشی۔ پروفیسر صاحب موصوف نے "سنہ ۱۹۲۶ء میں ہندوستان کی تعلیمی حالت" کے عنوان سے ایک نہایت دلچسپ اور سبق آموز تقریر کی انہوں نے فرمایا کہ مثل سال گزشتہ ۱۹۲۶ء میں بھی پنجاب کی کارگزاری بہترین رہی۔ پختہ عمروں کی تعلیم اور تعلیم نسواں صوبہ مذکور میں بیحد ترقی کر رہی ہے۔ اور دوسرے صوبجات کے لئے پنجاب نے ایک اور عمدہ نظیر جو قائم کی ہے وہ یہ ہے کہ صوبہ کے غیر ترقی یافتہ مقامات میں تعلیمی امداد خاص طور پر دیجاتی ہے۔ پروفیسر سی شادری نے سر جارج انڈرسن ناظم تعلیمات پنجاب کی کارگزاری کی توصیف کرتے ہوئے یہ رائے ظاہر فرمائی کہ اگر موجودہ رفتار ترقی جاری رہے تو دس سال کے عرصہ میں پنجاب میں کوئی ناخواندہ شخص باقی نہ رہے گا۔ بہار واڑیسہ اور ممالک متحدہ کی نسبت پروفیسر سی شادری نے بیان کیا کہ ان ہر دو صوبجات میں خواندہ اشخاص کی تعداد کم ہے۔ لیکن اضافہ کی کوشش کیجارہی ہے۔ اور کلکتہ یونیورسٹی کی وائس چانسلری کی خدمت کیلئے سر جادوناتھ سرکار کے منتخب ہونے پر اس وجہ سے اظہار طمانیت کیا کہ ان کا تعلق پیشۂ معلمی سے ہے۔ سلسلہ تقریر کو جاری رکھتے ہوئے پروفیسر صاحب موصوف نے فرمایا کہ صوبۂ مدراس میں جدید اندھیرا یونیورسٹی نے تلنگی کو ذریعۂ تعلیم

قرار دینے کا تصفیہ نہیں کیا ہے۔ بڑودہ میں بھی گجراتی کو ذریعۂ تعلیم قرار دینے کی نسبت غور کیا جا رہا ہے۔ کسی دیسی زبان کو ذریعۂ تعلیم قرار دینے میں بہت غور و احتیاط کی ضرورت ہے۔ اور اس وقت تک یہ طریقہ اختیار نہ کرنا چاہیئے۔ جبتک کہ اس زبان میں تصانیف کا کافی ذخیرہ مہیا نہ ہو جائے۔ اس بارے میں پروفیسر شاوری نے دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کی کارگزاری کا اعتراف کیا، حکومت سرکار نظام نے تعلیمات اور آثار قدیمہ کے سررشتہ جات کے متعلق جو فیاضانہ پالیسی اختیار کی ہے صاحب موصوف نے اسکی توصیف کی۔ عثمانیہ یونیورسٹی کا ذکر کرتے ہوئے صاحب موصوف نے فرمایا کہ نہ معلوم یہ دعویٰ کہاں تک صحیح ہے۔ کہ یہ تجربہ بہت کامیاب ہوا ہے۔ بحیثیت ممتحن کے مجھے تجربہ ہوا ہے کہ انگریزی کا معیار دوسری یونیورسٹیوں کے مقابلہ میں گرا ہوا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میں نے قانون اور تاریخ کے ممتحنین کو یہ کہتے سنا ہے کہ عثمانیہ یونیورسٹی کے طلبہ کو قانون اور تاریخ پر بہ نسبت دیگر یونیورسٹیوں کے طلباء کے زیادہ عبور حاصل ہے۔ قابل مقرر نے صوبہ بمبئی کا ذکر کرتے ہوئے افسوس ظاہر کیا کہ بمبئی یونیورسٹی کی اصلاح کیلئے جو رپورٹ مرتب ہوئی ہے۔ اس پر ہنوز کوئی کارروائی نہیں کیگئی۔ اور انہوں نے ابتدائی تعلیم کے متعلق حکومت بمبئی کے تساہل پر بھی تاسف کیا۔

مسٹر ماتھر ہیڈ ماسٹر جانکی پرشاد اے ایس ہائی اسکول خورجہ نے مدرسۂ مذکور میں ڈالٹن طریقہ تعلیم کے مطابق جو کام ہو رہا ہے۔ اُس پر ایک تقریر کی صاحب موصوف نے فرمایا کہ ڈالٹن طریقہ تعلیم کی وجہ سے مدرسہ بہت ترقی کر رہا ہے گو ابتداء میں طلبہ آزادی کا برا استعمال کرتے تھے۔ اور اپنے وقت کو بھی ضائع کرتے تھے لیکن ذمہ داری کے احساس نے انہیں درست کر دیا ہے۔ اور بجائے سالانہ امتحان سے دو ایک ماہ پیشتر تک غافل رہنے کے جیسا کہ وہ پہلے کیا کرتے تھے اب وہ

روزانہ اپنا کام خاکہ کے مطابق شوق سے انجام دیتے ہیں۔ اس کے ساتھ جب اساتذہ پر یہ فرض عائد ہوگیا کہ وہ ہر لڑکے کی فرداً فرداً نگرانی کریں تو وہ ایسے طریقے اور وسائل دریافت کرنے لگے جس سے وقت اور محنت میں کفایت ہو۔ مزید براں وہ یہ بھی محسوس کرنے لگے کہ طلبہ کے ساتھ اُن کے روابط بڑھتے اور زیادہ خوشگوار ہوتے جا رہے ہیں۔

تختۂ سیاہ کے استعمال اور پنجاب کی تعلیمی حالت پر بھی تقریریں ہوئیں۔

نمایش تعلیمی

کانفرنس کے موقعہ پر ایک نمایش تعلیمی بھی بمقام بہار نیشنل کالج پٹنہ ترتیب دی گئی تھی جس کا افتتاح سر محمد فخر الدین صاحب وزیر تعلیمات بہار و اوڑیسہ نے ۲۸ ڈسمبر کو فرمایا، نمایش بہت مختصر پیمانہ پر ترتیب دی گئی تھی اور اس میں زیادہ تر معمولی نقشہ جات، ڈرائنگ کے نمونے مختلف چارٹ اور چوبی و گلی نمونے تھے جو شمالی ہند کے چند مدارس کے طلبہ کے تیار کئے ہوئے تھے۔ بہرحال ایک بنیاد ڈالدی گئی ہے اور امید کیجاتی ہے کہ آیندہ کانفرنس کی طرح نمایش بھی تمامی ہند کا مسئلہ قرار پا جائے گی۔

(از محمد عبد النور صاحب صدیقی بی۔ اے صدر مدرس مدرسہ سلطانیہ شاہ گنج)

یہ اصول مانا ہوا ہے کہ پڑھاتے وقت "آسان سے مشکل کی طرف رجوع کیا جائے"

مگر اس مقصد کے حاصل کرنے میں سب سے پہلے ہمیں اس چیز پر غور کرنا چاہیئے جو اہم ترین ہے یعنے جماعت میں نظم کا قائم رکھنا، جبتک ضبط قائم نہو، تعلیم دینا ممکن ہی نہیں۔ یہ دونوں اُمور لازم و ملزوم ہیں۔ ضبط محض تعلیم کے لئے ہے نہ کہ ضبط کے واسطے تعلیم۔ تعلیم مقصد ہے اور ضبط اُس کے حصول کا ذریعہ۔ جن لوگوں نے اس میدان میں سب سے پہلے قدم رکھا ہو۔ انہیں بہتیری دشواریاں پیش آتی ہیں تاہم پست ہمت نہونا چاہیئے۔ کیونکہ مدرسین کو یہ چیزیں عموماً تکلیف دینے والی ہوتی ہیں بعض مدرسین کی شخصیت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ گویا وہ ماں کے پیٹ سے نظم قائم رکھنے کیلئے پیدا کئے گئے ہیں۔ انکے لئے یہ امر چنداں تکلیف دہ نہیں مگر اُن مدرسین کیلئے یہ ٹیڑھی کھیر ہے جو ارادہ کے قوی نہیں ہوتے۔ اور یہ ایک ایسا ہنر ہے جسے حاصل کرنا پڑتا ہے بشرطیکہ صحیح اُصول پر کاربند رہکر محنت سے کام کیا جائے۔

یہ امر مسلمہ ہے کہ اچھا ضبط مدرسین کیلئے لازمی ہے جس کے بغیر اُمید نہیں کہ وہ اپنے فرائض کو بوجہ احسن انجام دیسکے، بادی النظر میں ضبط، خاموشی یا سکوت کا مترادف سمجھا جاتا ہے یعنے لڑکے خاموش اور باترتیب ہوں اور مدرس کیطرف بظاہر آنکھیں لگائے ہوں۔ یہ ضبط کا ہرگز منشا نہیں ہے بلکہ وہ اس سے بھی برتر اور بالا چیز ہے یعنے ظاہری سکوت اور توجہ کے علاوہ طلبہ میں مدرس کے مجوزہ طریقہ پر ذہنی تحریک بھی ہو۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس مقصد کو کسطرح حاصل کیا جا سکتا ہے پڑھانے والا چند اصول پر عمل کرکے ضرور فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ مگر ضروری چیز مدرس کی شخصیت ہے۔ جسکا اظہار مختلف طریقہ پر جماعت میں ہوتا رہتا ہے۔ یہ زیادہ تر حرکات و سکنات اور مدرس کے آداب پر منحصر ہے۔ مدرس کی عملی زندگی لفظی پند و نصائح سے زیادہ مفید ہے۔ جو شخص اپنے نفس پر قابو نہ رکھ سکے۔ وہ ہرگز دوسرے پر بھی اپنا اثر قائم نہیں رکھ سکتا۔ استاد بچے کیلئے ایک آئینہ ہے جس میں وہ اپنے

دیکھتے ہیں۔ اس لئے استاد کے آئینہ دل کا یہ کام ہے کہ وہ طلبا کے خط وخال کو صاف اور واضح طور پر ظاہر کرے۔ استاد اپنی شخصیت کو جسطرح پیش کرے گا ویسے ہی بچے بھی اس کی تقلید کریں گے۔ اُن کی عدم پابندی یا دیر حاضری کی برداشت کرنے والے زیادہ تر استاد ہی ہیں۔ اگر استاد پابند نہیں تو بچے بھی پابند نہ ہونگے۔ جب پڑھانیوالا لاپروائی یا کاہلی سے کام کرے تو پڑھنے والے بھی کاہل اور لاپروا بن جائیں گے۔ کسی نے سچ کہا ہے "جیسا استاد ویسا شاگرد" غرضکہ اچھا ضبط قائم رکھنے کے لئے اچھی شخصیت درکار ہے۔ اگر کسی کو پہلی مرتبہ جماعت میں پڑھانے کیلئے کھڑا کر دیا جائے اور وہ اچھی شخصیت والا ہو تو بلاشبہ نظم قائم رکھنے میں کافی مدد ملے گی۔ ورنہ بچوں کو جس ڈھب پر لگا یا جائیگا وہ اسی طرح کچھ عرصہ بعد کام کر سکیں گے۔ جیسی زمین کی تیاری ہوگی فصل بھی ویسی ہی ہوگی۔ لہذا نظم کا تمام دارو مدار مدرس کی شخصیت پر ہے۔ اگر کوئی دلچسپ بات بچوں سے بیان کیجائے تو عموماً وہ سننے کیلئے آمادہ پائے جائیں گے۔ ورنہ روکھی پھیکی صورت میں ایک انگڑائی لے گا تو دوسرا ناخن کترتا ہوا پایا جائیگا۔ تیسرا ہی ہی کی آواز کرے گا۔ غرض کہ کوئی نہ کوئی صورت اپنی مصروفیت کی وہ نکال لیں گے۔ اُصول تدریس کی اولیں شرط یہ ہے کہ استاد اچھی طرح مطالعہ کرکے جائے نیز یہ معلوم کرے کہ کونسی بات کس طریقہ پر سمجھائی جائے کہ فوراً دل میں اتر جائے اور طالب علم دشواری محسوس نہ کرسکے جہاں یہ بات طلبار کو معلوم ہوگئی کہ مدرس صاحب ہماری تشفی نہیں کر سکتے۔ تو ضبط میں یقینی خلل واقع ہوگا۔ اور بعید نہیں کہ کوئی ذہین طالب علم اپنی ذکاوت اور خداداد شوخی سے مدرس صاحب کی اس کوتاہی کو جماعت پر واضح کر دینے میں کامیاب ہو جائے۔

جماعت میں مدرس کو ہمیشہ یہ توقع نہ رکھنی چاہئے کہ ہر طالب علم شروع سے

اخیر تک ہمہ تن متوجہ رہیگا۔ بسا اوقات مختلف اسباب کے باعث ابتدا سے انتہا تک لڑکے متوجہ نہیں رہتے ہیں۔ اور اُن سے متوجہ رہنے کیلئے کہنا پڑتا ہے مگر توجہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو پہلے سے اُن کے پاس رکھی ہوئی ہو اور وہ طلب کرنے پر پیش کردیں۔ طلبا میں متوجہ رہنے کی عادت ڈالنا ایک مستقل سبق ہے جو مدرس دلکش طریقۂ تعلیم کے ذریعہ سے بچوں کو سکھائے جیسے کہ اور چیزیں سکھائی جاتی ہیں۔ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ لڑکے بدنظمی کو پسند کرتے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ وہ ہمیشہ مائل بہ حرکت رہتے ہیں۔ مگر اسکا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے۔ جو بادی النظر میں محسوس نہیں کیا جاتا کیونکہ یہ تو بطور کلیے کے کہا جا سکتا ہے کہ بچے کا کوئی کام بلا مقصد نہیں ہوتا۔ پس مدرس اس سے مطلع ہو کر انہیں کوئی ایسا کام بتائے جو بطور علاج بالمثل ان کے مقصد کے موافق ہو۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کامل سکوت و دلچسپی کے ساتھ وہ متوجہ رہیں گے نہ صرف یہی بلکہ کافی ذہنی تحریک کا ثبوت بھی ملے گا۔ اسلئے بچوں کو خاصا کام دیا جائے اور خاصی تبدیلی اُن کے مشاغل میں ہو تا کہ اُکتا نہ جائیں اور انہیں کبھی سست نہ رکھا جائے (ورنہ بقول کسی کے "شیطان انہیں بہکائے گا")۔ اور ظاہر ہے کہ پڑھانے والے کے لئے صاف ہار رکھی ہوئی ہے۔ مدرس کوئی نہ کوئی چیز ہر وقت ایسی رکھے کہ لڑکے متوجہ رہیں۔ عدم توجہی مثل خود رو مرض فالج کے ہے جو مدرس کی تمام محنت نیز غایت درس کو غارت کر دیتی ہے یا مثل اس بیل کے ہے جو ناقص طریقے پر تیار کی ہوئی زمین سے اُگ کر سارے کھیت کا ستیاناس کر ڈالتی ہے)۔ مصروفیت کا یہ مطلب نہیں کہ صبح سے لے کر شام تک کام ہی کام ہو اور کوئی وقفہ۔ آرام و تفریح کے لئے نہ دیا جائے۔ وقفہ ہو اور ضرور ہو مگر موقع اور محل سے۔ کیونکہ کسل دور کرنے اور دل بہلانے کی جگہ بازی گاہ ہے نہ کہ جماعت۔

ضبط قائم رکھنے کے لئے آنکھ ۔ آواز ۔ کان اور حرکات و سکنات سے استاد کو مدد مل سکتی ہے کان ہی کو لو جو کم سے کم ایسے تیز ہوں کہ معمولی "سی سی" کی آواز سن سکیں ۔ جو ابتدا میں معمولی معلوم ہوتی ہے مگر انتہائی شور و شغب کا پیش خیمہ ہوتی ہے ۔ اور یہی بات عدم توجہی کی ابتدا ہے ۔ جس کا سدباب اسی وقت ہونا چاہئے تاکہ بعد کو پیش آنے والی مہیب صورت سے اطمینان ہو جائے ۔ ساتھ ہی یہ جتا دینا بھی ضروری ہے کہ بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ جنھیں نہ سننا مدرس کی عین دانشمندی ہے ' ایسا بھی وقت ہوتا ہے کہ استاد بہرا بن جائے اور سنی کو ان سنی کر دے ۔ اسی کا نام چشم پوشی ہے جو استاد کیلئے ضروری ہے لیکن یہ تجربہ ہی سکھائے گا ۔ کہ کب بچوں کی معمولی سی بات کی گرفت کرے اور کب سنی ان سنی کر دے ۔

جماعت میں بعض استادوں کا طریقۂ کار سخت اور بیحد خشک ہوتا ہے حالانکہ زندہ دلی ' اور خندہ پیشانی کی بھی ضرورت ہے ۔ اس کے لئے مدرس اپنے حرکات و سکنات سے مدد لے سکتا ہے ۔ جو بچوں کے حق میں مسرت بخش ہوتے ہیں مگر یاد رہے کہ یہ کم ہوں ' معنی خیز ہوں اور سلیقے کے ساتھ کئے جائیں اور علمی ذوق لئے ہوئے ہوں ورنہ طلبا مضحکہ اڑائیں گے جس سے ضبط اعلیٰ باقی نہ رہے گا ۔

اچھا نظم قائم رکھنے کے لئے ہمیشہ حکم دینے کی ضرورت نہیں پڑتی ۔ بار بار حکم دینا حکم کی وقعت کو کھو دینا ہے ۔ جماعت میں تحکم کی ضرورت ہے لیکن حکومت ایسی ہو کہ مدرس کے احکام اور مطالب جنبش مژہ ' نظر اور معمولی اشارے سے سمجھ لئے جائیں اور زبان ہلانے کی ضرورت نہ ہو ۔ زبانی حکم دینے سے بیشتر یہ غور کر لیا جائے کہ حکم واجبی ہو جسکی تعمیل کرنا ممکن اور مفید ہو ۔ اس لئے زبانی حکم حتی الوسع بہت ہی کم ہوں اور ان کا بار بار اعادہ نہ کیا جائے ورنہ بے توجہی سے کام کیا جائے گا ۔

احکام کی زیادتی اور کثرت سے جماعت میں سکوت تو قائم ہو جائیگا۔ مگر اس طریقہ سے ضبط نہ پیدا ہو سکے گا۔

طلباء کو متوجہ کرنے کیلئے مدرس ہرگز التجا یا درخواست نہ کرے۔ بعض مدرسین کو یہ کہتے ہوئے سنا گیا ہے۔ بھئی خاموش رہو خدا کے واسطے سنو وغیرہ۔ یہ غلطی ہے۔ اسکا مطلب یہ ہوگا کہ مدرس اپنی کمزوری کا اعتراف کر رہا ہے۔ طلباء ڈھیٹ ہو جائیں گے یہ بھی غلطی ہے کہ استاد بار بار تحکم جتائے۔ بہتر صورت یہ ہے کہ کوئی معیار ضبط کا قائم کیا جائے اور جماعت میں جب تک معیار کے مطابق ضبط قایم نہ ہوے پڑھائی شروع نہ کیجائے خصوصاً بتدی کے لئے یہ ایک فاش غلطی ہے کہ دھمکی دیکر ضبط قائم کرنے کی کوشش کرے۔ دھمکیوں کی ہرگز ضرورت نہیں ہے اور اس سے احتراز کرنا ایک باکمال مدرس کے لئے نہایت ضروری ہے اور حقیقت یہ ہے کہ مدرس خود ایک کمال ہے اور یہ کمال بغیر سعی بلیغ کے حاصل نہیں ہو سکتا ہے۔ کوئی مدرسہ کیوں نہو۔ یہ یاد رہے کہ ہر لڑکے میں چند خوبیاں ضرور ہونگی۔ بشرطیکہ اُن سے مدد لینے کی کوشش کیجائے۔ اگر ان خوبیوں سے فائدہ اٹھایا جائے تو ہرگز طلباء کو دھمکیوں کا نشانہ بنانے کی ضرورت نہوگی۔ دھمکیوں کے ذریعہ سے ظاہری ضبط تو قائم ہوجاتا ہے لیکن ایسے ضبط کی کچھ قدر و قیمت نہیں ہوتی۔

ہمدردی ایک ایسی چیز ہے جس سے ضبط قائم رکھنے میں کافی مدد ملتی ہے اگر چھوٹے لڑکے پڑھانے کو ملیں تو بلا ہمدردی، شفقت اور ملائمت کے غالباً ان سے کچھ کام نہ لے سکینگے۔ اگر کوئی طالب علم اپنے کام کو اچھی طرح انجام نہیں دیرہا ہے تو مدرس فوراً ہی اُسے الزام نہ دے اور نہ ایک دم الجھ پڑے۔ ورنہ لڑکے کے دل میں جو عزت مدرس کی ہے وہ باقی نہ رہے گی اور بچوں کے دل میں جب تک استاد کی وقعت نہوگی ضبط بھی قایم نہ رہ سکے گا۔ اس کے ساتھ ہی ہمیشہ مدرس طلبا کی محنت

اور قابلیت کی تعریف کرتا رہے ورنہ لڑکے پست ہمت ہو جائیں گے۔ آخر میں یہ ضروری ہے
کہ پابندی ضبط قائم رکھا جائے ایسا نہو کہ ایک دم سارا زور لگا دیا جائے یا ایک
روز سختی اور دوسرے روز نرمی کیجائے ضبط کا ہمیشہ ایک ہی معیار ہونا چاہئے تاکہ
اسی کے مطابق ہر روز عمل ہوا کرے۔ یہ یاد رہے کہ غیر معمولی واقعات اور شرارتوں
کی صورت میں کوئی نہ کوئی سزا محفوظ رکھی جائے۔ اگر آج معمولی سے معاملہ میں مدرس
اپنے پورے اقتدار اور سزاؤں کو کام میں لائے تو کل سخت خلاف ورزی کے
موقع پر کیا کیا جائے گا۔ استاد تو ظاہر کرے کہ اس کا اقتدار محدود نہیں ہے اور اسکی
سزائیں ایک سے ایک بڑی اور ختم نہونے والی ہیں۔ مگر ضبط کے معاملہ میں جوں
جوں مدرس کا تجربہ بڑھتا جائے گا بہتیرے نکات اور باریکیوں کا احساس ہوتا جائیگا
اور استاد یہ معلوم کرے گا کہ نظم کا قایم رکھنا زیادہ تر بچوں کی فطرت سے واقف
ہونے پر منحصر ہے اور جس کو استاد اپنے تجربے، بچوں کے ماحول، مدرسے کے انتظام
اور سزا کے طریقے سے معلوم کر سکتا ہے۔ مگر جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے ذہن نشین کرکے
کام شروع کرنے کیلئے کافی ہے۔ اگر ان امور کو استاد پیش نظر رکھے تو اسکی مشکلات
بہت جلد آسان ہو جائیں گی اور وہ محسوس کریگا کہ بلا ضبط کے جماعت میں پتہ بھی
ہل نہیں سکتا ہے۔ اور اگر ایکمرتبہ مدرس کی شخصیت کی محبت، وقعت اور رعب
بچوں کے دل میں جاگزین ہوگیا تو پھر کوئی شے ضبط جماعت میں خلل انداز نہیں ہوسکتی۔

(۰)

طلبہ کی کامیابی

از جناب مولوی حسام الدین صاحب (فاضل)

پیوستہ

حفاظت صحت دنیا کی ہر لذت بخش نعمت، مال ومنال اور ہر قسم کی راحت بیشک سرمایۂ زندگی ہے اور علم وکمال کی تحصیل عبادت واطاعت کی تکمیل، بلاشبہ سرچشمۂ حیات ابدی مگر ان سب کا دار ومدار ایک حد تک صحت وتندرستی پر ہے ؎

معدہ چو کج گشت وشکم درد خاست سود ندارد ہمہ اسباب راست

اگر صحت وعافیت نہو تو نعمت نعمت ہے نہ راحت راحت۔ حالت بیماری میں حصول علم تو درکنار اگر پڑھا ہوا نسیاً منسیا نہوا تو بسا غنیمت۔ عبادت واطاعت رہی ایک طرف اگر شکوہ وشکایت زبان پر جاری نہو تو عین کرامت۔ یوں تو دماغی محنت اور صحت میں کچھ عداوت ہی سی پائی جاتی ہے اگر اپنے ہاتھوں خرابی صحت کے دوسرے اسباب بھی پیدا کئے جائیں تو اور بھی ستم ہے پس طلبہ کا فرض ہے کہ تندرستی بہرحال مقدم رکھیں اور اسکو خراب کرنے والے افعال وحرکات سے بالکل کنارہ کش ہوں۔

طلبہ کیلئے حفاظت صحت چند امور کی نگہداشت میں مضمر ہے۔

(۱) **ورزش جسمانی** جس کے مفید صحت ہونے سے کوئی انکار نہیں کرسکتا مگر افسوس ہے کہ طالب علموں کو اس فائدہ مند چیز سے مس نہیں، بعضوں نے تو اسے تضیع اوقات خیال کرلیا ہے۔ مدارس میں ورزش جسمانی کا جو انتظام ہے بعض طالب علم با دل ناخواستہ

اسکو انجام دے لیتے ہیں اثر یہ ہوتا ہے کہ خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔

جسطرح ورزش مفید ہے اسی طرح اسکا بے وقت انجام پانا صحت کے لئے سخت مضر ہے۔ بعض طلبہ وقت مقررہ سے دو ایک گھنٹہ پہلے ہی مدرسہ آجاتے اور کھیل کود میں مشغول ہو جاتے ہیں حالانکہ شکم سیری کی حالت میں دوڑنا سخت نقصان کا باعث ہے ورزش جسمانی سے کنارہ کشی یا بے اعتدالی کا نتیجہ ہے کہ طلبہ کے چہروں پر رونق و تازگی بہت کم پائی جاتی ہے۔ بچپن میں ضعیفی کا سا حال ہے اور جوانی میں بڑھاپے کی کیفیت۔ پڑھتے ہیں یاد رکھنے کی قوت نہیں محنت کرنی چاہتے ہیں مگر دل و دماغ میں طاقت نہیں انکا محنت و مشقت سے پڑھنا بیمار پڑنا ہے اور سرسری طور پر تعلیم پانا ناکام رہنا۔

(۲) **سحر خیزی** صحت کے لئے نہایت ضروری ہے کہ قادر مطلق نے صبح کے وقت عجیب تاثیر رکھی ہے کہ اس فرحت بخش وقت کا لمحہ لمحہ دل و دماغ کو تازہ رکھنے میں اپنا آپ نظیر ہے جو کام بھی اسوقت کیا جاتا ہے اچھے اصول پر انجام پاتا ہے مطالعہ کیلئے یہ بہترین وقت ہے مگر بعض طلبہ پر افسوس ہے کہ انہیں ایسے سہانے وقت میں عبادت سے مطلب ہے نہ نظارہ قدرت سے۔ کتب بینی سے سروکار ہے نہ ورزش جسمانی سے ہاں خواب غفلت ہے اور بستر راحت ؎

ترسم نرسی بہ کعبہ اے اعرابی   کیں رہ کہ تو میروی بہ ترکستان است

جو طالب علم محنتی اور تحصیل کمال کے متمنی ہیں ان میں سے بھی بہت کم ہیں جو اصول سے کام کرتے ہوں یہ آدھی آدھی بلکہ پچھلی رات تک علمی مشغلہ میں سرگرم رہا کرتے ہیں۔ نیند آرہی ہے مگر مطالعہ جاری ہے غنودگی سے آنکھیں بند ہیں مگر کتاب ہاتھ سے نہیں چھوٹتی ایک ایک صفحہ میں کئی کئی سطریں بسبب غلبۂ خواب بے پڑھے ہی چھوٹ جاتی رہ گئیں۔ دماغ منتشر ہے اعضا مضمحل ہوئے جا رہے ہیں صحت پر برا اثر پڑ رہا ہے مگر

علمی محنت جاری ہے اور امتحان کی تیاری۔ نتیجہ یہ کہ اگر رات کے گیارہ بجے آرام فرماتے اور علی الصباح بیدار ہوتے تو جتنا کام جس خوبی سے انجام پاتا اسکا عشر عشیر بھی مذکرہ محنت سے تکمیل نہ پاسکا بلکہ منفعت رہی ایک طرف راس المال ہی میں گھاٹا آیا کہ رات کے دو بجے جو سوئے تو دن کے ۹ بجے بیدار ہوئے۔ ماں باپ کچھ کہہ نہیں سکتے کیونکہ عزیز بچہ بڑی رات تک شوق علم میں جاگا ہے طالب علم خود بھی اپنی محنت پر نازاں ہے مگر اس محنت کے صلہ میں کامیابی ملنا مشکل ہے۔ رات اسطرح بسر ہوئی اور دن بھر بھی طبیعت کی سستی سے کسی کام میں دلچسپی نہ رہی، اگر کسی طالب علم زیادہ محنت سے کام لیا اور باوجود رات میں دیر تک جاگنے کے علی الصباح بیدار ہونے کی عادت کرلی تو بھی نقصان سے بچ نہ سکا اسلئے کہ کچھ عرصہ تک اسطرح ناقابل برداشت محنت کرنے سے صحت برقرار نہ رہ سکی اور بیماری کا طویل سلسلہ قایم ہوگیا۔ کامیابی تو کامیابی امتحان کی شرکت تک میسر نہو سکی۔ نیند صحت کے لئے نہایت ضروری چیز ہے یہ ہوسکتا ہے کہ بغیر کھانے پینے کے انسان سات دن بلکہ اس سے بھی زیادہ زندہ رہ سکتا ہے۔ مگر یہ ممکن نہیں کہ وہ ایک ہفتہ تک جاگتا ہے اور اسے موت نہ آئے اسلئے پانچ چھ گھنٹے ضرور سونا چاہئے کہ نیند صحت سے کامیابی ہے اگر ابتدائے زمانہ میں زیادہ جاگا کروگے تو آگے چلکر محنت نہ کرسکوگے!

تاریخ شاہد ہے کہ جن جن مشاہیر قوم نے کم خوابی کو اپنا طریق کار بنایا ہے انمیں سے اکثر ایسے ملیں گے کہ کچھ ہی عرصہ کے بعد اُن کے قویٰ ضعیف ہوگئے طبیعت میں اضمحلال پیدا ہوگیا اور وہ اپنے مفوضہ کاروبار کو حسب منشا انجام نہ دیسکے۔

پس ایسا ہی علم کے طلب کرنے والو زیادہ بیدار رہکر اپنی صحت خراب نہ کرلو اور بجائے اسکے کہ رات کو زیادہ دیر تک جاگ کر صبح میں سوتے رہو بہتر یہ ہے کہ دس گیارہ بجے سو جاؤ اور چار پانچ بجے بیدار ہو جاؤ صبح کے وقت کا پڑھنا تمھارے

آدھی رات میں پڑھنے سے زیادہ مفید ہوگا کہ نیند پوری ہونے اور راحت پانے کی وجہ سے طبیعت چست و چالاک رہتی ہے غذا کا بوجھ کم ہو جاتا ہے ہوا میں پاکیزگی و صفائی اور دل و دماغ میں فرحت و تازگی رہتی ہے اسوقت کا مطالعہ اور اسباق کا اعادہ بیحد فائدہ مند ہے۔

(۳) **تمباکو سے احتراز** کسی چراغ کی لو پر سفید سے سفید کاغذ رکھا جائے دم میں دھوئیں سے کالا ہو جائیگا، گھر کی تمام دیواریں سفید براق ہو سکتی ہیں مگر باورچیخانہ کی دیواروں سے سیاہی دور کرنا کارے وارد' ریل گاڑی مختلف رنگوں سے رنگی جا سکتی ہے مگر انجن سیاہی کا ٹھیکہ دار ہے اسلئے کہ اسکو دھویں سے سابقہ رہا کرتا ہے' یہی حال ہے اُن طلبہ کے دل و جگر کا جنہوں نے سگریٹ نوشی کو جزو تعلیم یا واجب العمل فیشن سمجھ رکھا ہے۔ خدا خوب جانتا ہے کہ تمباکو نوشی سے کتنے ہونہار دماغوں میں نامعلوم آگ لگ چکی ہے اور کتنے طالب علموں کے دل و جگر' اس چھپی ہوئی چنگاری نے غیر محسوس طور پر جلا کے خاک سیاہ کر دئیے ہیں کسی شاعر نے تو یہ کہا ہے کہ ع

میں چپکے چپکے جلتا ہوں لیکن دھواں نہیں

مگر یہاں دھواں بھی ہے اور جلنا بھی۔ جو خوش قسمت طالب علم اس جگر سوز عادت سے محفوظ ہیں۔ اُن پر طعن و تشنیع کیجاتی ہے دلسوز مضحکہ اُڑایا جاتا ہے بیچاروں کو سگریٹ نہ سہی خون کے گھونٹ ضرور پینے پڑتے ہیں۔ ہر بڑی جماعت کے طلبہ کو علم و لیاقت میں اپنے تحتانی درجہ کے طالب علموں سے بڑھے ہوئے ہونا چاہئیں مگر سگریٹ نوشی کی منطق نرالی ہے کہ جیسے جیسے مدارج علمیہ بڑھتے جاتے ہیں سگریٹ نوشی میں بھی ترقی ہوتی جاتی ہے۔ افسوس کا مقام ہے کہ جماعتِ صغیر کا بدنصیب طالب علم چھپ چھپکر بیڑی یا سگریٹ پیتا ہے تو فسٹ فارم کا طالب علم مدرسہ میں سگریٹ اپنی جیب میں لئے ہوئے آتا ہے' تھرڈ فارم کا طالب علم اپنے استاد صاحب کو آتے ہوئے دیکھکر سگریٹ ہاتھ میں سے

پھینکدیتا ہے مگر ہیڑک کا لڑکا اپنے منہ کا سگریٹ بائیں ہاتھ میں لیکر دائیں ہاتھ سے مدرس صاحب کو سلام بجالاتا ہے۔

دوستو! اگر تمھیں صحت و تندرستی مقصود ہے اور علمی کامیابی مطلوب ہے تو اس بری عادت کو فوراً ترک کر دو، اگر اب ترکِ عادت کی مشقت اٹھانے میں کوتاہی کی تو آئندہ اس کے پیدا کردہ مصائب کے سبب ناقابلِ برداشت تکلیفوں سے دوچار ہونا پڑیگا۔ بعض طالب علم کہا کرتے ہیں کہ ایک وقت نفخ شکم ہوا تھا ڈاکٹر نے اس مرض کی دوا سگریٹ نوشی تجویز کی تھی بس عادت ہو گئی۔ مگر انھیں یاد نہیں کہ ع

عذرِ نامعقول ثابت میکند تقصیر را

شاید کسی نیم حکیم نے انہیں یہ علاج بتایا ہو۔ بیمار کو تو وہی دوا کرنی چاہئے جو اسکی صحت کی ذمہ دار ہو اگر کوئی دوا ایسی ہو کہ ایک مرض کیلئے تو مفید ہے مگر دوسرے امراضِ سخت میں مبتلا کر دیتی ہے تو کوئی ایسی دوا ہرگز نہ کھائیگا۔ ڈاکٹروں کے متعدد اقوال ہیں کہ تمباکو کا استعمال صحت کیلئے سخت نقصان دہ ہے مانا کہ پیٹ پھولا تھا، سگریٹ جیسی مجرب دوا تشخص ہوئی تو کیا بیماری میں جو دوائیں کھائی جاتی (دی جاتی) ہیں وہ صحت کے بعد بھی زیرِ استعمال رہا کرتی ہیں۔ ہرگز نہیں۔ ادھر مزاج اچھا ہوا اور دوا ترک کر دی گئی۔ مگر ع خوئے بد را بہانۂ بسیار۔

عزیزو۔ یہ کمال نہیں ہے کہ تم نے سگریٹ کا دھواں اپنے منہ سے زلفِ پیچاں کی طرح پیچ و تاب کھاتا ہوا نکالا اور دل و دماغ کو دھواں دھار کر لیا، بلکہ کمال یہ ہے کہ آپ کے منہ سے گفتگو کے وقت ایسے پرمغز مضامین نکلیں جن سے سامعین کے دل و دماغ تازہ ہوں اور حاسدین پیچ و تاب کھا کر رہ جائیں۔ بہادری یہ نہیں ہے کہ تم نے سگریٹ کا دھواں اپنی ناک کی راہ سے نکالا یا اس کو لقمۂ تر کی طرح نگل گئے (لیا)۔ جوانمردی یہ ہے کہ بجا غصہ کو پی جاؤ اور علمی بدشوقی کو اپنے دل سے نکال باہر کرو۔

(۴) خورونوش میں احتیاط. کسی حوض کے خراب پانی کو دور کردینے سے حوض پاک وصاف ہو جاتا ہے لیکن کسی نل کے ذریعہ اسمیں غلیظ پانی جمع ہو رہا ہے تو حوض کا خالی کرنا بے سود ہے جبتک غلیظ پانی کی آمد کو نہ روکا جائے۔ اسی طرح انسان اپنے آپکو جسمانی بیماریوں سے پاک وصاف کرنے کے ساتھ ساتھ یہ اہتمام بھی کرے کہ بیماری پیدا کرنے والی چیزوں کو قطعاً ترک کردے۔ بعض طلبہ میں بازاری چیزیں کھانے، پینے کی بھی بری عادت رہا کرتی ہے۔ طالب علم کو ان پڑھوں کے لئے عمدہ نمونہ بننا چاہئے تاکہ جاہل ان کی نظیر نہ لینے پائیں۔ کیا یہ پسندیدہ امر ہے کہ بے احتیاطی سے پکی ہوئیں اور بدنظمی سے رکھی ہوئیں مضرِ صحت اشیاء برسرِ راہ خریدی جائیں اور وہیں کھڑے کھڑے یا چلتے پھرتے اُنکو کھا لیا جائے اگر انسان اور تعلیم یافتہ انسان بھی جانوروں کی سی بدتمیزی اختیار کرے تو تہذیب وشایستگی کو کہاں ڈھونڈا جائے ؎

علم آدمیت است وجوانمردی وادب ورنہ دوی بصورتِ انسان مصوری

بازاری چیزوں کے ساتھ یہ رغبت اور گھر کی یہ حالت کہ غریب ماں نے یا ماما نے حتی المقدور احتیاط سے پکایا اور لذیذ پکایا مگر صاحبزادے کے سامنے کھانا آیا اور انہوں نے کسی نہ کسی چیز پر کچھ نہ کچھ عیب لگایا پھر یا تو شروع سے آخر تک نہایت آزردگی کے ساتھ کھاتے رہے یا غصے ہوکر مدرسہ آنے کو اٹھ کھڑے ہوئے اور بھوکے پیاسے مکتب پہونچے اور شریکِ درس ہوگئے مگر غم وغصہ اپنا اثر کئے جا رہا ہے۔ بروقت کھانا نہ کھانا، اور دماغی محنت کرنا صحت کو برباد کر رہا ہے۔ ان کا کھانا ان کے خلیق سرپرست مدرسہ روانہ کردیتے ہیں یا غریب باپ خود لئے ہوئے آتا ہے مگر طالب علم کا غصہ ابھی کم نہیں ہوا ہے گھر کا کھانا یا تو واپس ہو ایا قائید ہی رہا۔ کبھی اسطرح بھوکے رہے کبھی اسطرح بے احتیاطی سے تناول کیا کہ بدہضمی سے حالت خراب ہوگئی غرض تندرستی پر بہر طور مصیبت رہی۔ ہونہار طالب علمو!

اگر تمھیں تندرستی کی کچھ قدر ہے اور کامیابی مطلوب تو بازاری چیزوں سے ضرور پرہیز کیا کرو اور جو کچھ گھر میں ہو وقت پر خوشی خوشی کھا لیا کرو۔

(۵) دور اندیشی ایک پرندہ باوجود پر پرواز رکھنے کے صیاد کے قفس میں گرفتار ہے، ایک مچھلی دریائے زخار کی تیراک ہونے پر بھی کسی ماہی گیر کے جال میں مضطرب و بیقرار۔ اُس کی گرفتاری قابل رحم ہے نہ اس کی بے قراری کیونکہ ہر دو نے دور اندیشی نہ کرنے کی سزا پائی ہے اگر انجام بینی سے کام لیا جاتا، حرص و طمع سے احتراز کیا جاتا تو ان کی جان جوکھوں نہ ہوتی۔ ایک غریب کسان جسے کھانے کو بھی برابر میسر نہیں غلہ کی ایک کافی مقدار زمین میں بو رہا ہے، اس کے اس فعل پر بیوقوف ہنسیں گے کہ خود نہ کھا کر غلہ خاک میں ملا رہا ہے مگر عقلمندوں کے پاس اس کا یہ فعل قابل تحسین ہے کہ دور اندیشی پر مبنی ہے۔ سمجھدار بیمار تلخ دوا بطیب خاطر پی لیتا ہے اور لذیذ لذیذ غذائیں بھی خوشی خوشی سے ترک کر دیتا ہے کیونکہ جانتا ہے کہ داروے تلخ کا انجام صحت ہے اور چند روزہ پرہیز میں برسوں کی عافیت۔ مدرسہ آنے والے طلبہ پر کھلاڑی اور آوارہ بچے ہنستے ہیں کہ یہ کیا کم عقلی ہے کہ دن بھر مدرسہ میں مقید بیٹھے رہیں استادوں کی جھڑکیاں سنیں تعلیم پانے کی ناگوار آفتیں جھیلیں۔ مگر ہونہار طالب علم کے پاس انکی خرافات کا ایک ہی معقول جواب ہے کہ تم لوگ کوتاہ اندیش اور موجودہ لذت لہو ولعب کے دلدادہ ہو اور چند روزہ سطحی خوشی پر آئندہ زندگی کی حقیقی راحت کو قربان کر رہے ہو۔ ہم دور بینی سے کام لینے والے ہیں کچھ عرصہ تک طالب علمی کی محنت اُٹھائیں گے ہمیشہ عزت کے ساتھ زندگی بسر کریں گے۔

غرض دور اندیشی ہر کام میں ضروری ہے کہ ع

مرد آخر بین مبارک بندہ ایست

جسطرح تحصیل علم دور اندیشی پر موقوف ہے اسی طرح اثنائے تعلیم میں بھی انجام بینی کی

سخت ضرورت ہے۔ ایک طالب علم سبق پڑھتا ہے مگر اس کو یاد نہیں کرتا، آموختے کے
اعادہ کی طرف اس کی توجہ نہیں۔ یہ سمجھا ہوا ہے کہ امتحان کو ابھی زمانہ باقی ہے قریب
امتحان خوب یاد کر لوں گا۔ مگر اسکو یہ معلوم نہیں کہ لیل و نہار ایک حالت پر نہیں
رہتے اصحت و بے فکری پائدار چیز نہیں کیا خبر کہ کل کیا ہونے والا ہے کبھی ایسا بھی
ہوا ہے کہ عین امتحان کے قریب بدقسمتی سے کوئی طالب علم بیمار ہو گیا اگرچہ امتحان سے
کچھ دن پہلے صحت حاصل ہو گئی مگر کچھ یاد نہ تھا کیونکہ جس مدت میں محنت کے ساتھ
یاد کرنے کی ٹھہرائی تھی وہ تو بیماری میں گزر گئی۔ بعض طالب علم آسان آسان مضامین تو
ذہن نشین رکھتے ہیں مشکل مضمونوں کے متعلق انکا خیال رہتا ہے کہ آئندہ ان پر کافی
غور کر لیں گے یا کیا ضرور ہے کہ امتحان میں انہی مسائل کے متعلق سوالات آئیں۔
سو، اتفاق سے کبھی انہیں غور و فکر کی فرصت ہی نہیں ملسکتی اور ایسا بھی ہوتا ہے
کہ امتحان میں اسی قسم کے سوالات آجاتے ہیں اور یہ ناکام رہجاتے ہیں۔ وہ طلبہ جن کے
گھر پر خانگی استاد مقرر رہتے ہیں انہیں بھی بسا اوقات یہ خبط رہتا ہے مدرسہ میں کوئی
بات سمجھ میں نہ آئے تو پروا نہیں گھر پر سمجھ لیں گے۔ کبھی اس کے برعکس خیال ہے خانگی
استاد سے تعلیم دل لگا کر نہیں پاتے، یہ دور اندیشی سے بعید ہے بہترین طریقہ یہ ہے
کہ ہر ایک سبق کو متعلقہ استاد سے خاص محنت و جانکاہی کے ساتھ یہ سمجھکر پڑھ لینا چاہئے
کہ گویا اس کے بعد ہمیں کوئی پڑھانے یا سمجھانے والا ہی نہیں اور یہ خیال رکھنا چاہئے
کہ گویا کل ہی امتحان ہے اور جو کچھ بھی پڑھا ہے امتحان میں بیان کرنا ہے نیز مشکل
مضامین کو یہ سمجھکر اچھی طرح یاد کر لینا چاہئے کہ امتحان صرف انہی کے متعلق ہوگا فوقانی
درجے کے طلبہ کو اختیاری مضامین لینے میں بھی دور اندیشی کی سخت ضرورت ہے
ہر مضمون پر کافی غور کر لینے اور اپنی طبیعت کا رجحان دیکھنے کے بعد انتخاب کرنا چاہئے
بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ طالب علم کوئی ایک مضمون انتخاب کر لیتا ہے چند دن بعد

کسی وجہ سے اس کے عوض دوسرا مضمون لینے پر مجبور ہو جاتا ہے جس سے کچھ عرصہ کی محنت رائگاں جاتی ہے اگر پہلے ہی سوچ سمجھ کے کام کیا جاتا تو یہ نقصان نہوتا بعض طلبہ صرف اُسی مضمون میں محنت شاقہ سے کام لیتے ہیں جس سے ان کو فطرتًا دلچسپی ہے یا ان کے لئے مشکل معلوم ہوتا ہے اور دوسرے مضامین میں ناقص رہکر نقصان اٹھاتے ہیں، سزاوار ہے کہ ہر مضمون میں دشواری و آسانی کا لحاظ رکھتے ہوئے اسطرح کی کم و بیش محنت کیجائے کہ تمام مضامین میں کامیابی کے اعلیٰ نشانات حاصل ہوسکیں کیونکہ کبھی آسان مضمون بے توجہی کے باعث دشوار سا ہو جاتا ہے اور محنت و خاص توجہ کیوجہ سے مشکل اموریں آسانی پیدا ہو جاتی ہے جن طلبہ سے مضمون نگاری کا کام لیا جاتا ہے انمیں اکثر اپنی سہولت کے مدنظر یہ کرتے ہوئے پائے گئے کہ عنوان مقررہ کے متعلق کسی کتاب میں مضامین دیکھے اور بعینہٖ نقل کرکے مضمون نگار بن گئے حالانکہ یہ علمی قابلیت کیلئے زہر قاتل ہے اسلئے کہ دماغ کاہل اور ہمیشہ نقل کرنے کا عادی بن جاتا ہے ایسے طلبہ بڑے لیئق بھی ہو جائیں گے مگر مضمون نگاری میں ہمیشہ دوسرے مصنفین کے محتاج رہیں گے نقل و اصل میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اپنی محنت سے کمائی ہوئی معمولی چیز اوروں کی نعمتوں سے زیادہ لذت بخش ہے۔ اپنا لکھا ہوا مضمون اگرچہ ناقص ہی کیوں نہو پرائے بہترین مضامین سے بہت زیادہ قابل قدر ہے اوروں کے چبائے ہوئے نوالے چبائے جانا غیر تمندوں کا کام نہیں اس کے سوا چوری بہر حال چوری ہے خواہ مال و دولت چرائی جائے یا شعر و عبارت۔

امتحان کے متعلق بھی چند باتیں دوراندیشی پر مبنی ہیں جنکا بیان کردینا ضروری ہے۔ اکثر طلبہ امتحان کے قریب زمانہ میں ضرورت سے زیادہ محنت اٹھاتے ہیں بعض تو ادھر صبح میں امتحان ہے اور رات بھر پڑھتے رہتے ہیں سمجھتے تو یہ ہیں

کہ اسطرح سے خوب یاد ہوگا مگر جاگنے اور محنت شاقہ برداشت کرنے سے امتحان گاہ میں مزاج کی حالت نادرست اور طبیعت سُست ہو جاتی ہے۔ جوابات کی صحیح طور پر ادائی تو ایک طرف، سوالات امتحان تک سمجھ میں آ نہیں سکتے۔ نتیجہ جو کچھ ہوگا ظاہر ہے اسلیئے طلبہ کو چاہیئے کہ امتحان کے قریب بھی اعتدال کے ساتھ محنت کریں اور بہتر ہے کہ جس رات کی صبح میں امتحان دینا ہے خوب نیند لے لیں تا کہ دماغ کو آرام آرام ملے، دل مطمئن رہے اور جوابات حسن و خوبی سے ادا ہو سکیں۔

پرچۂ سوالات ملنے کے بعد بعض طالب علم سلسلہ وار جوابات لکھنے لگتے ہیں۔ کبھی ایک دو سوالات کے جوابات سوچنے ہی میں آدھے سے زیادہ وقت صرف ہو جاتا ہے اور قلتِ وقت کیوجہ سے یا تو باقی سوالات اچھی طرح حل نہیں ہو سکتے یا تمام وقت انہیں سوالات کے جوابات لکھنے میں صرف ہو جاتا ہے جو بخوبی یاد نہ تھے۔ عمدہ طریقہ یہ ہے کہ پرچہ لیتے ہی پہلے پہل خوب غور کرلو۔ پھر وقت اور اپنے قوتِ حافظہ کے لحاظ سے جوابات اسطرح قلم بند کرتے جاؤ کہ جو زیادہ یاد ہو پہلے ادا کیا جائے اور یہی ترتیب آخر تک قائم رہے، یہ بھی ملحوظ رکھو کہ تمام سوالات نظر سے گزر سکیں تا کہ بعد میں اسطرح پچتانے کی نوبت نہ آئے کہ فلاں سوال کا خیال ہی نہ رہا اور جواب لکھنے سے پیشتر ہر ایک سوال کو شروع سے آخر تک، پڑھنے کے بعد غور کرلو کہ ممتحن کا اس قسم کے سوال سے کیا منشا ہے۔ بعض طالب علم ذہانت یا بلادت سے سوال کے ابتدائی دو چار لفظ پڑھتے ہی جواب لکھنے لگتے ہیں جو انکی دانست میں تو صحیح مگر درحقیقت غلط رہتا ہے۔

بعض طلبہ یہ بات قابل فخر سمجھتے ہیں کہ امتحان گاہ میں وقت ختم ہونیسے پہلے پرچہ لکھا اور دیدیا، حالانکہ لیاقت کا کام یہ نہیں ہے، اکثر ایسے مغرور طلبہ ناکام رہجاتے ہیں، امتحان گاہ میں ختم وقت سے پہلے پرچہ دیدینا کمال نہیں بلکہ آخر وقت تک

غور فکر کے ساتھ لکھتے رہنا اور اپنے لکھے ہوئے پر نظر ثانی کر لینا عین لیاقت
دوراندیشی ہے۔

امتحان گاہ میں اپنے ساتھیوں سے اشارۃً یا صراحتہً کچھ پوچھنا اور کسی قسم
کی باتوں میں مشغول ہونا سخت کوتاہ اندیشی ہے اور اپنے سے کچھ پوچھنے والے
طالب علم کو جواب دینا اور بھی کم عقلی۔ وہ دوست دوست نہیں جو امتحان گاہ میں
اپنے دوست کی کچھ امداد کرے بلکہ وہ اپنا اور اپنے دوست کا خاصہ دشمن ہے۔

ممتحنین کے نام معلوم کرنے کا خیال یا قبل از قبل سوالات سے آگاہ ہونیکی
فکر طلبہ کیلئے حقیقی ناکامی ہے اگر خلاف انجام بینی ع
چرا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی
دل لگا کر پڑھو محنت سے یاد کرو غور و فکر سے جوابات دو یقیناً کامیاب رہوگے

بعض طلبہ میں بے موقع مزاح کی عادت شدت سے جاگزیں ہوگئی ہے
جو دور اندیشی کے سراسر خلاف ہے کہ عامیانہ مزاح کا نتیجہ اکثر و بیشتر برا ہی نکلتا ہے
ظرافت و خوشطبعی بری چیز نہیں مگر اُسوقت کہ راستی و راست کرداری پر مبنی ہے
اور منشاء صرف تفریح طبع ہو نہ یہ کہ مزاح نبرد و سلاح کی نوبت لائے اور دل کو
فرحت ہونے کی عوض باہمی جنگ و جدل چھڑ جائے۔ حالت یہ ہے کہ جسطرح
مختلف مضامین شریک نصاب رہتے ہیں اس لئے مزاح کے مضمون کو بھی طلبہ نے
اپنے تعلیمی کورس میں داخل کر لیا ہے فرق یہ ہے کہ کسی مضمون کا سبق روزانہ ایک
گھنٹہ ہوتا ہے تو کسی کا ہفتہ میں دو گھنٹے مگر دل لگی کا مضمون ایسا دلچسپ و نفع
بخش سمجھ لیا گیا ہے کہ ہر گھنٹے میں کئی کئی بار اس سبق کو جاری رکھا جاتا ہے
دوسرے اوقات میں بھی جب کبھی موقع ملے اس سبق کی تکرار پر تکرار کیجاتی ہے نہیں
پیدل چلتے ہوئے طالب علم کے قریب سے سیکل سوار طالب علم گزرتا ہے دونو

گہری دشمنی ہے یہ دوست کو دیکھتے ہی اسطرح محبت سے ملاقات کرتا ہے کہ بجائے سلام و مصافحہ کے اُسکی سیکل کو اس بے ترتیبی سے حرکت دیتا ہے کہ سیکل سوار دوست سنبھل نہیں سکتا اور زمین پر سیکل کے گر پڑتا ہے؛ پھر تو ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑتے ہیں گرتے ہیں پھر ہنستے ہوے اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ مزاح کا یہ ایک ابتدائی باب ختم ہوا ہے ابھی پوری کتاب باقی ہے جو شام تک حسب موقع ختم ہوتی رہیگی اور دوسرے دن پھر نئے اصول پر اسکا دورہ کیا جائیگا۔

ایک طالب علم اپنی دھن میں راستہ طے کر رہا ہے یا مطالعہ میں منہمک ہے کہ پیچھے سے اسکا دوست جو خود بھی طالب علم ہے آتا ہے اور اسکی جیب میں سے وستی یا قلم یا جو کچھ بھی بن پڑے آہستہ سے نکال لیتا اور بھاگ جاتا ہے، مالک مال نے اگر معلوم کر لیا تو دوست نے قہقہہ لگایا اور اس کام کو مزاح ٹھہرا دیا ورنہ "خانۂ دوستاں بروب و در دشمناں مکوب" پر عمل ہے اور دوست کی مملوکہ اشیا اپنی جیب میں غرض ایسے بہتیرے حرکات ہوتے ہیں جو نہ صرف دور اندیشی سے بعید بلکہ طالب علم میں سخت رکاوٹیں پیدا کرنے والے ہیں۔ بات بات پر قہقہہ لگانا طلبہ نے اپنا شعار بنا رکھا ہے۔ ایک دوسرے پر چشمک زنی اور طعن و تشنیع کی عادت کر لی گئی ہے۔ جماعت میں کسی نے استاد سے سوال کیا تو اس کے لفظ لفظ پر ریمارک ہونے لگے مضحکہ اُڑایا جانے لگا۔ اگر کبھی موقع ملگیا تو ہاتھا پائی کے وسیلہ سے مزاح جاری رکھی جاتی ہے یہ نہو سکے تو زبانی غپ شپ کے ذریعہ ورنہ اشاروں ہی کے وسیلے سے تکمیل ظرافت کر لی جاتی ہے۔

میرے شفیق طالب علمو! میں نے ایسے طلبہ بھی دیکھے ہیں جو ایکدوسرے کے بڑے گہرے دوست تھے مگر باہمی مزاح اور صرف مزاح کا یہ اثر ہوا کہ ان میں سخت دشمنی پیدا ہو گئی یا تو انکی نزدیک آپس کی گفتگو درس و تدریس سے زیادہ عزیز تھی

یا یہ حالت ہوئی کہ تین سال کا طویل عرصہ گزرا مگر باوجود ہم مدرسہ و ہم سبق ہونے کے ایک نے دوسرے سے کسی قسم کی کوئی بات چیت نہ کی اور خدا جانے کب تک یہ تنفر باقی رہے گا۔ اس محبت کا بھی اور اس عداوت کا بھی جو اثر تعلیم پر پڑا ہو گا ظاہر ہے۔

دور اندیشی کا مضمون ناقص رہجائیگا اگر یہ ظاہر نہ کیا جائے کہ اپنی پیدائش اور کارخانۂ قدرت کے متعلق بھی ضرور غور کر لیا کرو یہ کوتاہ بینی ہے کہ چند روزہ زندگی ہی کیلئے ہم اپنے آپ کو وقف کردیں اور آخرت کے منکر یا اس سے بے پرواہیں۔ مرجانا یقینی ہے اور دنیا کو چھوڑنا لابدی۔ مذہبی اوامر و نواہی کی پابندی ہمیشہ مفید ثابت ہوتی رہی ہے اگرچہ ہماری ناعاقبت اندیشی نے انکی خاطر خواہ قدر و منزلت نہ کی ہو عقل سلیم جن جن چیزوں کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتی ہے مذہبی زندگی مع شئے زائد ان سب کی تکفیل ہے پس دنیا کے ساتھ آخرت کی فکر بھی ضروری ہے اور تن پروری کے ساتھ ساتھ روحانی اصلاح بھی لازمی۔

رباعی از فاضل

دنیا کا جو امتحان دینا چاہا ۔۔۔ تیاری میں مشغول ہے صبح و مسا
کچھ یاد ہے امتحان دینے والو ۔۔۔ ہے حشر کا امتحان بھی ہونیوالا

ارتقائے عمل تعلیم

(از مسٹر گنیش چند بی۔اے۔بی ٹی)

(پیوستہ)

تنظیم انگلستان اور امریکہ کے قدیم معلمین کا خیال تھا کہ مدرسہ کی تعلیم پر خارجی اسباب مثلاً انتظام مدرسہ عمارت ساز و سامان وغیرہ کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ لیکن موجودہ ماہرین تعلیم متفق ہیں کہ خارجی اسباب ارتقاء تعلیم میں نمایاں حصہ لیتے ہیں اور متعلم نیز طرز تعلیم دونوں انکے دائرہ اثر سے باہر نہیں ہو سکتے۔ یوں تو خارجی اسباب کی ایک طویل فہرست مرتب کیجا سکتی ہے۔ مگر انتظام مدرسہ و ضبط جماعت کو جو نمایاں فوقیت سب پر حاصل ہے وہ اس امر کی مقتضی ہے کہ سب سے پہلے اس ضروری جزو پر تبصرہ کیا جائے۔

ضبط جماعت انگلستان کے ایک مدرسہ میں طلباء سے سوال کیا گیا کہ تم مدرسین کی اطاعت کیوں کرتے ہو۔ بعضوں نے جواب دیا کہ مدرسین ہم سے زیادہ قوی ہیں اگر ہم انکی اطاعت نہ کریں تو سخت سزا بھگتنی پڑے۔ بعضوں کا جس میں زیادہ تعداد اناث کی تھی یہ جواب تھا کہ مدرس کی اطاعت مانوس ہونیکی وجہ سے کیجاتی ہے۔ تیسرے گروہ نے جسکی تعداد پہلے اور دوسرے گروہ سے مقابلتاً بہت زیادہ تھی یہ جواب دیا کہ ہماری نظروں میں مدرس کی وقعت بہت زیادہ ہے۔ اُسکی اعلیٰ قابلیت ہم کو اطاعت پر مجبور کرتی ہے۔ اس تحریر کو مدنظر رکھتے ہوئے ماننا پڑتا ہے کہ اولاً ہماری سوسائٹی کی نوعیت، ثانیاً مدرس کی شخصیت طلباء کو

اطاعت پر مائل کرتی ہے۔

سوسائٹی یا ماحول کی نوعیت

بچہ صغر سنی سے اطاعت کا سبق سیکھتا ہے والدین۔ انا اور رشتہ دار اسکو دنیا کے چند مقررہ قوانین کی پابندی پر چلاتے ہیں۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ ہر انسان کے لیئے اسکا ماحول زبردست اتالیق ہے۔ جو سب کی آنکھوں سے اوجھل لیکن ہر لمحہ اپنا درس جاری رکھتا ہے۔ بچہ مدرسہ میں داخل ہوتا ہے تو اپنے آپکو گھر سے بالکل مختلف ایک دوسرے ماحول کی آغوش میں پاتا ہے۔ مدرسہ کی عمارت ہم جماعت طلباء کی سوسائٹی۔ مدرس و صدر مدرس کی نگرانی چال چلن کا معائنہ غرض مدرسہ کے تمام قوانین کی پابندی اسپر لازم آتی ہے۔

مدرس کی ذاتی شخصیت

مدرسہ میں طلباء کا بیشتر وقت مدرس کے ساتھ صرف رہتا ہے اگرچہ ایسے مدرسین کی تعداد کم ہے جو ہر اعتبار سے بہترین ضابط ثابت رہے ہوں لیکن ان اساتذہ کی تعداد بھی زیادہ نہیں جو ضبط جماعت کے عام اصولوں سے واقفیت تامہ رکھتے ہوئے بھی جماعت پر ضبط قائم نہیں رکھ سکتے۔ البتہ ایسے مدرسین کی تعداد زیادہ پائی جاتی ہے جو ابتداءً ضابط جماعت ثابت نہیں ہوتے لیکن ٹریننگ کالج کی تعلیم یا کچھ عرصہ کے ذاتی تجربہ کے بعد جماعت میں خاطر خواہ نظم قائم رکھ سکتے ہیں۔ ضبط جماعت کیلئے مدرس میں چند خصوصیات کا ہونا لازمی ہے۔ اگر مدرس اپنے متعلقہ مضمون پر پورا حاوی ہو۔ طلباء کو جماعت میں مشغول رکھنے کا گر اسے یاد ہو۔ ہر طالب علم پر کافی نگرانی رکھتا ہو۔ مناسب ہدایات نافذ کرنا اور طلباء کو ان کا پابند بنانا آتا ہو تو ضبط جماعت میں اسے زیادہ دقت پیش نہ آیگی۔

ضبط جماعت کی تاریخ

یوں تو مصلحین تعلیم میں ہمیشہ اختلاف آراء ہوتا چلا آیا ہے۔ مگر ضبط جماعت کی تاریخ میں باعتبار اصول تعلیم تین دور خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ہر زمانہ میں ماہرین تعلیم نے اپنے مخصوص نظریہ کو ایک عظیم الشان صورت

ملک کے سامنے پیش کیا ہے اور اپنے زمانہ کے ارباب حل وعقد کے یہ ذہن نشین کرانے میں پورا پورا زور لگایا ہے کہ جو نظریہ وہ پیش کرتے ہیں ارتقائے تعلیم کیلئے ضروری ہی نہیں بلکہ ناگزیر ہے۔ فلسفیانہ دلائل ونتائج سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ جو اصول موضوعہ ان کی فکر وتحصیل کا نتیجہ ہے اُن کے بغیر تعلیم مکمل نہیں ہو سکتی۔ ہم ہر زمانہ کے مخصوصین تعلیم کے نظریات اصلی صورت میں پیش کرتے ہوئے مختصر تنقید کے ساتھ یہ واضح کرنے کی کوشش کریں گے کہ موجودہ زمانے میں ہمارے ملک کے لئے کونسے اصول قابل عمل ہیں۔

ایک زمانہ وہ تھا جبکہ مدرس صرف چھڑی کو خاطی کی سزا کا ذریعہ سمجھتا تھا معلمین اسے اپنا زرین اصول تصور کرتے تھے کہ چھڑی ہاتھ سے گئی اور طالب علم برباد ہو گیا۔ اُن طلباء کی اطاعت بعینہ سرکس کے شیر کی اطاعت کے مانند تھی جو منیجر کی چھڑی کے اشارہ پر تعمیل احکام کرتا ہے۔ باقاعدہ مدارس میں یہ سزا متروک ہو گئی ہے صرف صدر مدرس شاذ ونادر مواقع پر چھڑی کا استعمال کرتا ہے۔ البتہ بعض مدارس میں تقریباً ہر روز ایک وقت معینہ پر صدر مدرس کے روبرو طلباء کی ایک قطار سزا کے لئے جاتی ہے یہ بھی نہایت بدنما طریقہ ہے۔

اس کے بعد اس خیال کا دور آیا کہ صرف چھڑی کا استعمال طلباء کو اصلی ہدایت پر مجبور نہیں کرتا بلکہ صحیح معنوں میں کامیاب مدرس وہ ہے جس کے اشارے طلباء کام کریں۔ اسمیں شک نہیں کہ بعض اوقات ضبط جماعت کیلئے یہ سزا ناگزیر ہوتی ہے۔ لیکن مدرس اپنا مقصد دوسرے ذرائع سے بھی پورا کر سکتا ہے جو غیر موزوں اور بدنما نہ ہوں۔ مدعیان نظریۂ ہذا نے یہ بھی بتایا کہ چھڑی کا استعمال نہ صرف مدرس میں بے رحمی پیدا کرتا ہے بلکہ طلباء اس سزا کے عادی ہونے کے بعد بے حس ہو جاتے ہیں اور غیرت جو سزا کا اصلی مقصد ہے مفقود ہو جاتی ہے۔ پس اس گروہ کے

قول کے مطابق مدرس طلباء کے ساتھ ایسا سلوک کرے کہ وہ خود بخود اُس سے مانوس ہو جائیں۔ ایک کامیاب مدرس کے لئے ضبط جماعت کا قیام اور ایسا سلوک متضاد نہیں
اس گروہ نے ایک اور امر مہم پر کافی روشنی ڈالی ہے کہ بمقابلہ سزا کے جزا بہتر ہے۔ یعنی طلباء کو حسن کارگزاری کے صلہ میں انعامات دئیے جائیں۔ ہمارے مدارس میں تقسیم انعامات کا طریقہ عیب سے خالی نہیں ہے۔ ضمناً یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ تقسیم انعامات کا طریقہ جس سے طلباء میں باہمی رنجش و بدمزگی پیدا ہونے کا اندیشہ ہے لائق حذر ہے۔ مفید ترین اصول یہ ہو سکتا ہے کہ انعامات مخصوص ہونے کے بجائے عام ہوں یعنی ہر کامیاب طالب علم کو اسکی کارگزاری کے اعتبار سے انعام دیا جائے خواہ انعام کی نوعیت کیسی ہی ہو۔
تیسرے گروہ کے مخصوصین تعلیم کا قول ہے کہ موجودہ زمانہ ہم کو اصول جمہوریت کی تعلیم دیتا ہے لہذا طلباء کو ہر قسم کی پابندی سے آزاد کیا جائے اور اُن کو مدرسہ میں اپنے توانین آپ وضع کرنے کی تعلیم دیجائے۔ وہ ضبط مدرسہ جو بہ تخویف ہو کمزور اور عارضی ہے۔ مدرس کا بار بار یہ کہنا کہ فلاں کام نہ کرو اسکی کمزوری کی دلیل ہے اور مدرس کا اپنی عام شخصیت سے طلباء کو مرعوب کرنیکی کوشش کرنا ناجائز دباؤ ڈالنے کے مترادف ہے پس اُن کا خیال ہے کہ موجودہ زمانہ میں جبکہ ہم جمہوریت کا دم بھرتے ہیں۔ مدرسہ جو آیندہ دنیا کا چھوٹا سا نمونہ ہے لازماً جمہوریت کے رنگ میں رنگا ہوا ہوتا ہے۔ اس گروہ کے ایک معلم نے نظریہ مذکور کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے ایک دفعہ طلباء پر اپنے مافی الضمیر کا اظہار کیا۔ وہ آزادی کی خوشخبری سے اسقدر محظوظ ہوئے کہ ایک جری طالبعلم نے جوش مسرت میں ایک خوبصورت گلدان جو منبر پر رکھا ہوا تھا زمین پر پٹک دیا۔ معلم مذکور نے فوراً اپنی طلائی گھڑی پیش کر دی اور کہا کہ اگر وہ چاہے تو اسے بھی

اپنے تصرف میں لاسکتا ہے۔ طالب علم کے چہرہ پر ندامت کے آثار نمودار ہو گئے اور وہ عاجزانہ عفو تقصیر کا طالب ہوا۔

ناظرین یقیناً مدعیان نظریہ ہذا کے متذکرۂ بالا اقوال پر محو حیرت ہونگے اگرچہ سیاسی اعتبار سے اصول جمہوریت نہایت اچھا اصول ہے۔ مگر مدرسہ میں اس کا اجرا قابل عمل ہو سکتا ہے یا نہیں۔ یہ ایک سوال ہے جو غور طلب ہے۔ مدرس کی ذاتی شخصیت کی مخالفت میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے اور ضبط جماعت کے قیام میں اُس سے کام لینا حریت و آزادی کے قانون کے مطابق ایک جرم قرار دیا جا سکتا ہے ہم نظریہ ہذا پر مختصر تنقید کرتے ہوئے یہ واضح کریں گے کہ مدعیان نظریہ ہذا کے یہ اقوال ہمارے لئے کہاں تک مفید نتائج پیدا کر سکتے ہیں۔

یہ امر کہ طالب علم پر مدرس کی شخصیت کا اثر نہ ہونا ممکن ہے؟ کنڈرگارٹن و مانٹیسوری طریقۂ تعلیم میں جو موجودہ زمانہ میں مرغوب ترین طریقہ سمجھا جاتا ہے مدرس بظاہر پس پردہ نظر آتا ہے۔ لیکن فی الحقیقت وہ متعلم کو اپنی تجاویز اور طرز گفتگو سے متاثر کرتا ہے۔ یہ بات تو مشاہدے میں آچکی ہے کہ کنڈرگارٹن اور مانٹیسوری کے مدرسین ضدی طلباء کو اپنی طرف توجہ دلا کر راہِ راست پر لے آتے ہیں۔ مدرس اگر چاہے بھی کہ حتی الوسع اسکی شخصیت بالواسطہ رہے تو طالب علم کو متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لیکن اہم ترین نکتہ یہ ہے کہ لازماً مدرس کی شخصیت طالب علم کے لئے خارجی دباؤ کی صورت اختیار کرے۔ بالواسطہ رہنمائی سے طلباء کی آزادی مسمار نہیں ہو سکتی۔

اصول جمہوریت یہ امر قرین قیاس ہے کہ انگلستان اور امریکہ جیسے ترقی یافتہ ممالک کے مدارس میں اصول جمہوریت کا تجربہ کامیاب ثابت ہوا ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ اصول ہندوستان میں بھی مفید نتائج پیدا کرے۔ ان

ممالک کی فضا اور ہے۔ ہر شخص جمہوریت کے گیت گاتا ہے۔ مدرسہ کی ننھی جانیں بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکیں۔ عرف عام میں جمہوریت آزادی کے مترادف سمجھی جاتی ہے۔ لیکن یہ وہ آزادی ہے جسمیں ہر شخص کو خاص قوانین کا جنکو قوم بحیثیت مجموعی وضع کرتی ہے شخصی سلطنت کے مقابلہ میں زیادہ پابند ہونا پڑتا ہے۔ ہمارا یہ مطلب نہیں کہ ہندوستانیوں میں اس قسم کی صلاحیت ہی نہیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ دوسرے ممالک کو اصول جمہوریت کی بدولت شاہراہ ترقی پر گامزن دیکھ کر ہندوستان میں بھی لوگوں کا میلان طبع اسطرف ہو چلا ہے۔ اس پر ہمیں زیادہ بحث کرنے کی ضرورت نہیں۔ طلباء کی تو اور بات ہے اگر کسی مدرسہ کے مدرسین ناظم تعلیمات کی خدمت میں یہ درخواست پیش کریں کہ وہ بغیر کسی صدر مدرس کے مدرسہ کا انتظام خوش اسلوبی سے کرلیں گے تو گو یہ درخواست بہ طیب خاطر منظور کیجا سکتی ہے مگر مشاہدہ یہ کہتا ہے کہ اکثر مدارس صدر مدرس کے ہوتے ہوئے بھی باہمی بغض و نفاق کا شکار ہیں۔ لہٰذا طلباء سے ایسی توقع رکھنی گو ناممکن نہیں لیکن قبل از وقت ضرور ہے۔

اس مختصر تمہید کے بعد یہ سوال کہ طلباء کو مدرسہ میں آزادی کا احساس کرانا مناسب ہے یا نہیں بآسانی حل ہو سکتا ہے۔ ضبط مدرسہ کی حد تک یورپ و امریکہ کے اصول ہندوستان میں بآسانی عمل میں لائے جا سکتے ہیں۔ نیز اُن کو اپنا انتظام آپ کرنے کا طریقہ بھی سکھایا جا سکتا ہے۔ مدرسین نے مشاہدہ کیا ہوگا کہ جماعت میں بعض طلباء جنکی تعداد بہت کم ہوتی ہے ایسے رہیں گے جو فطرتاً اپنے ساتھیوں پر اثر قایم رکھ سکتے ہیں۔ ایسے ہی طلباء کا مانیٹری (مشیر) کے عہدہ کے لئے انتخاب ہوتا ہے۔ یہ بات عموماً دیکھنے میں آئی ہے کہ جو طلباء پابند ضبط ہوتے ہیں انکی تعلیمی حالت اچھی نہیں ہوتی۔ اسی طرح جو طلباء تعلیم میں اچھے ہوتے ہیں وہ پابند ضبط نہیں ہوتے۔ علاوہ ازیں بعض طلباء میں فطرتاً اُس کا مادہ زیادہ ہوتا ہے اور جنکو ایسے

وہ جماعت میں ہر دلعزیز بن جاتے ہیں اور جماعت کو اپنی اس غیر معمولی خوبی سے اپنا گرویدہ بنا لیتے ہیں، دنیا کی بعض بڑی ہستیاں مثلاً نپولین۔ سکندر اعظم آئیو کرائو وغیرہ بھی اس خوبی سے متصف رہیں۔ ہر شخص اُن سے بہت جلد مانوس ہو جاتا تھا اسی وجہ سے وہ اپنی سپاہ کو تابع فرمان بنائے رہتے تھے۔ اس سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہونچتی ہے کہ حلم و خوش اخلاقی بہ نسبت خارجی دباؤ یا خوف سزا کے بہتر ذریعہ ضبط جماعت کا ہے پس صدر مدرس اور مدرسین کا فرض اولین یہ ہے کہ وہ اس قسم کے طلباء کا انتخاب کرکے انکو طلباء کے ذاتی انتظام کا رکن رکین بنائیں۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ کن مواقع پر طلبار کو ان اختیارات کے استفادہ کا موقعہ عطا کرنا مناسب ہوگا۔ مدرس کی عدم موجودگی میں طلبار کی حاضری لیتے ہیں اور مدرس کی مصروفیت کی صورت میں وقتاً فوقتاً امداد دینے میں عموماً مانیٹر (مشیر) سے اب بھی امداد لیجاتی ہے۔ مگر مدرس کی عدم نگرانی، بے پروائی اور مانیٹر پر زائد از ضرورت انحصار اسکو دلیر بنا دیتا ہے۔ اور وہ جماعت میں اپنے اختیار کو بری طرح کام میں لاتا ہے۔ لیکن اگر نگرانی بہتر ہو اور طلباء کو انتظامی قابلیت پیدا کرنے کی باضابطہ تربیت دیجائے تو وہ مدرسہ کے لیے بہترین معاون و مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔

تجربہ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ طلباء مدرسہ کی مختلف انجمنوں کے معتمد و نائب صدر کی حیثیت سے نہایت کامیاب نکلے ہیں۔ لیکن انمیں بھی مدرسین کی کم از کم سطحی نگرانی ضروری ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اور مدارس میں جہاں بورڈنگ ہاؤس (دارالاقامۃ) قایم ہیں غذا مہیا کرنے، اُن کے لئے سہولتیں بہم پہنچانے انکے اخلاق کی نگرانی کرنے، انکو شہری گشت لگانے اور تضیع اوقات سے بچانے کیلئے طلباء کے

طبقہ سے چند ذمہ دار ہستیوں کا انتخاب کرکے ان سے کام لیا جائے۔ اور بلحاظ مراتب
مدرسہ میں ان طلباء کیلئے چند مراعات ملحوظ رکھے جائیں۔ لیکن ایک مہتمم جو طبقۂ مدرسین
سے ہوتا ہے، اس امر کی دیکھ بھال کرتا رہتا ہے کہ وہ اپنے اختیارات کو مناسب
طریقہ سے کام میں لا رہے ہیں یا نہیں۔

حصول اختیارات و جائز استعمال اختیارات کے متعلق انگلستان اور
امریکہ میں نہایت دلچسپ تجربے کئے گئے ہیں۔ اور اکثر کامیاب ثابت ہوئے
ہیں۔ چونکہ مدرسہ میں بعض طلباء ایسے ہوتے ہیں جو خراب بازاری حرکات چوری
اور دوسری بری عادتوں کے عادی ہو جاتے ہیں۔ اور مدرسہ میں وہ مرض متعدی
کی طرح اسکو پھیلاتے ہیں۔ اس لئے مدرس کا اہم ترین فریضہ ہے کہ ان شکایات پر
پوری توجہ کرے۔ چنانچہ ایک مدرسہ میں مدرس نے چند شریف طلباء کو طلب کرکے
انکو چند کام تفویض کئے۔ جنمیں ایک یہ بھی تھا کہ جماعت میں چور طلباء کو معلوم کریں
چونکہ طلباء ہی طلباء سے زیادہ واقف ہوتے ہیں۔ اسلئے یہ سعی نہایت کامیاب
ثابت ہوئی۔

اسی طرح ایک انگریزی مثل کے مطابق تمثیل تعلیم سے بہتر ہوتی ہے" ایک
مدرس نے ابتداءً بیحد تلقین کی کہ طلباء کا فریضہ ہے کہ وہ بنی نوع انسان سے
ہمدردی کرسکیں۔ لیکن جب اسکی گفتگو غیر موثر رہی۔ تو ایسے طلباء میں سے ایک
کے والد کے سر سے ایک بوجھ خود اتار دیا جبکہ اکثر طلباء مدرسہ سے چھٹی کے بعد
باہر نکل رہے تھے۔ یہ عمل طلباء کو اسقدر پسند آیا کہ نہ صرف مدرس ان میں ہر دلعزیز ہو گیا
بلکہ اکثر طلباء نے مدرس کی تقلید کی۔ یہ احساس کارگر ہونے کے لئے ضروری ہے
کہ مدرس ضرور اسمیں حصہ لے۔

ارتقاء عمل ضبط مدرسہ کی بہترین نظارت اسکو منگ طریقہ اور مدرسہ میں تشکیل

سروس لیگ (صحبتی انجمن) کا قیام ہے۔ ہر دو تحریکات ہمارے مذکورہ اصول کو واضح کر دیتی ہیں۔ اسکوٹنگ طلبہ کے مختلف پہلوؤں پر اس عنوان کے ضمن میں بحث کرنا بے موقعہ ہے۔ لیکن یہ بتلا دینا ضروری ہے کہ اسکوٹنگ طلبہ ایک ایسا کھیل ہے جس میں مدرسین طلباء کے ساتھ رہکر اپنی وقتی ذمہ داریوں کو نہایت خوش اسلوبی سے تقسیم کر لیتے ہیں۔ مدرس بالواسطہ ضبط قائم رکھتا ہے۔ لیکن طلباء اپنی حد تک ضبط کسے آزاد رہتے ہیں۔ تقریباً یہی کیفیت (گوکہ اسقدر نہیں) مدرسہ کی تفریح یا مدرسہ کی بازیگاہ کی بھی رہتی ہے۔ جس میں مدرسین اور طلباء ایک مساوی اور آزاد ماحول میں باہمی طور پر کام کرتے دکھلائی دیتے ہیں۔

سوشیل سروس (صحبتی اجتماع) خود اسکوٹنگ طلبہ کے مختلف مقاصد میں سے ایک مقصد ہے۔ ایسے طلباء میلوں، نمایشوں اور دیگر خاص مواقع پر منجانب مدرسہ عوام کی مدد کرتے ہیں یا ایسی صورت میں جبکہ مدرسہ کی بے حرمتی ہوتی ہو۔ یہ باقاعدہ جماعت اپنا کام دکھلاتی ہے۔ لیکن ایسی جماعت سے نسبت آزادانہ طریقۂ ضبط جماعت کے مفاد اسطرح حاصل ہوتا ہے کہ مدرسہ کیلئے طلباء ہی میں مدرسہ کی محبت پیدا ہوتی ہے۔ جو عموماً مدارس کے سالانہ صحبتی اجتماع میں طلباء سے غیر معمولی طریقہ پر نمایاں ہوتی ہے۔ اور یہ فی الحقیقت ایک موروثی تحفہ ہے جو مادر مدرسہ اپنے بچہ کو دیتی ہے

یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ آزادانہ ضبط جماعت کی مذکورہ مثالیں زیادہ تر ایسی ہیں جو مدرسہ کی چار دیواری سے غیر متعلق ہیں، جماعت کی حد تک اس کے عمل کے چند خاص صورتوں کے علاوہ جن کا وضوح اوپر کر دیا گیا ہے یہ طریقہ فی الحال کارگر نہیں ہوسکتا۔ تمام مدرسین میں ضبط جماعت کی صلاحیت مساوی نہیں ہوتی۔ اور گوکہ تجربہ اور تعلیم سے یہ قوت ضرور ترقی پاتی ہے۔ لیکن زیادہ تر یہ خوبی طبعی

اور پیدایشی ہے۔ مدرس میں جسقدر ضبط جماعت کا مادہ زیادہ ہوگا۔ اسیقدر زیادہ وہ طلباء کو آزاد رہنے کا موقعہ دیسکتا ہے۔ کیونکہ ضابط مدرس کے لئے (جنکی تعداد بلتقابلہ بہت کم ہے) ضبط جماعت' مداری کی چھڑی ہے جسکو وہ بروقت ضرورت کام میں لاتا ہے۔ وہ جب چاہے طلبار کو آزادی کا اختیار دے اور جب چاہے یہ بتلادے کہ یہ آزادی سوشیل قیود کی تعلیم ہے۔ لیکن ایسے مدرس کیلئے جسکو ضبط جماعت کا گُر بخوبی یاد نہیں اس طریقہ سے آزادی کا اختیار دینا لازمًا خطرناک ہے۔ کیونکہ ایک دفعہ آزاد کرنے کے بعد وہ طلبار پر کافی ضبط قائم نہیں رکھ سکتا۔

بالآخر یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ تعلیم طلباء کو دینا گیں رہتے سہتے، اور سوسائٹی ملنے جلنے کی تعلیم ہے اور خود سوسائٹی مختلف قسموں کی قیود سے آزاد نہیں ہے پس اسکی تعلیم کی بہترین ابتدا مدرسہ میں ہی ہوسکتی ہے۔ مدرسین کا فرض یہ ہے کہ نہ تو طلبا کو خوفِ سزا سے اس قدر خائف کردیں کہ ان کی جدت' تازگی اور جولانیٔ طبع جو ان ہونہار پودوں کی ممیز خصوصیت ہوتی ہے زائل ہو جائے۔ اور نہ ان کو اسقدر آزادی کے مواقع دئیے جائیں۔ کہ اُن کی قوارِ عملی کو غلط راستے پر ڈال دیں اور تعلیم جو ان کی مدرسہ میں شرکت کی غایت ہے مفقود ہو جائے۔ بلکہ مدرس کو چاہئے کہ تلطف و خوش اخلاقی سے طلبار کے دل میں اُنس و ہردلعزیزی پیدا کرے۔ جو اسکو ایک کامیاب مدرس بنانے میں مدد دیسکے۔

پس دورِ ثانی کے ماہرین کی رائے انسب ہے۔ اور دورِ آخر کے ماہرین کا خیال چند خاص صورتوں میں جنکا ذکر قبل کردیا گیا ہے قابل عمل ہے۔

مخاطبات

انجمن اساتذہ مستقر بلدہ کا دوسرا سالانہ جلسہ جو امرداد ۱۳۳۶ف میں منعقد ہونے والا تھا چند ناگزیر اسباب کی بنا پر آیندہ آذر تک ملتوی کر دیا گیا ہے۔

ہمارے رسالہ کے شعبۂ انگریزی کے جائنٹ ایڈیٹر ریورند فادر پال رائن ریکٹر آل سینٹس انسٹیٹیوشن کی غیر متوقع واپسی وطن پر ہم کو بیحد افسوس ہے تھا دراین انجمن اساتذہ بلدہ کے ایک نہایت سرگرم کارکن تھے اور اپنے اخلاق حمیدہ و اوصاف پسندیدہ کی وجہ سے وہ بیحد ہر دلعزیز رہے ہیں چنانچہ ان کی واپسی پر بتاریخ ۱۲ فروری ۱۹۲۷ء مرکزی انتظامی کمیٹی انجمن اساتذہ۔ بلدہ نے حسب ذیل رزولیوشن منظور کیا۔

"اراکین مرکزی انتظامی کمیٹی انجمن اساتذہ۔ بلدہ کو یہ معلوم ہو کر سخت افسوس ہوا کہ ریورنڈ فادر پال رائن انگلستان کو واپس جا رہے ہیں۔ اراکین مذکور صاحب موصوف کی قیمتی خدمات کو جو انہوں نے اس انجمن کیلئے خصوصاً اور حیدرآباد میں تعلیم کے متعلق عموماً انجام دی ہیں نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں"۔

بتاریخ ۲۶ مارچ ۱۹۲۷ء مطابق ۲۱ اردی بہشت ۱۳۳۶ف محبوب کالج سکندرآباد کا سالانہ جلسۂ تقسیم انعامات زیر صدارت جناب صاحب عالیشان بہادر بمقام سکندرآباد منعقد ہوا۔ بعد تقسیم انعامات صدر جلسہ جناب سر ولیم بارٹن صاحب بہادر نے ایک نہایت مفید اور پر مغز تقریر فرمائی۔

آپ نے فرمایا کہ کسی مدرسہ میں طلبہ کی تعداد کا اسقدر بڑھ جانا جس سے کافی

نگرانی مشکل ہو جائے کچھ مستحسن نہیں ہے۔ بلکہ ایسی صورتوں میں طبقات تحتانیہ و وسطانیہ کو مستقل طور پر علیحدہ علیحدہ نگرانی میں رکھنا چاہئیے۔ تاکہ نظم میں بے ترتیبی نہ پیدا ہونے پائے۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ اساتذہ کا فرض صرف اسی پر تمام نہیں ہو جاتا کہ وہ نصابی تعلیم کی تکمیل کرا دیں بلکہ بڑی ضرورت اس امر کی ہے کہ طلباء میں غور و فکر اور علمی تحقیق و کاوش کا مادہ پیدا کیا جائے جس سے وہ بعد فراغت تعلیم بھی اپنے علمی مذاق کو قائم رکھ سکیں۔ مدارس میں فنی تعلیم کے متعلق آپ نے فرمایا کہ مجھے افسوس ہے کہ مدارس میں عموماً ادبی تعلیم پر زور دیا جاتا ہے۔ اور یہی چیز قابل توجہ سمجھی جاتی ہے حالانکہ فنی تعلیم کا دیا جانا طلبہ کی آئندہ زندگی کیلئے بیحد ضروری ہے۔ اور ادبی تعلیم کے ساتھ ساتھ فنی تعلیم پر بھی خاص توجہ کیجانی بہت اہم ہے۔ سب سے اہم اور دلچسپ حقیقت جسکا اظہار مسز صدر نے فرمایا وہ اساتذہ کے مشاہرات کے متعلق ہے۔ آپ نے فرمایا کہ عموماً اساتذہ سے یہ توقع رکھی جاتی اور یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے مشاہرات میں ایثار سے کام لیں۔ اور بلا لحاظ مفاد ذاتی زحمت اٹھائیں حالانکہ کوئی وجہ نہیں کہ جبکہ دوسرے سررشتہ جات کے ملازمین سے ایسی توقع نہیں کیجاتی تو طبقہ اساتذہ سے یہ امید کیجائے۔ علی الخصوص جبکہ وہ قومی نسل کو طیار کرنیکا اہم اور اعلیٰ کام انجام دے رہے ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ اسی خیال کے مد نظر میں نے محبوب کالج کے رقم امداد کو چھ ہزار سے دس ہزار کر دیا ہے۔ تاکہ اساتذہ کی تنخواہوں میں معقول و مناسب اضافہ کیا جا سکے۔ اس تقریر کے بعد جلسہ کا اختتام عمل میں آیا۔

نوٹ:- یہ امر باعث مسرت ہے کہ سر ولیم بارٹن صاحب بہادر نہ صرف محبوب کالج بلکہ سکندرآباد و رزیڈنسی کی جملہ تعلیمی کاموں کی طرف خاص دلچسپی کا اظہار فرماکر پوری فراخدلی سے مالی امداد عطا فرما رہے ہیں جو وہاں کی تعلیمی ترقی کیلئے ایک عمدہ مستقبل کا ضامن ہے۔

طلبائے دار العلوم کی "سیر الیورا" کے عنوان سے ایک دلچسپ اور مفید مضمون اشاعت ہذا میں شائع ہونے والا تھا مگر کمی گنجایش کی وجہ سے درج ہونے سے رہ گیا۔ آئندہ اشاعت میں نذر ناظرین ہوگا۔

امپیریل ایجوکیشن کانفرنس یعنی کل سلطنت برطانیہ کی تعلیمی کانفرنس کا انعقاد بمقام لندن ۲۰ر جون سے ۸ر جولائی ۱۹۲۷ء تک عمل میں آنے والا ہے۔ کانفرنس مذکور ہر تین سال کے بعد منعقد ہوتی ہے جس میں برٹش امپائر کے تمام حصص سے ماہرین تعلیم مجتمع ہو جاتے ہیں۔ کانفرنس کی انتظامی تشکیل میں نوآبادیات اور ہندوستان کے نائبین کو بھی شرکت کا موقعہ دیا گیا ہے۔ سال حال پرنس آف ویلز بھی بوقت افتتاح تشریف لائیں گے۔ جو امور کہ کانفرنس کے روبرو بغرض بحث و تمحیص آنے والے ہیں ان کے پانچ عنوانات کر دیئے گئے ہیں۔ عنوان اول میں طلبہ کی عملی زندگی کو رکھا گیا ہے جس میں فنی تعلیم کو خاص دخل ہوگا۔ عنوان دوم میں ممالک منطقہ حارہ کے مختص تعلیمی معاملات کو رکھا گیا ہے جہاں مختلف فرقے آباد ہوتے ہیں۔ عنوان سوم زراعت پیشہ طبقہ کی تعلیم کے لئے مخصوص ہے۔ عنوان چہارم تعلیم کے نظریات و ترقیات جدیدہ سے متعلق ہے اور عنوان پنجم کو تعلیمی تنظیم کے وسیع مسائل کیلئے مخصوص کیا گیا ہے۔ ترقیات جدیدہ کے ضمن میں مدارس کیلئے سینما وغیرہ کے استعمال پر بحث کی گئی۔

کانفرنس مذکور میں ریاست حیدرآباد کی نیابت کیلئے سرکار عالی نے جناب مولوی محمد حسین صاحب بی۔ اے (آکسن) نائب ناظم تعلیمات اور جناب مولوی سید علی اکبر صاحب بی۔ اے (کینٹب) صدر مہتمم تعلیمات بلدہ کا انتخاب کیا ہے۔

سنہ ۱۹۲۷ء

اتھلیٹک اسیوسی ایشن کے آخری مقابلے بتاریخ ۲۴ اسفندار ۱۳۳۶ف م ۲۷ جنوری
ہوئے تمام مقابلوں میں دار العلوم اور گورنمنٹ ہائی اسکول کی رسہ کشی کا مقابلہ اور محمد امیر
طالب علم انجینرنگ اسکول کی پول جمپ قابل دید تھی۔ دار العلوم اور گورنمنٹ ہائی اسکول
کے مقابلہ کو دیکھکر اکثر حضرات نے دو تین سال قبل کے نارمل اسکول اور عثمانیہ
کالج کے مقابلہ کو یاد کیا جسمیں رستہ تقریباً تین منٹ تک رکا رہا تھا۔ اس سال جناب
مولوی سید محمد ہادی صاحب معتمد اتھلیٹک اسیوسی ایشن و صدر مہتمم ورزش جسمانی نے
اساتذہ حضرات کیلئے سو گز کی دوڑ اور کرکٹ کی گیند پھینکنے کا انتظام کیا تھا۔
جس میں صاحب موصوف نے خود بھی حصہ لیا۔ ان ہر دو مقابلوں میں مولوی عبد المجید صاحب
مدرس مدرسۂ عالیہ اول رہے۔ عالیجناب ناظم صاحب بہادر تعلیمات کی جانب سے
عصرانہ کا انتظام کیا گیا تھا۔ شام کے ساڑھے پانچ بجے تک تمام مقابلے ختم ہوگئے۔
ناظم صاحب ورزش جسمانی نے انگریزی میں گزشتہ سال کی رپورٹ سنائی اور اس کے
ساتھ کساتھ اسپورٹس کی اہمیت کیجانب توجہ دلائی۔ مسز ڈیورنڈ نے کامیاب طلباء کو
انعامات تقسیم کئے۔

تقریباً چوبیس انعامات جن میں ایک نقرئی شیلڈ سترہ نقرئی کپ اور چھ نقرئی
تمغے تقسیم کئے گئے۔ عثمانیہ یونیورسٹی کالج نے (۳۶) پائنٹ بنائے اور ڈویژنل
چامپین شپ کی شیلڈ حاصل کی۔ نظام کالج کا نمبر دوسرا رہا۔ مدارس فوقانیہ کی
چامپین شپ کی شیلڈ چادرگھاٹ ہائی اسکول نے اور مدارس وسطانیہ کی میتھوڈسٹ
بائز اسکول نے اور مدارس تحتانیہ کی فوقانیہ چادرگھاٹ نے حاصل کی۔ شیر علی طالب علم
نظام کالج کو بہترین کھلاڑی ہونے کے صلہ میں ایک بڑا نقرئی کپ دیا گیا۔

آخر میں اعلحضرت بندگان عالی اور شہزادگان والاتبار کیلئے نعرہ ہائے مسرت
بلند کئے گئے۔ مسٹر لافرنی نے اپنے فوجی سپاہیوں سے اور مسٹر سیون نے اسکاوٹس

(طلیعہ) سے انتظامات میں بے حد مدد ملی۔ سال حال کے اسپورٹس نہایت کامیاب ہے جس کیلئے جناب مولوی سید محمد ہادی صاحب اور اُن کے مددگار حضرات مبارکباد کے مستحق ہیں۔

متفرقات

حیدرآباد کی تعلیمی حالت گزشتہ ڈسمبر میں بمقام پٹنہ آل انڈیا ٹیچرس کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ اسمیں مولوی سید علی اکبر صاحب بی۔ اے (کینٹ) صدر مہتمم تعلیمات بلدہ نے "حیدرآباد کی تعلیمی حالت" پر تقریر فرمائی۔ جو اشاعت ہذا کے انگریزی حصہ میں درج ہے۔ اسی تقریر میں صاحب موصوف نے حسب ذیل چار امور کی جانب خاص توجہ دلائی۔ (۱) عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کے باعث ریاست حیدرآباد میں تعلیم کا ایک جدید دور شروع ہوا ہے۔ زبان اردو ریاست میں سرکاری زبان ہونے کے علاوہ عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اور اسکو ذریعۂ تعلیم قرار دینے سے طلباء کو تحصیل علم میں ایک گنا سہولت پیدا ہوگئی ہے جو ہندوستان کی دوسری یونیورسٹیوں کے طلباء کو حاصل نہیں ہے۔ اسکے ساتھ انگریزی کے معیار کو بھی بلند کرنے کی کوشش کیجا رہی ہے (۲) حیدرآباد کے نظام تعلیم کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ گو ابتدائی تعلیم طلباء کی مادری زبان میں دیجاتی ہے۔ لیکن برخلاف ہندوستان کے اکثر دیگر حصص کے ہمارے ہاں زبان کے لحاظ سے جداگانہ مدارس قائم نہیں کیے گئے ہیں کیونکہ اگر ایسا کیا جاتا تو مختلف مذاہب کے طلباء کو آپس کے میل جول کا موقع نہیں ملسکتا۔ اور فرقہ وارانہ احساسات کے بڑھنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس خطرہ سے طلباء کو محفوظ رکھنے کی غرض سے

مقامی حالات کے اعتبار سے پرائمری مدرسہ میں اُردو اور تلنگی یا اُردو اور مرہٹی یا اُردو اور کنڑی کی متقابل جماعتیں قائم کیگئی ہیں۔ ہندو لڑکے عام طور پر اُردو زبان دوم کے طور پر سیکھتے ہیں۔ اور مسلمان طلباء کو ان کے وطن کی زبان کے لحاظ سے تلنگی مرہٹی یا کنڑی پڑھنے کی ترغیب دیجاتی ہے۔ (۳) سرکاری مدارس کے دوش بدوش تمام ریاست میں خانگی مدارس بھی موجود ہیں۔ پہلے سررشتہ تعلیمات کو خانگی مدارس سے کوئی تعلق نہ تھا حتیٰ کہ سررشتہ کی سالانہ رپورٹ کے لئے مدارس مذکور کے متعلق صحیح اعداد و شمار کو حاصل کرنے میں بھی مشکل پڑتی تھی تعلیم اور حفظان صحت کے اعتبار سے خانگی مدارس کی حالت نہایت ناقابل اطمینان تھی۔ ان تمام خامیوں کے مد نظر جس کا ریاست کے بچوں کی دماغی و جسمانی حالات پر بُرا اثر پڑ رہا تھا۔ گورنمنٹ نے ایک گشتی جاری کی جس میں تمام موجودہ مدارس خانگی کے منتظمین کو ہدایت دیگئی کہ وہ ان مدارس کو رجسٹرڈ کروالیں اور اس کے ساتھ اس امر کی تاکید کیگئی کہ جدید مدارس خانگی بغیر اجازت سررشتہ تعلیمات نہ کھولے جائیں۔ افسوس ہے کہ اندرون نیز بیرون ریاست اس گشتی کے غلط معنی سمجھے گئے۔ اور اس پر حاشیے چڑھائے گئے حالانکہ اس کا منشاء یہ نہیں ہے۔ کہ خانگی مدارس کی تعلیم میں رخنے ڈالے جائیں۔ بلکہ یہ ہے کہ ایسے مدارس صحیح اصول پر کام کریں۔ چنانچہ افسران معائنہ کنندہ کو سختی سے احکام دئے گئے ہیں کہ وہ خانگی مدارس کی ہر ممکنہ مدد کریں اور نصاب کے بارے میں خانگی مدارس کو اب بھی آزادی حاصل ہے۔ البتہ وہ ایسی تعلیم نہیں دے سکتے جو حکومت سے تنفر اور ریاست کے مختلف فرقوں میں اختلاف پیدا کرے۔ (۴) ممالک محروسہ سرکار عالی میں اساتذہ کیلئے سرکار نے جو تنخواہیں مقرر کی ہیں۔ وہ ہندوستان کے دیگر حصص کے مدرسین کی تنخواہوں کے مقابلہ میں کم نہیں ہیں۔ اور جیسے سررشتہ

تعلیمات میں تنخواہیں معقول ہوگئی ہیں۔ ایسے اساتذہ کی فراہمی میں سہولت ہوگئی ہے جو باعتبار قابلیت علمی پیشہ مدرسی کے اہل ہونے کے علاوہ طلبار پر اچھا اخلاقی اثر بھی ڈال سکیں۔

اشاعت کے انگریزی حصہ میں مسٹر ہوگلے مددگار مدرسہ تعلیم المعلمین اورنگ آباد کا ایک مضمون "ضبط جماعت" پر شائع کیا گیا ہے جس کا ضروری اقتباس ذیل میں درج ہے جماعت کے انتظام کا انحصار تین امور پر ہے۔ (ا) ضبط (ب) تدریس (ج) تنظیم

(ا) ضبط جماعت کا ضبط مدرس کی شخصیت پر منحصر ہے مگر ضبط کے معنی یہ نہیں ہیں کہ طلبار جماعت میں تصویر کی طرح خاموش بیٹھے رہیں۔ بچوں کے ساتھ مدرس کا برتاؤ شفقت اور خندہ پیشانی کا ہونا چاہئے نیز طلبہ کو جسمانی سزا دینے کا موقع ہی نہ آنے دیا جائے اور اگر کبھی جسمانی سزا کے سوا چارہ نہ ہو تو ایسی سزا بروقت اور حالات کا لحاظ کر کے دینی چاہیئے۔ مدرس صرف آنکھوں کے ذریعہ سے جماعت میں ضبط قائم رکھ سکتا ہے۔ طلبار فطرتاً مدرس کے نیک اخلاق کی تقلید کرتے ہیں چنانچہ مدرس کو ستودہ صفات سے متصف ہونا چاہیئے۔ ضبط جماعت کی بہترین دلیل یہ ہے کہ پاس ادب کے ساتھ ساتھ طلبار و مدرس میں اُنس رہے۔

(ب) تدریس مدرس کی کامیابی موزون تمہید، باقاعدہ ترتیب اسباق، و ذاتی سعی طلبار پر منحصر ہے۔ مدرس کے معلومات وافر و تازہ ہوں۔ البتہ وہ جماعت میں صرف طلبار کی رہنمائی کرے۔ طلبار کی دلچسپی مدرس کی کامیابی تعلیم کا معیار ہے۔ سبق دلچسپ بنانے کے ذرائع موزون قصے، تصاویر، توضیحات اور نمونہ جات ہیں۔

(ج) تنظیم (ا) اُصول حفظان صحت۔ جماعت کا کمرہ کشادہ روشن اور ہوادار ہونا چاہیے ڈسک موزون ہوں اور تختۂ سیاہ جماعت میں مناسب مقام پر رکھا جائے۔ ان طلبار

کی نشست کا خاص اہتمام ہونا چاہیئے جس کو ثقل سماعت یا ضعف بصارت کی شکایت ہے (۲) تختۂ اوقات تعلیم کی ترتیب میں اس امر کا مناسب لحاظ ہونا چاہیئے کہ طلبا کو علی التواتر مشکل اور دقیق اسباق کا سامنا نہو۔ تعلیمی گھنٹے مختصر ہونے چاہئیں خصوصاً چھوٹے بچوں کیلئے۔ (۳) اطاعت وضبط کی تعلیم کیلئے مانیٹر کا تقرر لازمی ہے جماعت کے چند جزئی انتظامات کی ذمہ داری اسی پر عاید کیجائے۔ ہر ماہ مانیٹر تبدیل کیا جائے۔ تاکہ دیگر مستحق طلبا اس سے محروم نرہیں۔ ڈریل اور کھیل میں بھی باقاعدگی ملحوظ رکھی جائے۔

انجمن اساتذہ صوبہ گلبرگہ کے اجلاس سوم کی رپورٹ موصول ہوئی ہے اجلاس مذکور بمقام رائچور زیر صدارت مولوی سید محمد حسین صاحب بی۔ اے (آنرز) نائب ناظم تعلیمات ۱۱ ماہ امرداد ۱۳۳۵ف میں منعقد ہوا جس کے ساتھ ایک نمائش تعلیمی بھی تھی۔ انجمن مذکور کی مقبولیت اور ترقی اس کے بیدار مغز میر مجلس مولوی سجاد مرزا صاحب صدر مہتمم تعلیمات صوبہ گلبرگہ شریف اور اس کے جوشیلے معتمد مولوی محمد عبدالسلام صاحب منشی فاضل کی انتھک کوشش اور دلچسپی کا نتیجہ ہے مولوی سید احمد رضا صاحب واسطی صدر مجلس استقبالیہ کا خطبہ نہایت جامع اور مفید ہے نیز اجلاس ہذا کے جملہ تحریکات وتقریرات سے معلوم ہوتا ہے کہ صوبہ گلبرگہ پوری طرح اپنی تعلیمی ضروریات سے باخبر ہوکر بتدریج ہر قسم کی اصلاح وترقی کر رہا ہے۔ سب سے اہم مسئلہ جسکو روئداد کا خلاصۃ الباب کہنا چاہیئے مدارس خانگی اور اسکی متعلقہ گشتی کی بحث ہے۔ جس میں کامل اتحاد واتفاق کے ساتھ مخالفین ومعترضین کو تشفی بخش جواب دیا گیا ہے۔ جو اس امر کا پرمسرت ثبوت ہے۔ کہ ملک کے تعلیمی مسائل پر غور وفکر کرنے والے کافی تعداد میں پیدا ہوگئے ہیں۔ بہتر ہوگا اگر اس قسم کی تمام انجمنیں ایک ہی

سلسلہ میں مربوط ہو کر اپنا ایک مرکز قائم کرکے کام کریں تاکہ مرکزی طور پر مزید تنظیم اور فائدہ پیدا ہو جائے۔ روئداد نہایت دلچسپ اور قابل دید ہے۔ اور بقیمت (۴ھ) معتمد صاحب انجمن اساتذہ گلبرگہ سے مل سکتی ہے۔

مدرسہ فوقانیہ عثمانیہ نلگنڈہ کی پہلی سالگرہ اور تقسیم انعامات و اسناد کے سالانہ جلسہ کی کارروائی منجانب دفتر انجمن اساتذہ مستقر مذکور وصول ہوئی ہے اجلسہ مذکور بتاریخ ۹ فروری ۳۶ف زیر صدارت نواب مرزا یار جنگ بہادر ہبر مجلس عدالت العالیہ منعقد ہوا اور ایک کثیر مجمع کی موجودگی میں جس میں جملہ مقامی عہدہ داروں نے حصہ لیا تھا بہ کامیابی اختتام کو پہونچا۔ نماز مغرب تک اسپورٹس (ورزشی کھیلوں) اور اسکاوٹ بوائز (طلباے طلیعہ) کے کرتبوں کا سلسلہ رہا بعد نماز مغرب قرات و حمد و نعت اور بھجن خوانی عمل میں آئی ازاں بعد دو کمسن طلبہ نے سرکاری تعلیم کی اہمیت اور خانگی تعلیم کی مہملیت پر بطور محاکمہ ایک مکالمہ کیا جو بہت دلچسپ تھا پھر مولوی احمد عبدالعزیز صاحب مولوی فاضل صدر مدرس نے مدرسہ کی رپورٹ سنائی ازاں بعد جناب صدر محترم نے اپنی تقریر میں طلبہ کو قیمتی پند و نصائح فرمائے اور تقسیم انعامات کے بعد جلسہ برخاست ہوا۔ جلسہ مذکور میں اسکاوٹ (طلیعہ) اور ڈرل کا کام حاضرین نے بہت پسند کیا مولوی حیدر علی صاحب اسکاوٹ ماسٹر (افسر طلیعہ) کی حاضرین نے بہت تعریف کی اور مدرسہ کی جانب سے ایک نقرئی تمغہ بھی صاحب موصوف کو عطا کیا گیا۔

ہم جلسہ کی کامیابی اور عمدہ تنظیم نیز ارباب کار کی روشن خیالی اور حالات زمانہ سے باخبری پر بہ خلوص ان کو نیز انجمن اساتذہ مستقر نلگنڈہ کو مبارکباد دیتے ہیں۔

مدرسہ وسطانیہ انگریزی تعلقہ سریاپیٹ ضلع نلگنڈہ کی جلسہ اسپورٹس کی کارروائی وصول ہوئی ہے جلسہ مذکور مولوی غلام نیر دانی صاحب ایم۔ اے ناظم آثار قدیمہ ملک سرکار عالی کے زیر صدارت ۱۴ بہمن ۱۳۳۶ ف کو منعقد ہوا اور مولوی نصیر احمد بیگ صاحب منشی فاضل تحصیلدار و ڈاکٹر نیر جن مدلیار صاحب کی کوششوں اور توجہ سے بہت کامیاب رہا۔ جناب مرزا صاحب موصوف کی طرف سے جن کی علمی و عملی قابلیت ماشاء اللہ مسلمہ ہے طلبہ کو نقری تمغہ جات تقسیم کئے گئے اور جناب صدر کی فاضلانہ تقریر کے بعد جلسہ ختم ہوا۔

تنقید و تبصرہ

مجلہ عثمانیہ یوں تو جس تاریخ سے انجمن اتحاد و کلیہ جامعہ عثمانیہ کا افتتاح ہوا ایک ایسے رسالہ کی ضرورت محسوس کیجارہی تھی جو حقیقی معنوں میں طلبار کا سچا ترجمان اور اس کے خیالات کا آرگن ہو۔ مگر اس بیت و لعل میں دو چار سال گزر گئے کہ آیا پرچہ کو بالکلیہ طلبار کے حوالہ کیا جائے یا وہ اساتذہ حضرات کے قبضہ قدرت میں رہے مگر بحمدہ بہت سی کشمکش کے بعد مولوی عبدالرحمن خانصاحب صدر کلیہ کی منصف مزاج اور جمہوریت پسند طبیعت نے بہت جلد خوشگوار تصفیہ کر دیا اور اب اس عظیم الشان دار العلوم کے رسالہ کا پہلا نمبر "مجلہ عثمانیہ" کے نام سے دنیا کے سامنے آیا ہے جو تقریباً ۲۰۰ صفحات پر مشتمل ہے جن میں سے ۱۸۲ اردو کے حرف ۴۲ صفحے انگریزی کے حصہ میں آئے ہیں۔ انگریزی حصہ کے آغاز پر شہریار دکن خلد اللہ ملکہ کی تصویر زیب رسالہ ہے۔ اردو کا حصہ بیحد قابل ستائش ہے حضرت استاد سلیم کی نظم پڑھتے ہوئے حب وطن کے جذبات موج زن ہوتے ہیں۔ نظم کے لفظ لفظ سے صداقت سچی ہمدردی ٹپکتی ہے ہمیں قوی امید ہے کہ دکن کے ہونہار

طلباء حرف خوانی یا وزن یا الفاظ کی چند بندش کی خاطر نہیں بلکہ اسکی اصلی روح اور اس کے پیغام کو بار بار پڑھکر اس کے ایک ایک لفظ پر عمل کرینگے۔
بدرصاحب کی نظم بھی کچھ کم نہیں۔ ابھی سے اس میں آنے والے زمانہ کے استادت کی جھلکیاں دکھائی دے رہی ہیں۔ مولوی حبیب اللہ صاحب رشدی کے مضمون کی شان سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ ایک زبردست سلسلہ کی ابتدا ہے جو آگے چل کر کتابی شکل اختیار کرسکتا ہے۔
افسانہ والا مضمون بھی کافی دلچسپ ہے جو موجودہ افسانہ نویس حضرات کے لئے کافی مدد معاون ہے۔
میر حسن الدین صاحب کا مضمون ہرکس و ناکس کی سمجھ سے باہر ہے مگر فلسفی حضرات اس کی خوب داد دینگے۔ مضمون سے صاحب مضمون کی کاوش طبع کا پتہ چلتا ہے۔ ع اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔
مولوی عظمتہ اللہ خاں صاحب کے مضمون کے متعلق کچھ کہنا تحصیل حاصل ہے صاحب موصوف جیسے کہنہ مشق اساتذہ کا وجود بجد غنیمت ہے۔
افسوس ہے کہ انگریزی حصہ ایک حد تک اردو حصہ کا لحاظ کرتے ہوئے مایوس کن ہے۔ گو ایڈیٹر صاحب حصہ انگریزی نے اسکی توضیح فرمادی ہے مگر اس پر بھی ہمیں مسٹر اسپیٹ اور مسٹر افضل حق سے اُمید ہے کہ وہ آیندہ نمبر میں اسکی کافی تلافی فرما دیں گے۔ انگریزی حصہ میں ڈاکٹر عبداللطیف صاحب کا غالب والا تنقیدی مضمون بھی قابل ذکر ہے۔ اچھا ہوتا اگر صاحب موصوف کے مضمون کا اُردو ترجمہ بھی ساتھ شائع ہوتا تاکہ نرے اُردو دان حضرات کو بھی اس سے بہرہ ور ہونے کا موقعہ ملتا۔
اگر خود صاحب موصوف ان اصولوں پر جو وضع کئے گئے ہیں اپنا قیمتی

وقت صرف فرما کر غالب کی شرح کی طرف توجہ کریں تو زیادہ مناسب ہوگا اور اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنی نوعیت کی واحد کوشش ہوگی جو طرز جدید کے زیور سے آراستہ ہوگی۔ کالج کی سرگرمیوں اور دلچسپیوں کیلئے آخر میں کافی جگہ دی گئی ہے جو کالج کے دور افتادہ قدیم طلباء کے احیائے جذبات کیلئے اچھی چیز ہے۔

رسالہ کے دیکھنے سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ آیا وہ سہ ماہی ہے یا ماہانہ۔ ہمیں ڈاکٹر نظام الدین صاحب جیسے مادر وطن کے سپوت اور مسٹر اسپیٹ جیسے لائق پروفیسر سے قوی امید ہے کہ وہ رسالہ کے موجودہ معیار کو نہ صرف برقرار رکھنے بلکہ اس کو مزید جلا دینے کی کوشش کرینگے غرض کہ عام طور پر طلبائے کلیہ کی یہ پہلی کوشش اس قابل ہے کہ ذی علم حضرات اسکی قدر کریں۔

رسالہ کی قیمت طلبائے قدیم کیلئے (عہ) اور دیگر حضرات معاونین کیلئے (للعہ) سکہ عثمانیہ سالانہ رکھی گئی ہے اور رسالہ ہذا مولوی عبدالجلیل صاحب بی۔اے منیجر رسالہ ''مجلہ عثمانیہ'' عثمانیہ کالج سے دستیاب ہوسکتا ہے۔

جامعہ جامعہ ملیہ رسالہ مذکور رسالہ ''معارف'' اعظم گڈھ کے بعد دوسرا رسالہ ہے جو نہایت قابل اور مخلص داعون کی قلم فرسائی اور کوشش کا نتیجہ ہے۔

دفتر جامعہ ملیہ دہلی سے نمونہ مل سکتا ہے۔

المعلم رسالہ المعلم پہلے مولوی سید محمد حسین صاحب سابق صدر مہتمم تعلیمات صوبہ میدک (حال نائب ناظم تعلیمات) کی ادارت سے شائع ہوتا تھا اب مولوی سجاد مرزا صاحب صدر مہتمم تعلیمات گلبرگہ کی ادارت اور مولوی عظمۃ اللہ خانصاحب مددگار ناظم تعلیمات کی شرکت میں شائع ہورہا ہے۔ یہ پہلا رسالہ ہے

جسنے طبقۂ معلمین کی رہبری کا بیڑا اٹھایا اور اب بھی اسیطرح انجام دہی فرائض میں مصروف ومشغول ہے
مولوی عظمۃ اللہ خانصاحب جیسے قابل مضمون نگار کا نام خود رسالہ کے مضامین
کے ارفع واعلیٰ ہونیکا کافی ثبوت ہے مولوی صاحب موصوف کے زور قلم اور انکے
ہندی وزنوں میں سخن سنجی سے ہر کس وناکس واقف ہے۔
یہ پہلا رسالہ ہے جسمیں معاشی اصول کیساتھ ساتھ ملکی وصنعتی ترقی کا لحاظ کرتے ہوئے
دیسی کاغذ استعمال کیا گیا جسکے لئے مولوی محمد حسین صاحب بانی رسالہ خاص طور پر قابل مبارکباد ہیں
یہ ماہانہ رسالہ قیمت (۱۲؍) دفتر المعلم سیف آباد سے مل سکتا ہے۔

سالنامہ آصفیہ یا صحیفہ ڈائرکٹری | ڈائرکٹری بھی مہذب ممالک کا وہ طریقہ ہے
جس کے ذریعہ سے ملک کے موجودہ اور تازہ ترین اندرونی وبیرونی تعلقات
اور مفید امکانات و ذرائع سے پبلک بیک وقت واقف کرادیجا سکے سالنامہ
مذکور ملک کے مشہور روزنامہ "صحیفہ" کے مدیر سید اکبر علی صاحب نے کافی محنت
سے مرتب فرمایا ہے جیسا کہ کتاب کے دیباچہ سے ظاہر ہوتا ہے سالنامہ مذکور
میں ریاست کے متعلق جملہ ضروری معلومات کو فراہم کردیا ہے اور حتی الامکان نہایت
صحت کے ساتھ اعداد وشمار کے خاکے اور مختلف ضروری نقشہ جات درج کیئے ہیں
اور ملک کی ایک عمدہ خدمت انجام دی ہے ایک امر البتہ غیرضروری ہے جسکی وجہ سے
ضخامت اور اسی نسبت سے قیمت میں غالباً اضافہ ہوگیا ہے یعنی مڈل کے نتیجہ کی
طویل اشاعت اس صورت میں جبکہ میٹرک کی کامیابی کو ملازمت کا معیار قرار دیا گیا ہے
غیرضروری تھی۔ بہرحال یہ کتاب ان اشخاص کے لئے جو ریاست کے متعلق کوئی
معلومات رکھنے کے باوجود بھی مدعی معلومات ہیں ایک شمع ہدایت کا کام دے سکتی ہے
پتہ: صحیفہ پریس۔ قیمت (عہ) مجلد

---

evelopments in the future, and if several schools adopt this system, we can arrange for inter-school matches also. I am certain this will create a very healthy spirit among the boys and a real interest in spelling, with the improvement of which half of our difficulties in the teaching of English will disappear.

I have also adopted this method for popularising the study of English idioms, and I think it can be used with great advantage in lower classes for making boys give English synonyms for different words in their English textbooks.

HYDERABAD (DECCAN),
15th March 1927.

I have the honour etc.,

G. S. P.

this work, otherwise it will degenerate into mere fun or mere routine work.

Another point is that I do not allow the word to be spelt out orally as it is bowled. The batsman and the bowler have both got to write it down in their notebooks and then read out what they have written. At the same time, the other boys in the class do not keep quiet and remain passive spectators as the 'Tamasha' goes on. They too have got to write down the words as they are bowled, and have to correct them as they are spelt out from the platform. At the end, the aggregate number of the mistakes of a team is compared with that of the other; and although this has nothing to do with the 'score' of a team, it has its own stimulus for the weaker team to try and get fewer mistakes the next time. The game and the team spirit are thus utilised for spelling work.

The boys are not allowed to select any and every word from dictionaries and bowl it. That becomes a very random sort of work and offers no fair field for competition. So I prescribe 25 pages from the textbooks of the boys and allow only the words which occur in those pages to be bowled. This serves also as a sort of a rough revision of some portion of their textbooks once a week. Words from all sources may be allowed once in a way. Extra words given by the teacher and entered in the 'Word and Phrase' book of the boys may, however, be allowed.

This is not all. The work I have described is only for individual classes. But I sometimes hold inter-class matches. I mean between the various divisions of a particular class. My boys have recently proposed to organise a 'Spelling Cricket Tournament', and have collected subscriptions for a shield—a framed painted paper shield—and a silver medal for the top scorer. It has not been possible to conduct the tournament yet, but we hope to have

other classes in the school this clapping may be restricted a little. The teacher should learn to take a real interest in the game, and although he stands in his own place, he should exhibit such signs of activity as a referee in a real cricket field does.

This is how I conduct the game. The class is divided into two equally-matched permanent teams with captains elected by the teams. In one lesson not more than 24 boys can take part. According to a scheme which the captains draw up, all the boys get their turns in the month. The main lines of the game as conducted by me are much the same as those of Messsrs. Kulkarni and Bhave. Only I have done away with all the terms L. B. W., Run-out, and so on. A mistake in spelling by the addititon of a letter or omission of a letter is a mistake. As regards pronunciation, I am not very strict either, knowing as I do the many defects of our teachers in this matter. However, if there is a very gross mispronunciation of a word, I give a 'Bye'. I allow only three turns for each 'bowler' as thereby the total number of words bowled by 24 boys in the two 'Innings' will be 72, quite a good number for 50. Even this will be possible only if the teacher conducts the work very briskly. As the parties will be equally matched, there need be no doubt as to whether each bowler will have the chance to bowl his 3 words. Very often the number of words bowled from both the sides put together approximates to 72.

I recognise the 'Boundary' too, more for the fun of it than for any thing else, for the 4 points which a batsman earns by the bowler's weakness need not make him think that he is any the stronger for that in spelling. But a 'Boundary', as I said, adds a little spice to the game without wasting much time, and time too is certainly a great consideration in this work. I want play on the one hand and time and utility on the other to share equally in

Hardikar in his article. I happened to hear of this 'game about two years back. In the various efforts I was making at that time to set right the spelling of my boys, I thought I would give a trial to this experiment as well. I accordinly mastered the technique of the game and introduced it in one of my classes. The boys evinced a great deal of interest in it in the beginning, but I soon found that the elaborate technique of the 'game'—L. B. W.,—Stumped, Run out, Hit—Wicket, Caught out and so on—tired them out, and I must confess, their leader also.

I felt that the details were too fancifully worked out to make the game useful to the boys. It might do well once in a way as an exercise affording amusement and instruction, but if it is to be of real and practical use, it has to be employed once at least every week and then only could it show us some clear and actual results. For this purpose, it had to be incorporated with, or rather it had to take the place of, the weekly dictation lesson. I have said "the weekly dictation lesson", for I am of opinion that from the lowest to the highest of our classes there must be provision for one peirod a week for dictation or, as I like to call it, a spelling lesson. The 'Spelling Cricket' with all its technique and six turns for each bowler cannot possibly fulfil this object. In a class of 24 boys it takes nearly 1½ hours for the two 'Innings' to be over. I, therefore, took my own liberties with the game and rid it of much of its technique that it might secure some real purpose and at the same time accommodate itself to one period of fifty minutes. I have found thereby that the interest of the boys in the game has in no way diminished. Of course, much of the success of the 'game' depends on the personality of the teacher. He has to forget, in conducting this work, his stiffness and reserve, and create an atmosphere required for a real game, and should allow a 'team' to cheer its men and even to clap hands sometimes, although in the interests of

would improve by articulation and Touchstone by a little less of over-acting. The minor characters, with one or two exceptions, had been appropriately chosen and they all went through their parts with a fair amount of success.

I conclude this brief account of the play with congratulations to the Principal and members of the staff of the City College on the splendid entertainment they were able to provide, which one can say without the least exaggeration, attained, on the whole, a higher standard than the plays presented occasionally by the various local Dramatic Unions. It was indeed a matter for regret that so few persons interested in the education of the young availed themselves of this opportunity. For the benefit of these is it too much to expect that the City College Dramatic Association would repeat the performance in the near future and give them a chance to see what it is capable of? Whether the Association takes this trouble again or not, it is to be hoped that the presentation of some play or other by the Association will become an annual affair.

A. H. K.

Correspondence.

To

The Editor,

'The Hyderabad Teacher',

Hyderabad.

SIR,

Having read Mr. Hardikar's article on "English Spelling in the December issue of your journal, I thought I might say a few words on 'Spelling Cricket' referred to by Mr.

that were found in the spacious Hall of the City College had, no doubt, come there out of idle curiosity. The writer of this account belonged to this latter category and was fully prepared to suffer three hours of boredom for the folly of having gone there. But what a pleasant surprise awaited the audience could be realised only by those who witnessed the performance. The whole of it from the beginning to the end was a splendid success. The arrangements were almost perfect. The get-up in the matter of dress etc., including that of ladies' parts, left nothing to be desired. A little foresight and painstaking on the part of the organisers, however, can make a success of these at any place. What caused most surprise was the first-rate acting and high elocutionary talents of various actors. Those who are familiar with the training given in our schools do not expect to see a very high standard of the last in any school. How the boys managed to go through their parts with so few faults of pronunciation and expression is still a mystery and reflects great credit on those who trained them up.

When every one does his best to make the play a success, it is difficult to single out any particular actor for praise. But one cannot help mentioning specially those who by their acting raised the level of the play so far above the standard of school plays. Amongst this class came first and foremost the sprightly but modest Rosalind and the less brilliant Celia, who served marvellously the purpose which Shakespeare intended she should by devoting her talents to the thankless task of acting as a foil to her more brilliant sister. It was really wonderful how a boy could sustain this part right up to the end merging his own personality in that of another of the opposite sex. Merit for good acting should go next to those who acted the Duke Senior Oslando, Touchstone, Fredrick, Oliver and Adam, though at the same time, one must confess that Orlando

High School. Sher Ali of the Nizam College won the large silver cup for the Best Athlete.

The arrangements made on the occasion reflected great credit on the Honorary Secretary of the Athletic Association Mr. S. M. Hadi, as the crowded programme was gone through without the slightest hitch. Nawab Masood Jung Bahadur, the President of the Association, was 'At Home' to those who had been invited to witness the Sports. Mrs. Durand gave away the prizes and trophies to the winners.

While thanking those who had helped him in making the Meet a success, Mr. Hadi announced that efforts would be made to organaise meetings in the districts also and suitable competitors would be selected for the proposed All-Hyderabad Sports Meet next year.

The Annual Inter-College and Inter-School Hockey Tournaments, Hyderabad Deccan, have been won this year by the Osmania College A Team and the Chaderghat High School respectively.

"As you like it" at the City College

When a play is announced to be put on board by the Dramatic Association of any school, the announcement does not generally evoke much enthusiasm even amongst those who are connected with the school and it rarely excites any curiosity amongst the outsiders. The former class of people witness the performance when it comes off as a matter of duty and the latter, if by some chance they go, do so with the full anticipation of being bored. The announcement of a performance of Shakespeare's "As you like it" by the City College Dramatic Association was no exception to this rule. Most of the members of the staff and others connected with the institution must have gone to see the show with a view to encourage the boys, while the few outsiders

ency and justice, he said, it was necessary to pay the teacher well for the important national work performed by him. We commend these words to those responsible for the administration of education everywhere.

A Farewell Entertainment to Mr. K.P.S. Menon.

The teachers of Naya Bazar and the Esamiah Bazar Local Fund Primary Schools gave a farewell entertainment to Mr. K. P. S. Menon, I. C. S., Superintendent of the Residency Bazars on the 6th April, 1927 on the eve of his departure from Hyderabad. On behalf of the teaching staffs of both the schools, Mr. V. K. Lele thanked Mr. Menon for what the latter had done in connection with the reorganisation of the two schools. In reply Mr. Menon expressed his gratification at the improvement in the condition of the schools and hoped that they would be raised to a still higher state of efficiency.

The Annual Athletic Sports.

The Finals of the annual Inter-School and Inter-College Athletic Sports were held on the Fateh Maidan on the 27th January this year. The entries being unusually large, two previous days had to be given for preliminary heats. There were 965 entrants from 23 different institutions. On the Finals' day 54 different events were gone through. Of these 27 were track events. About 24 prizes including a silver shield, 17 silver cups, and six medals were given away after the completion of the sports. The Osmania University College annexed the Divisional Championship shield with a score of 36 points, the Nizam College standing a very close second. The High School Championship was won by the Chaderghat High School. The Methodist High School carried away the Middle School Championship, while the Primary Championship was secured by the Chaderghat

group E will be discussed broad problems of education like the relations between government and assisted or voluntary education, function of government in regard to religious instruction, and the extent to which government can devolve responsibility for primary education to Local Bodies.

His Exalted Highness the Nizam's Government has selected Mr. Syed Mohamed Hussain, B. A., (Oxon), Deputy Director of Public Instruction and Mr. Syed Ali Akbar, B.A., (Cantab), Divisional Inspector of Schools to represent Hyderabad at the above-mentioned Conference.

Education in the Administered Area.

Ever since Sir William Barton assumed charge of the office of Resident in Hyderabad, he has taken a keen interest in education and has given liberal grants to improve the condition of schools in the Administered Area. As a result of this generous policy, there has recently been an outburst of educational activity in Secunderabad, Residency Bazaars and Bolarum. In a speech which the Honourable the Resident delivered at the Mahboob College annual prize distribution held on the 28th February 1927, he lamented the fact that educational institutions in India did not receive from the public that support which was necessary for their efficient maintenance. At the same time, Sir William announced his decision to increase the Residency grant-in-aid to the Mahboob College from Rs. 6,000/- a year to Rs. 10,000/- a year, declaring that his main object in sanctioning this additional grant was to enable the management to enhance the salaries of the teaching staff. In this connection, he pointed out that there was no reason why the teacher should be expected to accept a lower remuneration than that warranted by his responsibilities and the nature of his work when no such sacrifice was demanded of the employees in other Departments. On the grounds of effici-

Notes and News.

The Imperial Educational Conference.

The Imperial Educational Conference will be held in London this year from 20th June to 8th July. This Conference is organised every four years by the Board of Education and is attended by delegates from all parts of the British Empire who are appointed by their respective Governments and are officially connected with the administration of education. The subjects for discussion this year have been divided into five groups. Group A deals with education in relation to the pupil's after career, with special reference to problems of post—primary and vocational education. Among the subjects included under this head are: the extent to which primary education should be carried, relation of cultural and vocational aims in elementary and secondary education, differentiation of curricula between the sexes, the extent to which manual training should form part of the curricula in schools and the place which the vocational middle school should occupy in the educational system. Group B is of special interest to India, as it is concerned with problems peculiar to tropical or sub—tropical countries where the population is of more than one race. The following are some of the important subjects included under this head:—(*a*) Vernaculars in education and as the media of instruction; (*b*) teaching of English *ab initio* in Primary Schools; (*c*) female education in Moslem and Non-Moslem areas; (*d*) adult education of a backward population; and (*e*) school buildings for tropical climates. Group C deals exclusively with rural education, while group D is devoted to new ideas and developments such as the use of broad-casting and the cinema in schools, intelligence tests, education of the sub-normal child, medical inspection and scouting. Finally, under

carefully all the particulars which they had observed. They did not lose sight of even the geographical features of the country through which we passed. Most of them indulged in a few reflections upon the things which they had observed, not remaining content with mere description. They also eagerly tried to collect some objects for the school museum, but all that they could find were a few crystals of quartz and an old coin in the bed of a stream at Aurangabad, an old coin which was not really very old at all. All possible aspects of the excursion had been kept in view. Soon after we returned to Hyderabad we organised a meeting of the boys of the school to discuss about our trip; and every one of the excursionists spoke of his experiences in terms of high appreciation. There is little doubt that we all gained immensely by the excursion.

The value of Preparatory Work done by the Teacher.

"Happy improvisations are in reality the fruits of very attentive previous study and of that absolute mastery of one subject from which the striking expression gushes out as from a spring. The spring always gathers its waters before pouring them forth, and it is this preparatory work, which constitutes the work of the lessons, and at the same time provides the necessary interest and charge."

PERE GIRARD.

deserted cave temples half in ruins, where the strains of worshipping devotees which once rang through the cave halls are now for ever silent, a fort in a semi-ruined state and guns which are anachronisms in an age of machine guns, mere lifeless images of a dead past; but at last we had here a place alive with a life of its own. This revived us partly and introduced us once more to the living world of men and things which we had partly forgotten wandering in tombs and hills and caves. We left Nanded that very night and reached our homes at Hyderabad early in the morning on New Year's day.

Thus ended our excursion; and whatever might have been the fears we had entertained at the time we started out, we could clearly feel at the end that it was a big success and that we had certainly spent our vacation and our money to very good purpose. We all returned to our homes reinvigorated in health and spirits; and the experiences we had gained were, without doubt, worth much more than the paltry sum of Rs. 12/- which each of us had spent. The excursion was not allowed to pass off as a mere pleasure trip, but a healthy atmosphere of discipline and study was maintained throughout. The boys were always asked to be together and not to break off into small parties as the number of boys was not large enough for that. All did their work willingly and gladly and, when on certain occasions some of the younger boys were perhaps a little lazy, the older boys took things in a brotherly spirit and did the whole work themselves, never once complaining. I had certainly understood my boys very intimately and I do believe they had come to know me better too. The boys had seen a lot with a critical eye. Every night, before they retired, they were made to gather round the lamp to talk about their day's observations and to write down their diaries. It was our nightly "Camp Fire". When I looked into these diaries later I found that they had noted down

our lodge as the sun was just setting. This brought our excursion almost to a close and it was a curious sight to see my boys at that time. They had done a great deal of walking in those three days and had gone through much worry in cooking their food and in doing everything for themselves; but till now they never once said that they felt tired; and never once lost their spirits. But now they began to say that they would rather starve than cook their food for the night, and they wanted conveyances to the Railway Station, a distance of a mile and a half—conveyances for those who had done nearly 30 miles of walking in two days! But I understood the situation at once. It was not that their energies were exhausted or that they were unreasonable. They had liked their excursion so much that when they saw that it was nearing its end their spirits sank and their energies flagged. So I yielded to all their demands with pleasure, for it certainly gave me a peculiar pleasure to see those indirect proofs of the success of the excursion.

We left Daulatabad early next morning and, as we were nearing Nanded station, it was settled that we should break our journey there. We did so and although we were very tired. we managed to do a good deal of sight-seeing at Nanded too. We went to the Osmanshahi Mills, but unluckily for us they were closed that day. We went round to one or two ginning presses; from there we went to the Godavery for a swim and, as the rays of the setting sun were falling on the golden dome of the Sikh Gurudwara, we entered that place. We saw round the place and listened to the beautiful 'Bhajan' of the Sikhs in their temple, and as we watched their worship which, of-course, struck our boys as very quaint, we did not feel sorry to have broken our journey there It was certainly an experience well worth going through and there was something peculiarly appropriate in such a close to our excursion. All this time we had seen only dead things, tombs of kings, queens and saints,

the meaning of a hole in the floor or a projection in a rock. Some ventured into dark rooms and pits with lighted candles, and they all felt as though they were exploring the place for the first time. Several of the boys pleaded for a day more at the caves, but exigencies of time and purse compelled us to leave the place the next day for Daulatabad. Some of the more enthusiastic spirits went out again the next morning for a farewell look at the cave temples and we all left Ellora, very reluctantly indeed, on the morning of 30th December.

On the way we visited some of the important tombs in Khuldabad, namely those of Tanesha, Alamgir, Nizam-ul-Mulk I, Malik Amber and several saints. The boys collected with great interest, the stories told by the men there, about the miracles worked by some of the dead saints. Some accepted them with feelings of awe and veneration, while others rejected them as mere fabrications of the attendants of the place to earn a few annas from simple pilgrims. After an hour spent in the tombs, we emerged from them and were on our road to Daulatabad, which we reached at about 2 p. m.

Here was a fair going on that day in the village. Hundreds of Hindu pilgrims were going up and down the fort. This interested the boys very much and, in spite of the fact that they had already walked 8 or 9 miles that day, they got ready to scale the fort with no thought of rest. We saw in the fort all that there was to be seen, the 'Gold Mahal' whose gold has gone somewhere, the 'Elephant Tank' with no elephants and no water in it, the ancient guns sleeping quietly on their ramparts, the 'Draw Bridge' for ever fixed down in the earth, and the Dark Passage which, I won't say, is no longer dark, but which has certainly lost now all the mystery and terrors of its darkness completely. Having spent a good two hours in the fort, we returned

up the next morning and looked out from the verandah of the bungalow we greatly enjoyed the view that met our eyes, a vast plain stretching away for 30 or 40 miles. Trains of bullock carts were seen coming over the winding road at the foot of the hill. Every now and then the toot of a motor lorry made itself heard, and by 8 or 9 o'clock in the morning the country below was alive with countless visitors to the caves. Our imagination was thrilled when we saw hundreds of visitors pouring in thus from all parts of the country to pay their tribute of admiring adoration to those works of art.

We hurried down the hill to see the caves. The steep descent from the Dak Bungalow to the foot of the hill was itself a very interesting thing, and when we went to the foot of the hill, the very first cave we were ushered into was 'Kailas' (No. 16) and as we went round that temple admiring its wonders and gazing at every object there with spellbound attention we felt as though we would never be able to do all the thirty caves in the few hours that we had before us. But we did them all the same. I will not attempt here any description of the cave temples, partly for limitations of space and chiefly for the feelings of utter humility and unworthiness that overcome me when I think of the task of describing those truly indescribable masterpieces of superb art. Oh, for the infinite patience and the inconceivable skill which had hewn down mountains as though they were no more than blocks of wood, and had given life and beauty to those lifeless and ugly rocks! As we walked from cave to cave admiring their beauty and wondering at the skill of those wizards who cut them into shape, none of us felt at the end that he had covered a distance of over four miles uphill and downhill and seen more than 30 caves in less than six hours. Our boys were immensely delighted with their experience. Each one of them took a great interest in the place and set about studying every thing keenly, trying to guess

We saw also the "Panchakki", the tomb of a muhammedan saint, the palace of Aurangzeb, the School of Arts and the Osmania College. We rambled through some of the streets of the city to get an idea of the place. Incidentally we witnessed the football, hockey, tennis and cricket tournaments which were going on at that place then, and after a stay of 48 hours there, which we had thoroughly enjoyed, we left Aurangabad for Daulatabad on the 28th December.

We reached Daulatabad at about 2 p. m., and putting our things in a bullock cart we began to walk to Khuldabad. The journey was very interesting and was very much enjoyed by us all. The road was throughout lined with 'bair' trees the fruits of which the boys enjoyed eating. Here and there we used to avoid a round-about path and scale a steep hill-side covered with loose stones and thorny bushes, not so much for shortening the distance as for the sport and fun of it. It always gave me great delight to watch the boys at such moments, for I could see that the open air and contact with nature were clearly working on them and thus one of my objects in taking them out was being fulfilled. Of course, I withdrew all manner of 'control' and 'authority' from them on such occasions, as indeed I did throughout the excursion, and freely shared in their merriment and myself joined in all their sport, for it did my own heart much good to forget all artificial restraints for a time and feel one with my boys. To the great credit of the boys be it said here that they never once abused the liberty I gave them. They behaved throughout in a praiseworthy manner I must consider myself very fortunate in this matter, indeed, for I have often heard of boys on excursions getting out of hand for some reason or other,

We reached Khuldabad at about dusk. The Dak Bungalow where we stayed is situated on the crest of a high hill at the foot of which are the caves. When we got

Kodak with us and we obtained the permission of the Director of Archaeological Department to photograph some of the caves at Ellora.

Thus equipped we left Hyderabad on the night of 25th December 1926 and arrived at Aurangabad at noon on the next day. Disappointment awaited us at the Railway Station, for we learnt there that the gentleman with whom we expected to stay was out of town. Nevertheless we found some kind friends there who accommodated us, and we soon found ourselves very comfortably lodged in a spacious hall of the Government High School. Two of our boys ran up to the city with the help of a boy scout and got for us bread, fruits and milk which served for our midday meal. Some of the boys began to whisper among themselves that their 'Rough Life' had already begun, for they did not get their 'Chapati', rice and curry. Indeed they were to see more of it for the next 24 hours, for we could not make any arrangement there to cook our food and we had to remain on mere bread and tea and fruits till the next noon. The sight of a hotel during the course of our ramble through the city proved too irresistible a temptation for our boys, who insisted on being allowed to board there for that day. It was one of the dirtiest of places I would ever have agreed to set foot in, but for the sake of my boys I had to go in, and as I saw them eagerly swallowing the dishes supplied by the hotel man I could not help wondering what a pass hunger brings a man to and blaming myself for my weakness in allowing them to eat in that place. Further I began to entertain grave fears at Aurangabad itself as to how I was going to see them through the whole excursion. But as will be seen at the end, they went through the whole thing quite like sportsmen, although they were rather unnerved in the beginning.

We had a very brisk round of sight-seeing at Aurangabad, not having wasted a minute of our stay there. Of course the most enjoyable sight of the place was the Roaza.

sympathetic interpretation on the rules and recognised our trip as one for educational purposes which, of course, all school excursions are. In case any school should happen to experience any kind of difficulty in this matter in future, our precedent will, I hope, help them.

A programme of the excursion was drawn up beforehand and announced to the boys. It was at first thought that we might take a cook with us, but the boys having volunteered to do the cooking themselves, the idea was gladly given up on grounds of economy and self-help. Strict instructions were given to the boys that they should be prepared for a rough time of it and they were asked to make their kits as light as possible, so that, if it should be necessary on any occasion, they might easily strap them on their backs and proceed. Indeed, on alighting from the train at Daulatabad, when the boys found that the bullock-cart men demanded an exorbitant hire, they got ready at once to walk up a distance of 9 miles from there to Khuldabad, carrying their things themselves and, when at last the terms were settled, it was with considerable difficulty that I could persuade them to give up their luggage to the cart-man. Each boy was to carry with him a 'Razai', a pillow, a woolen rug, one or two changes of dress (Khaki shorts and shirts were recommended), a plate and a mug, a piece of soap and a brush. Some of those who had water bottles and haversacks were asked to bring them. The boys had been specially told to provide themselves with warm dress as it was on the 25th December that we started and we were going to the crest of a high plateau. It was pathetic to see some of the boys who had neglected these instructions shivering with the biting cold of Khuldabad even upto 10 o'clock in the morning. One or two boys carried rather heavy handbags and beds with them, and but for the fact that the cart-man at Daulatabad eventually came to terms, they would have realised their folly at a considerable cost to their shoulders. We also carried a

a kind of graveyard of the ancient Mussalman saints and kings, fit to form the theme of a poem after the model of "On the Tombs in Westminster Abbey", and the last, a long line of rock-cut cave temples which have baffled the imagination and compelled the admiration of the world and have made ruined Ellora, after twelve long centuries, once more a place of pilgrimage, attracting thousands of art pilgrims, not merely from all corners of India and the East, but from distant Europe and more distant America.

The excursion being to a very distant place, it was open only to the boys of the High School section. The enthusiasm of the boys was very great in the beginning. Fifty of them held up their hands and expressed their willingness to go. But I knew that even if a dozen of them actually joined in the end, it would be something to feel glad about, and I made up my mind that I would undertake the excursion even with a dozen boys. When the time for starting arrived only eleven boys turned up, so that including myself the party numbered a dozen.

It must be remarked here that many of the guardians of boys in India—making all allowance for poverty—are not yet prepared to view educational excursions with the requisite foresight and imagination. They willingly spend Rs. 20 on a new suit of clothes or a new pair of shoes for their boys, who perhaps, possess already enough suits of clothes and enough pairs of shoes; but Rs. 10 for an educational excursion would seem a purposeless waste to them. The fact is that they can actually see with their eyes the suit of clothes and pair of shoes, while the return for the money spent upon an excursion is neither so immediate nor so concrete.

To return to the main topic. Same trouble was apprehended at first as regards concession rates for railway tickets, but the Traffic Manager was good enough to put a

A School Excurson

BY

G. S. PRAKASH RAO, M. A., L. T.,

Assistant, Dar-ul-Uloom High School.

The importance and value of educational excursions planned and conducted on right lines cannot be sufficiently estimated. Such excursions are not luxuries as some people may be inclined to think but are necessary supplements to the education which a boy receives at school. They tend to improve his physical health, develop his powers of observation, widen his mental outlook and, above all, bring him into touch with the realities of life.

I propose to describe, in what follows, my experiences of an excursion organised by me during the last winter vacation for the Dar-ul-Uloom High School; and I hope that in these experiences my fellow-teachers may find some hint or suggestion that may prove useful to them when they have an occasion to go out with their pupils on a similar excursion.

The place we chose for our trip was Ellora, because we know that several other places of historical interest are situated along the route from Hyderabad to Ellora. The Sikh Gurudwara of Nanded, the Roaza at Aurangabad, the fort of Daulatabad and the tombs of Khuldabad are all sights of no small interest and importance. It may also be pointed out that no two of these are alike in interest: one is a religious shrine, another is a tomb built on the pattern of the tomb of tombs, the world-famous Taj, a third is a fort which is mentioned in every history book on India, a fourth is a rare congregation of tombs of historic personages,

this is due to the fact that our Universities are not Residential Universities like the Cambridge, Oxford, Pennsylvania and Harvard Universities. But I believe that, even without the residential system, much can be done to develop the social side of our Universities. The London University is an instance in point. The absence of the residential system has not prevented the undergraduates of the London University from paying due attention to the social and athletic side of University life. University education does not mean merely attendance at lectures and study for examinations. It is during this period that a student should prepare himself for life. It is during this period also that he can make true and lasting friendships. The initiative for making University life in India more interesting and instructive must come from the students themselves. They should show more vigour, more animation, more life, or as the Americans say, more " pep " than they do at present, while the teachers should give them every encouragement and guidance in the social, athletic and intellectual activities organised by them.

The Teacher's Danger.

" The work of teaching does narrow the teacher's mind. That is its chief danger. We become empirics, gliding into grooves we run our course, never glancing to the right or left. No profession requires such a shaking up occasionally as we do. But we can take precautions. There is some branch in your work for which you have a taste Keep that corner up to the highest standard possible. Let it be but a corner, because you cannot specialise all round. This does not mean having a hobby. People who develop hobbies away from their professional work find them a hindrance to their advancement. Do not pick a hobby, but a " speciality " in your own line. Keep it up through current reading in this branch, be it history or a language, or music, etc. In one department be a teacher of mark ".

REV: J. T. McMAHON, M. A.

Diocesan Inspector of Schools,

Perth, Western Australia.

The central organization is known as the Students' Council, to which representatives of each of the four classes are chosen by popular election at the beginning of each year. These classes are divided according to the period of time put in by each student at the University. The duties of the Students' Council are not defined, but in practice they vary from the appointment of University Committees for the conduct of social functions and the like to the enforcement of Freshmen's rules and the presentation of requests to the Authorities for the change of some University regulation. Of course, in the last mentioned case this Council can do no more than to make a suggestion or recommendation. Since this Council has the backing of all the undergraduates, a suggestion made by it is at least sure of a careful hearing. I believe in many cases rules have been changed by the Authorities on the recommendation of the Students' Council. In some instances, the Council has proved itself of great service to the University Authorities, because of its influence upon the students. Formerly a good deal of cheating used to be carried on at the time of examinations and the Authorities were unable to put a stop to it. But the students themselves came to their rescue and adopted what is known in America as the "Honour System". Under this, a student's honour is trusted implicitly. The Superintendent gives away the question paper and walks out of the Examination Hall. If any student is found cheating, he is reported to the Students' Council by the examinees themselves. The culprit is brought before the Council, which sits as a Court of Justice and hears the case. If he is found guilty, he is either suspended or expelled from the University by the Authorities. Of course, it is admitted that this is by no means a perfect system, yet experience shows that it has proved very effcetive for character formation and discipline.

The kind of University life which I have endeavoured to depict above is wanting in India. It may be said that

best possible University team. In all American Universities professionals on very high salaries are employed to coach the students in various games, a practice which does not exist at Cambridge. Professional coaching develops a good athlete to his highest level, but it often neglects those who are on the average line or just below it. For every University student some kind of physical exercise is made compulsory and he is required to secure a certain number of marks, to which great importance is attached at the time of his degree examination. Interest is centred to an enormous extent in the important inter-university games. Every Saturday during the football season the students turn out *en masse* to cheer their team to victory and if a match is played away, often thousands of students travel several miles to go and watch it. It must be mentioned here that American football is quite different to either English Rugger or Soccer. It is an extremely dangerous game and in practically every match there are two or three serious accidents. This game is very amusingly illustrated in one of Harold Lloyd's Cinema films called "An Undergraduate". Cricket is not played in America at all and hockey is taken up only by ladies. The two most important events are the Inter-University Track (Athletic) Meet and Regatta, in which nearly thirty or forty Universities from all over the country participate. Great importance is given to the captaincy, or as it is known in America, the "managership", of a team, which is decided by competition. At Cambridge this office goes by seniority. Practically every University in America has a fully equipped gymnasium of its own with an expert staff and it is made full use of by the students. In the English Universities, at least at Cambridge and Oxford, no such arrangements exist.

Before concluding this article, I must mention another interesting feature of student-life in America, which struck me very much and which can be summed up in the word 'self-government'.

Gradually one begins to make acquaintance with fellow-freshmen, although, of course, for an Indian it takes longer to make friends than for Europeans. In America, traditions render a Freshman's life even more miserable than at Cambridge. They compel him to respect his seniors and bind him to certain other customs. For instance, a Freshman is not allowed to wear "Plus-Fours" and is expected to be ready to do odd jobs and to run errands at the commands of his seniors. At Cambridge he is expected to call on all the seniors as soon as he enters the College and cannot take the initiative in inviting them to his rooms. However good he may be at a game, he has to face many obstacles before he can get into his College XI or in the University side.

The Fraternity system, which is unknown in England, is an important feature of American University life. A group of students come together and start a society. They rent a house and draw up their own laws and regulations. Some Fraternities have a large membership and admission to them is not very strict, while others insist on some qualifications such as proficiency in games, etc. These Fraternities have peculiar names and customs. For instance, the Fraternity to which I belonged was known as the U. P. P. E. S. S. S. S. Before being admitted to it, I had to go through many formalities of a sensational nature, which I have sworn never to disclose.

Whatever the aptitude of a student may be, he gets plenty of opportunities to develop it in America. If he is fond of outdoor games, there is ample field for him to improve and make a name for himself. Should his inclination be literary, he can compete for a position on the staff of one of the many student-publications. Similar opportunities exist for those who are fond of music or acting or debating.

Athletics are conducted almost invariably with the primary object of producing from the available material the

Some Impression of Pennsylvania University Life

BY

S. M. HADI, B. A., (CANTAB.)

It is not possible to give a full description of University life in Pennsylvania in a short article of this kind; so I shall confine my remarks to its social side only.

My first impression was the bustling activity of the place. Every student leads a very busy life and the keynote of this activity, in my opinion, is organization. Some boys are seen selling tickets for a base-ball game, some peddling student publications, and a third group collecting subscriptions for the support of the football team that is to go on tour. One frequently sees posters proclaiming a coming Athletic Meet for which every one is expected to turn up. Thus there is organization everywhere, and all of it the product of student initiative and energy.

Undergraduates live in dormitories or in lodging houses. In the former two students have to share a suite of two small bedrooms and a study, but they have to go to a Cafeteri for their meals. At Cambridge, students are given two rooms in College, one of which serves as a study and the other as bed-room. All the members of a college must dine in the College hall, though lunches and breakfasts may be had either in the College or outside. Proctors and "Bulldogs", who are a familiar institution at Oxford and Cambridge, are unknown in an American University, for the existence of these is considered a restriction upon the freedom of a student.

Teachers' Associations. A large number of Teachers' Associations have been started recently in the various parts of the Dominions, the most important being the Hyderabad Teachers' Association and the Gulburga Teachers' Association. The rules of the Hyderabad Teachers' Association have been approved by Government and, according to these rules, membership is compulsory for all the teachers in the Hyderabad Division. The Association has 14 branches, each of which embraces 6 to 12 schools. Besides monthly meetings at which educational subjects are discussed and model lessons given, the Association holds an annual Conference and an Exhibition, and also conducts a quarterly magazine known as the *Hyderabad Teacher.*

There is need for a central organisation which, while maintaining the separate entity of the existing Associations, would co-ordinate their activities and be itself affiliated to the All India Federation of Teachers' Associations. Let us hope that it will not be long before such an organisation comes into being.

The Centre of Attention in Class Teaching.

"What is the centre of attention—the book, the teacher, or the class ? If the book is the centre, then the teacher is but a guide, a mere explainer of the text, its very slave. Such is the case in U S. A. If the teacher is the centre, then he is a lecturer. Primary teachers in Berlin are lecturers. The class does not get fair-play—it frequently maintains an absorbed exterior, but its mind is over the hills and far away. What actors those children can be ! The declaimer often accepts this dumb hypocrisy as a further tribute to his genius in making himself interesting. The class then is the centre, and ever remember that the class-time belongs to the whole class, not to the top or to the bottom. Do not waste time on individuals, and especially on that most assuming of all individuals who loves to hear his own voice, yourself, gentle teacher ".

REV: J. T. McMAHON, M. A.
Diocesan Inspector of Schools,
PERTH, WESTERN AUSTRALIA.

during the period of training, while those who work temporarily in their places receive allowances amounting to two-thirds, three-fifths and one-half of the salary, according as the post in question is one of a Middle-passed teacher, a matriculate or an F. A.

Teachers' Salaries. Thanks to the efforts of Nawab Masood Jung Bahadur (Mr. Ross Masood), Director of Public Instruction, the prospects of teachers in H. E. H. the Nizam's Dominions have been considerably improved since 1921. The following is the existing scale of salaries for teachers of non-gazetted rank:—

Trained Graduates	...	Rs. 150-5/2-200; selection grade, Rs. 205-5/1-250.
Untrained ,,	....	Rs. 110-4/2-150.
Trained F. A.'s	....	,, 110-5/4-135.
Untrained F. A.'s	....	,, 90-6/4-120.
Trained Marticulates	...	,, 55-2½/2-80.
Untrained ,,	....	,, 40-2½/2-65.
Trained Middle	....	,, 35-3 /2-65.
Untrained ,,	...	,, 30-2 /2-50.

(The above amounts are in Osmania Sicca, O. S. Rs. 116-10-8 are equal to B. G. Rs. 100).

It will be seen from the foregoing statement that the salaries paid to teachers in the Hyderabad state compare very favourably with those paid in other parts of India. The new scale of salaries has considerably increased the efficiency of the Department, as it has made it possible for us to engage in our schools young men of good social standing who, in addition to being well-qualified for giving a sound literary education, can be relied upon to exercise a healthy influence on the character of their pupils.

The grades for the Inspecting officers and Head-Masters of High Schools vary from Rs. 200-10/1-400 to Rs. 500-50/1-1000, according to qualifications and seniority.

only about a dozen technical schools in the Dominions. The best equipped of these is the Osmania Technical Institute, Hyderabad. The other schools are either Aided or under the Local Fund agency. While the facilities for technical education are admittedly inadequate, the clamour for degrees and Government service is so strong in these Dominions that even such facilities as do exist are not fully availed of by the students. However, now that the increase in the number of graduates and undergraduates is rendering the chances of employment in the various departments of Government more and more remote, parents are gradually awakening to the need for giving their sons some kind of vocational education. In the meanwhile, Government have appointed a committee, which is now busy working out a scheme for the further development of Technical Education in these Dominions.

Teachers' Training.—There are 6 institutions in the Dominions where teachers are trained. The most important of these is the Osmania Training College, Hyderabad, where Middle-passed teachers of Primary schools and matriculates and F. A.'s of Secondary schools receive training for a period of one year. For the training of graduates we have at present to depend on the Aligarh and Dacca Universities, and, since these universities admit only a limited number of teachers from the Hyderabad state every year, it is now proposed to add a class for graduates in the Osmania Training College. The other Training institutions are as follows :—

1. The Mahratti Normal School, Aurangabad for male teachers.
2. ,, ,, ,, ,, , ,, ,, female ,,
3. ,, Telugu ,, ,, , Warangal ,, male teachers.
4. ,, ,, ,, ,, , ,, ,, female ,, .
5. ,, Urdu ,, ,, , Hyderabad ,, ,, ,, .

With a view to encouraging training, teachers of Government schools are allowed to draw their full salaries

new regulations might restrict private enterprise in the field of education. Any one who reads the circular dispassionately will be convinced that it is intended to encourage, rather than discourage, all ***bona fide*** private efforts which are directed purely towards education.

Physical Education. The Education Department in Hyderabad attaches special importance to physical education, and during the last ten years it has done much for its development. There is a Chief Inspector of Physical Education who selects suitable drill-masters for the various Government schools, arranges for their training and inspects their work from time to time. We have not been able to make games compulsory yet, but we hope to be able to do so as soon as we are in a position to provide suitable playgrounds for all the schools. In schools which do not possess sufficiently big play-grounds for the usual out-door games, such American games as basket ball and volley ball have been introduced, but experience has shown that the boys do not take the same interest in these games as they do in hockey, football and cricket. An attempt is also being made to popularise Indian games in the Primary schools.

The Chief Inspector of Physical education is also the Director of Boy Scouts. Nearly all the Secondary schools in Hyderabad and some of the important High schools in the districts possess efficient and fairly considerable Boy Scout troops.

Adult-Education. Though the movement is still in its infancy in the Nizam's Dominions, the start has been very promising. Within the course of a year, nearly half-a-dozen night schools have sprung up in the city of Hyderabad and are doing good work.

Vocational Education. Vocational education has not received in the Hyderabad state that measure of popularity and pubic support which it rightly deserves. There are

state than in British India. Nor are the Aided schools, as a rule, as efficient as the Government schools. They depend for their existence chiefly on the grants-in-aid awarded to them by Government and receive very little financial support from the public. The grant-in-aid given to each school is equivalent to either half the annual expenditure incurred by that school or the difference between its annual income and expenditure.

Private Schools. Side by side with Government schools, private schools exist in all parts of the Dominions. Until quite recently, the Education Department exercised no control of any kind over private schools and could not even obtain correct statistics concerning them. But this policy of *laissez faire* led to a very unsatisfactory state of affairs, as could only be expected. In the vast majority of cases, these private institutions were conducted in ill-ventilated and unsuitable houses and were staffed by men who were not at all fit for the teaching profession. In view of the harm which was being done to the mental and physical development of the children attendding these schools and which called for immediate attention, Government had to issue a circular requiring that all the existing private schools should be registered, and that in future permission for opening new schools should be obtained from the Education Department. Strangely enough, this circular was at one time greatly misunderstood both inside and outside the Dominions. Its only object is to help the private schools to work on sound educational lines. They are still free to follow their own curricula of studies, provided that they do not impart such instruction as is likely to create ill-feeling either towards Government or between one community and another. The Inspecting officers have been given strict instructions to do all they can to help the private schools. Consequently, there is no justification or foundation for the fear, which has been expressed in certain ill-advised quarters, that the

schools where English is taught, it is not begun till a pupil reaches Standard III. The Primary course extends to a period of five years—Infant class to Standard IV.

Primary education is free throughout the Dominions. The total number of Primary Schools is 3,855, while their strength is 2,01,603. The vast majority of the villages in the Diwani, *i.e.*, lands directly administered by Government—are provided with schools. But the expansion of Primary education has been greatly hampered in recent years owing to the general financial stringency. An attempt is being made now to induce the Local Fund authorities to increase their expenditure on Primary education. The question of introducing compulsory Primary education within the municipal limits of Hyderabad is also under consideration. As a preliminary step, the Department took a census in May, 1926, which showed that out of 20,005 boys between 6 and 12 years of age residing within the said area, 8,584, *i. e.* 42·9 per cent were actually under instruction, 7,401 in public and 1,183 in private schools.

Female Education. Female Education in the Hyderabad state is not so advanced as in some other parts of India, the proportion of girls under instruction being only about 5% of the female population of school-going age. The chief obstacle in the way of the education of girls is the lack of qualified and suitable female teachers. Educated women of respectable families do not come forward to take up the profession of teaching. There are altogether about 700 girls' schools in the state with pupils numbering nearly 35,000. The town of Hyderabad possesses three very efficient High schools, in one of which the Intermediate classes of the Osmania University have been started and have already proved successful.

Aided Schools. The proportion of Aided schools to the total number of schools is smaller in the Hyderabad

Examination it is 3 years, according to the rules of Madras University. At the First Annual Conference of the Hyderabad Teachers' Association a resolution was moved for increasing the length of the former course by one year, but it was defeated by a very narrow majority. There are, at present, 17 Osmania High schools with nearly 7,000 scholars and 19 English High schools with about the same number of pupils *viz* 7,000.

The total number of Middle schools in the the Dominions is 113, while their strength, including pupils in the Primary sections of these schools, is nearly 26,000. Students generally spend 3 years in the Middle stage after leaving the Primary section. The Middle schools prepare students for the Government Middle School Examination, in which candidates have the option to answer the question-papers in the non-language subjects either in English or in Urdu. The medium of instruction in the vast majority of the Middle schools, however, is Urdu with, of course, English as a subject of study throughout the course.

Primary education is in this State imparted strictly in the mother-tongue of the pupils. But we do not maintain different schools for different vernaculars. A separation of Primary schools on the basis of the vernaculars may be sound in theory, but, in practice, it has been found that, by keeping the boys of the different communities aloof, it tends to foster in their minds a certain sense of exclusiveness, if not a strong sectarian feeling. Therefore, in every school which is attended by boys speaking different languages such as Urdu and Telugu in Telingana or Mahrathi and Kanarese in the Karnatic, we have instituted parallel classes in the vernaculars concerned. Hindu boys generally take up Urdu as their second language, while Mohamaden boys are encouraged to study either Telugu, Mahratti or Kanarese, according as they live in the Telingana, Mahratwadi or Karnatic. In

difficulties were experienced in teaching the modern sciences through the medium of Urdu; but these difficulties have now been largely overcome as a result of the excellent work done by the University Translation Bureau. The inauguration of the Osmania University marks a new era in the history of education in Hyderabad. The use of Urdu as the medium of instruction has greatly facilitated the process of thought and expression; for, while the Osmania University aims at maintaining practically as high a standard of English as the other Indian Universities, there can be no denying the fact that the students of this University have an advantage over the students of the other Indian Universities in the matter of the assimilation of knowledge and the thoroughness of their grasp of the different subjects.

There are, at present, one first grade and three second grade Arts colleges affiliated to the Osmania University.

For the benefit of the students whose knowledge of Urdu is limited, or who for other reasons prefer to read through the medium of English, H. E. H. the Nizam's Government have continued, with undiminished efficiency, to maintain the Nizam College, which is affiliated to the Madras University.

The total annual expenditure on University education is about 8 lakhs. There are at present about 900 students reading in the various colleges affiliated to the Osmania University, and nearly 300 students in the Nizam College.

Corresponding to the two types of colleges mentioned above, we have two types of High schools—English High schools, where the medium of instruction is English, and the Osmania High schools, where the medium of instruction is Urdu. The period of study for the Osmania Matriculation Examination is 2 years after the completion of the Middle School course, but for the High School Leaving Certificate

Education in the Hyderabad State

BY

S. ALI AKBAR. B. A., (CANTAB).

Divisional Inspector of Schools, Hyderabad-Deccan,

(Being a lecture delivered at the All-India Teachers' Conference held at Patna in December, 1926).

Hyderabad is the premier native state in India with an area of nearly 83,000 square miles and a population of 1,24,71,700. Thanks to the enlightend policy of the present ruler, H. E. H. Nawab Mir Osman Ali Khan Bahadur, and the keen interest which he has always shown in education, Hyderabad has made rapid strides in education in recent years. During the last decade, the number of public institutions has increased from 1,100 to about 4, 050, the number of pupils from 83, 000 to over 2½ lakhs and the expenditure from Rs. 20¼ lakhs to over 70 lakhs. There are, besides, over 4,000 private schools with nearly 80,000 pupils. The proportion of boys under instruction to the school-going population works out at 17·1 per cent.

One of the chief causes of the appreciable increase in the expenditure on education is the establishment of the Osmania University, which came into existence in 1919. The characteristic feature of this university is that it employs a vernacular as the medium of instruction, this vernacular being Urdu, which is not only the official, but the most widely understood, language in the state. At the same time, throughout the Faculties of Arts, Science and Theolgy, English is taught as a compulsory language. At first, many

(*b*) Time-table.

The time-table should be properly framed. Periods should not be too long, especially for small children, otherwise they will feel fatigued and will lose interest in their lesson. Periods of hard and light work should, as far as possible, alternate. Frequent short intervals are generally better than one long recess.

(*c*) Monitorial system.

Obedience, self-restraint and self-government are the points to be aimed at in educating the children. The monitorial system is one of the effective means for achieving this end. A well-behaved boy should be selected as the monitor of the class. Tasks involving a certain amount of responsibility such as marking attendance and collecting exercise books etc. may be entrusted to him. Monitors should be changed every month, so that all deserving boys may have a chance. The teacher should also select a Captain for leading the boys in a line to the drill ground for drill or to the play-ground for sports. Monitors and captains should have badges of honour, so that thay may learn to take pride in their work and be a source of emulation to their fellow-students.

The Ideal Principal.

"A Principal, in whom one is sure of finding neither prejudice nor caprice nor unevenness of temper nor hasty judgment, who does not give way to the impression of the moment, who does not swamp herself in details, who keeps her mind far above the inevitable worry and friction of every day life, who judges each one by general conduct and not by accidental incidents, who moreover shows herself capable of wisely regulating the progress of the work, such a directress we can be sure will not lack for authority."

FELIX PECAUT.

(ii) *Instruction.*

There should be no monotony in instruction. Boys like variety and change. The teacher should only be a guide. He should try to educe everything from the boys, and should avoid, as far as possible, doing everything for them. He should simply give hints to remove their difficulties. The class should be kept occupied, and this is possible only if the lesson is made interesting by means of examples, anecdotes and illustrations.

Efficiency in instruction depends on :—(1) the right beginning, (2) orderly advance and (3) opportunities for self-expression and self-activity given to boys. In order to accomplish this, the teacher should be well-informed and up-to-date. He should bear in mind that the boys are to drink from a running stream and not from a stagnant pool. Teachers should also endeavour to secure the co-operation of parents and guardians, as such co-operation is often very helpful in their work.

(iii) *Organisation.*

(*a*) Hygienic conditions.

The class-rooms should be provided with sufficient light and ventilation. They should be big enough to allow the boys to move about freely, and they should be so situated as not to cause any disturbance in work. For writing and drawing purposes suitable desks should be provided, so that the boys may do their work without any injury to their health. The black-board should be placed in such a position that all the boys may be able to see it without straining their eyes, while the teacher should be so seated that boys on the last bench may conveniently see and hear him. The deaf and the short-sighted, if any, should be accommodated on the front seats

Class Management

BY

D. C. BHOGLE, B. A., B. T.,

Assistant, Normal School, Aurangabad.

Class-management may be treated under three broad heads:—

(i) Discipline.

(ii) Instruction.

(iii) Organisation

(i) *Discipline.*

Discipline in the class chiefly depends on the teacher's personality. This does not mean that the teacher should possess attractive features or strong physique. It is his character and ability that count. A teacher should possess all those qualities which he desires his pupils to acquire. His attitude towards them should always be pleasing, friendly and sympathetic. There should be a tie of affection between the teacher and the taught so that the latter might not hesitate in approaching him with their difficulties and doubts. If the teacher is one of the right type, there would be no occasion for the infliction of corporal punishment. Eye-control would be quite enough to ensure good behaviour on the part of the boys in the class. When any necessity for punishment should arise, the punishment given should be immediate, fair and judicious, so that the boy might remember it and be careful about his conduct in future.

Discipline does not mean that children should observe strict silence and sit like statues. They should be allowed some scope for free movement and free talk, otherwise their spirits would be crushed.

They have also been able to take impressions of about 130 inscriptions. Most of these refer to the Chalukyas or the Kakatiyas, while a few deal with the Vizianagar kings.

One of these dated Saka 1319 refers to the conquest of Panagal fort by Harihara 11. Another is an interesting inscription at Vaddamani, dated Saka 1167, giving the genealogy of the Kakatiyas and stating their Sudra origin. One is dated Saka 1092 and mentions the kakatiya king Prola. Several inscriptions deal with the prowess of the Recherla generals. (vide the Palampet inscriptions)

One of the Chalukyan inscriptions seems to refer to a new line of kings as follows:—

Attempts are being made to get the correct reading of all the inscriptions collected so far, and it is expected to lead to more facts on the medieval history of the Deccan.

Museum.

A well-equipped museum is necessary as an adjunct to the Archaeological Department. That is the means of arousing the intesest of the public in the antiquities of the country. It was decided to start the museum simultaneously with the establishment of the Archaeological Department but owing to the outbreak of the war, the idea was not immediately taken up. The Department, however, devoted much attention to the collection of several antiquities as exhibits. The valuable brass collection of Sir Stuart Fraser was purchased, 37 specimens of Amaravati sculpture, several specimens of Gandhara sculpture, a plaster cast of Hippocrates, whose bronze statue was discovered at Taxila, and several other specimens of antiquities were acquired and are at present located at the Mahbubia Town Hall. Steps are being taken to open the museum to the public and there is no doubt that it will be a source of real education to the people of the State.

The Andra Historical Research Society.

For some time past, some of the Telugu speaking people of Hyderabad have been taking interest in the collection of old manuscripts and copies of inscriptions in the out-of-the-way places of the Telugu speaking districts in the Dominions. The idea originated with those who have visited the Bhandarkar institute at Bombay. As the result of their efforts 207 manuscripts have been collected. Most of them are unpublished. They deal mostly with Telugu literature, but some deal with subjects as diverse in scope as veterinary science and astrology. Some of them are "Kaifiyats" or chronicles which deal with contemporary events. It is intended to publish detailed catalogues of these manuscripts in due course.

The third is dated 1213 A. D. and refers to the military exploits of Recherla Rudra, a general of Ganapatideva. The fourth is dated 1236 A. D. and refers to a battle at Bokhara and to a Brahmin general named Rajenayaka, a general of Recherla Rudra.

Mention is made in the reports of the discovery of a number of Chalukyan inscriptions at Kollipak, 45 miles N. E. of Hyderabad, and also at Nagai, near Wadi. The antiquities of these two places are described in the Journal of the Society. The inscriptions are in course of publication by the experts of the Govt. of India. Rajkonda, 35 miles south-east of Hyderabad, has 7 unpublished inscriptions in Telugu.

In the field of Moslem inscriptions very important work has been done by the publication of several inscriptions of the Deccan Sultans. The Director has also been editing the SHAH JAHAN NAMAH in the Bibliotheca India.

Numismatics.

The total number of coins in the Hyderabad Museum, to the end of March 1922 was 5, 284. Between 1922 and 1924, 16,587 more have been added. These coins cover the entire period of Indian History. 367 punch-marked Andhra coins belonging to the 2nd century B. C. were found in the Karimnagar district. 20 Chalukyan Padmatankas of the 11th and 12th centuries were obtained from Gulbarga and Bir. 109 Padmatankas of the latter Yadava kings of Deogiri consist of the coins of Singhana 1209—1247, Krishna 1247-1260 and Mahadeva 1260—1271. There are several coins of the Vizianagar kings, of Pratapa Harihara Krishna Deva Raya, Achyutta Raya, and Sadasiva Raya.

The collection contains coins of the Indo-greeks, Indo-parthians, Kushans, Sassanians and the Delhi sultans and the Mogul Emperors. Some of these are very rare and some lead to the discovery of new mints in the Deccan.

blanoe to the marks found on the Adaichanallur pottery in the Madras museum. The civilisation of the people that buried their dead in these graves takes us back to the pre-vedic times.

Epigraphy.

Very important work has been done in this branch by the publication of monographs, sometimes with the assistance of the experts of the Government of India. The most important of these is the Asokan edict found on a rock boulder at Maski near Raichur. Asoka's edicts were known only by his titles, "Devanam Piya" and "Piya Dasi". This edict mentions him by name. It is also an evidence of the fact that his empire extended as far as the Deccan.

Three inscriptions refer to the Western Chalukyas. One is the earliest record of Jagadekamalla and is dated 1017 A. D. The second refers to the king Trailokyamalla Ahavamalla Someswara 1. 1056 A. D. and makes mention of Bodhan as the capital of the Rashtrakuta Emperor Indra 111. 915-917 A. D. The third refers to Tribhuvanamalla Vikramaditya the sixth and is dated 1088 A. D.

Four inscriptions refer to the Kakatiya kings. One of them refers to Queen Rudramamba as the daughter of King Ganapathi and describes a line of feudal princes belonging to the Viryala family. It is dated 1273 A. D. One inscription has no date but gives the following genealogy :—
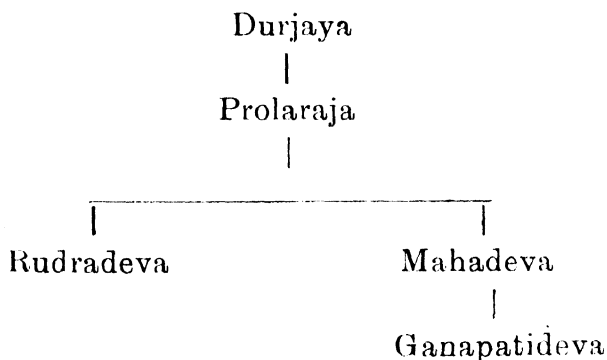
the seat of the Hindu Kingdom of the Kakatiyas, from the 12th to the 14th centuries. It contains a fort and several temples. One of these—the thousand pillared temple—is of considerable artistic merit. It contains a beautifully polished Linga and a Nandi (Bull), which is described by Mr. Yazdani, as a splendid specimen of a monolith. The temple was in a bad state 14 years ago, but the Department has spent Rs. 11,687 towards its repairs.

Among other monuments that were preserved and repaired by the Department, mention should be made of the temples at Palampet and Uparapalle which are described by Mr. Yazdani, as the brightest stars in the galaxy of medieval Deccan temples. The monuments at Bidar, Gulbarga and Hyderabad also received special attention.

Excavation.

Conservation is the primary necessity of all Archaeological work. Next comes Excavation. There are sites of ancient cities, like Tagara, Paithan, and Malkhed worthy of excavation. The Department has selected Paithan as the first centre, for the purpose of exploration. Special mention should, however, be made of the interest evinced by Dr. Hunt and Mr. Munn in the pre-historic antiquities of the State. Mr. Wakefield, Director of Commerce and Industries in 1917—18, has also taken interest in this subject. These pre-historic graves are technically known as cairns and cromlechs. They lie scattered all over the Dominions. Dr. Hunt discovered them in the neighbourhood of the city of Hyderabad, Mr. Munn near Raigir and Mr. Wakefield near Janampet in the Poloncha Taluq. Legend attributed these graves to Rakshasas of huge dimensions, but it is interesting to read Dr. Hunt's paper in the journal of the society 1916, where he points out that the cairn builders were small men, who buried their dead in magnificent tombs. The marks on the pottery found therein bear close resem-

Conservation.

This was the most important work done during the period. The preservation of the frescoes at Ajanta was rightly regarded as the first claim on the Department. The frescoes have been admired by all critics of art. Until the period of the Italian Rennaissance, there were none comparable with them in any part of the world. The attention of the Department was first devoted to making the caves structurally sound. This was done by repairs to the broken pillars and decayed walls in keeping with the adjoining colour features. Improvement of drainage to prevent percolation of water in many of the caves was undertaken, and the silt filling up the caves removed. These were done at a cost of about Rs. 50,000. In 1920, two Itallian specialists arrived at Ajanta and have made the necessary improvements to preserve the paintings from decay, at a cost of about Rs. 64,000. As it is, however, impossible to prevent the gradual deterioration in the course of a century or more, attempts are being made to preserve a permanent record of these priceless treasures of Asiatic art by the process of three-colour photography, which is expected to involve an expenditure of about £ 40,000. The study of the paintings from an iconographic point of view has been entrusted to the French savant Mons: Foucher, whose preliminary report has been published. For the convenience of visitors roads were made and bungalows were constructed at a cost of about Rs. 160,000.

Next in importance to Ajanta comes Ellora. If Ajanta represents Buddhism, Ellora represents the reaction of Brahminism on Buddhism. The Director suggests the desirability of a monograph on the Iconography of the Ellora caves.

Next to Ajanta and Ellora, the remains at Warangal received the attention of the Department. Warangal was

Hindu kingdoms of the Andhras, the Chalukyas, the Rashtrakutas, the Yadavas, the Kakatiyas and their successors. The history of these kingdoms is not yet fully known. The Dominions afford ample material to throw light on the state of civilisation in the Deccan during those periods of History.

Research before 1914.

There was no properly constituted Department for the preservation of the antiquities of the state before 1914. They were under the nominal jurisdiction of the Bombay Archaeological Surveyor, and the names of Fergusson, Burgess, Griffith and Lady Herringham, among others, should be remembered, as the pioneers of Deccan Archaeology. Mention must also be made of Nawab Syed Hussain Bilgrami's book "Historical and descriptive sketch of H. E. H. the Nizam's Dominions", "The Aurangabad Gazetteer" and Mr. Cousens' "List of antiquities" and "Bijapur Architecture". Mr. Cousens was the recipient of the Pinhey memorial medal for the last mentioned book.

Creation of the Archaeological Department.

In the year 1914 H. E. H. the Nizam was graciously pleased to create the Archaelogical Department, with Mr. Yazdani, as the Director. The work of the Department from 1914 to 1924 is available to the public in the shape of 8 Annual Reports, 7 monographs on Epigraphy, 5 issues of the journal of the Archaeological Society, two guides to Ajanta and Ellora, a book on the antiquities of Bidar, a preliminary report on the Ajanta caves (French) by Mons. Foucher, an English translation of which is published in the journal of 1919—20, and several drawings, maps and photographs. The Department has confined its attention primarily to Conservation, but has also done good work in Excavation, Epigraphy, Numismatics, and the formation of a museum.

Historical Research in H. E. H. the Nizam's Dominions

BY

S. HANAMANTH RAO, M. A., L. T.,

Professor of History, Nizam College.

We have much pleasure in publishing this article, and we trust that it will be read with interest. The next issue will contain an article on the work done in connection with the Mohamaden monuments.

Editor.

It is my conviction that those who undertake to teach Indian History must take a continued interest in the work done by the Archaeological Department. History can be made interesting to the student only by pointing out to him how intimately it touches his daily life. The teacher can, if he likes, utilise the resources made available to him by the efforts of the Archaeological Department. By doing so he can make the subject something more than a mere narration of the names of kings, battles, murders and assassinations. It is often stated that pupils and teachers in the Deccan know more about Asoka and Harsha than about Pulakesi and Indra, more about Pataliputra and Kanouj than about Ajanta and Ellora, and more about the Kutb-minar than about the tombs of Golconda. Let us make an attempt to get rid of this reproach.

H. E. H. the Nizam's Dominions may be described as a store-house of materials of antiquarian interest. These Dominions are almost identical with the ancient political divisions of the Deccan, which was the seat of the ancient

of Bombay in matters relating to elementary education, and expressed the hope that they would see their way to fulfilling their financial obligations to the Corporation for the furtherence of Primary education in the City of Bombay.

Lectures were also delivered on the 'Use of the Blackboard', 'Education in the Land of Five Rivers' and 'the Dalton Plan'. Mr. Mathur, Head-Master of Janki Prasad A. S. High School, Khurja, who read a paper on the 'Dalton Plan', showed in details how this system was worked in his school and claimed that it had greatly improved the efficiency and usefulness of the institution. He said that though at first the boys rejoiced in their freedom to plan their own time-tables and did not make good use of their time, yet responsibility had been gradually sobering them and they were learning to do their daily work sincerely according to a certain plan, instead of leaving all work to be done during the last one month or two just before the annual examination. At the same time, the teachers were discovering for themselves, under the pressure of having to supervise individual work, time and energy saving ways and were learning to make judicious assignments. They were also realising that their relations with their pupils were getting more natural and pleasant on account of increased opportunities of personal contact.

Along with the Conference, an Educational Exhibition had been organised at the Behar National College, Patna, and it was opened on the 28th December by Sir Mohamed Fakhruddin, Minister of Education, Behar and Orissa. The Exhibition was held on quite a small scale. The exhibits consisted largely of the ordinary maps, drawings, charts and clay and wooden models made by the boys of a few schools in Upper India. However, a beginning has been made, and it is to be hoped that in future the Exhibition will be, like the Conference, an All-India affair.

Sir George Anderson, Director of Public Instruction, Panjab, and expressed the opinion that if the present rate of progress continued, illiteracy would completely vanish from the Panjab within 10 years. In Behar and Orissa and the United Provinces the percentage of literacy continued to be low, but attempts were being made to raise it. He expressed gratification at the appointment a member of the teaching profession, Professor Jadunath Sirkar, as Vice-Chancellor of the Calcutta University. With reference to the Madras Presidency, the speaker said that the new Andhra University had not yet decided on making Telugu the medium of instruction. The Government of Baroda was also considering the question of adopting Gujrati as the vehicle of instruction in the proposed Baroda University. He expressed the opinion that wherever it was proposed to take steps along these lines, the authorities should proceed gradually and cautiously. The vernacular concerned, he went on to say, should not be adopted as the medium of instruction in any subject until a sufficient number of books had been translated into it. In this connection, Professor Seshadri commended the work done by the Osmania Translation Bureau. He also paid a tribute to H. E. H. the Nizam's Government for their generous policy towards the Education and Archaeological Departments. Speaking about the Osmania University, he remarked that he did not know how far the claim that the experiment was a great success was justified. As an examiner, he had gathered that the standard of English was much lower than that of the other Universities. On the other hand, he had heard examiners in Law and History declare that the students of the Osmania University showed a better grasp of both these subjects than the Law and History students of the other Universities. With regard to the Bombay Presidency, the speaker regretted that no action had been taken on the report dealing with the reform of the Bombay University. He also deplored the lack of interest on the part of the Government

(5) "That the teachers of three years' standing should be allowed to appear privately at training exminations".

Resolutions were also passed emphasising the necessity for giving all encouragement to Boy Scouting; urging the Government to abolish the inequality of pay, prospects and conditions of service in Government and non-Government schools and to insist on a definite written contract of service between teachers and management of schools as a necessary condition of recognition of schools; suggesting to the Provincial Teachers' Associations to hold inquiries into the economic condition of teachers in their respective provinces; and recommending the starting of study circles in all schools for the benefit of teachers.

Sir Mohamed Fakhruddin, Minister of Education, Behar & Orissa, was present at the first sitting of the Conference, and in a brief and felicitous speech, he said that the resolutions passed by the Conference would receive his most careful attention, especially as they embodied the united advice of teachers from all parts of India.

The second day of the Conference was devoted to lectures. In the absence of Professor Wadia, who had left Patna on the previous night owing to an important engagement elsewhere, the chair was taken by Professor Seshadry of the Benares University, President of the All-India Federation of Teachers' Associations. Professor Seshadry delivered a very interesting and illuminating address on Education in India in 1926. He said that, as in the previous years, the Panjab showed the best record of work. Adulte ducation and female education were advancing by leaps and bounds in that province. Another matter in which the example of the Punjab should be followed by the other provinces was the special encouragement in the shape of increased grants-in-aid given to schools in backward areas. Professor Seshadry paid a tribute of praise to

In moving this resolution, Mr. D. P. Khattry, B.A., L.T., Head-Master, Pirthi Nath High School, Cawnpore, said that the dignity of the teachers would be considerably enhanced if they could be legally registered. Teachers of all types had many interests in common and, like the teachers in England, they should organise themselves so as to have the power and acknowledged right to express their opinion on all matters affecting their professional work. They should therefore have under their control a Register of those qualified to practise their calling. Mr Khattry admitted that the lack of trained teachers in India was an obstacle in the way of such an organisation, but he thought that this difficulty could be over-come by considering experience as sufficient training.

(3). "This Conference approves the rules for the constitution of managing committees of Secondary schools passed by the Calcutta University and recommends the same for adoption in other parts of India also."

Rai Saheb Harida Goswami (Bengal), who moved this resolution, said that very often friction arose between the teachers and managing committees, in which the former were invariably worsted. On the representation of the Bengal Teachers' Association, the Calcutta University had made what were known as 'school codes', according to which each private school was to have a managing committee consisting of members elected by teachers, guardians of students and other gentlemen. This method should be followed everywhere, as it considerably strengthened the position of teachers in the Aided schools and prevented the managing committees from dealing with them unfairly.

(4) "That the members of the teaching profession should have representatives on the Central and Local Legislatures".

end, it was absolutely necessary that proper men with proper training should be appointed as teachers.

In the end, Professor Wadia made the following suggestions for placing the education of the country on a sound footing :—

(1.) Students should be trained and educated according to their ability and aptitude.

(2.) There should be provision in every school for manual training, which might crush the aristocratic feeling on the one hand, and infuse a sense of dignity of labour on the other.

(3.) The general tendency in Indian boys to be bookish should be fought against and attempts should be made for the simultaneous development of their body and mind.

(4.) Instruction in Hygiene should be imparted to all students, while students of an advanced age should be given education in sexual matters.

Among the important resolutions that were passed at the Conference were the following :—

(1.) "This Conference is of opinion that active steps should be taken to work out an extensive programme of adult education in the country."

The writer of this article had the privilege of moving this resolution. In a short speech he dealt with the advantages of adult education, while Mr. S. Banerjee of Maller Kotla, Panjab, who seconded the resolution, explained the working of the system in the Panjab.

(2.) "This Conference approves of the principles of the Teachers' Registration Council, England, and appeals to the various Provincial and State Governments to take early steps for the establishment of similar Councils in this country."

present system of education was that it did not take into account the characteristic features of Indian mind and Indian life. The result was that, on the one hand, the educated Indians were widely separated from the masses and, on the other, they found it difficult to reconcile the new liberalism with the conservatism of the past from which they could not free themselves. He then drew attention to the lack of personal relationship between the teacher and the taught in India. Referring to the problem of unemployment among graduates, he said that vocational and industrial training was required for its solution. But at the same time, he emphasised the fact that the aim of University education was to give young men culture rather than the means of livelihood. He regretted, as everybody must, that all sorts of students entered the universities and explained how necessary it was that only those students should go in for higher education who had a taste for it.

Continuing, Professor Wadia said that in trying to remove the defects of the existing system of education, one was confronted with three main problems. The first was the economic position of the teacher. Teachers were suffering from considerable economic difficulties. It was not enough to provide for their domestic requirements. They should also have the means for purchasing books, without which they could not be up-to-date in the sphere of knowledge and could not qualify themselves fully for their profession. The second problem was how to secure the right type of men for the teaching profession. People generally took it up after finding all other doors closed for them. Such men lacked the necessary enthusiasm for their work. Care should, therefore, be taken to appoint only those who really desired to be teachers. The third problem was the training of teachers. Untrained teachers did not generally know what exactly was expected of them. If examinations were to be regarded not as an end, but as a means to an

can neither be rational nor national. As for the sense of unity which the English language has produced, this can still be maintained by continuing the study of that language as a compulsory subject. If Urdu or Hindi cannot be the common language of India, let English be our common language; but that is no reason why English should be continued as the medium of instruction.

Professor Wadia made national unity the basis of his objections to religious instruction also. He said that the greatest need in India was that one should feel more as an Indian than as one belonging to this or that particular religion. Instruction in the dogmas of different religions would be a serious impediment in the attainment of this ideal. Besides, religion was too delicate a matter to be handled in schools. Therefore, it would be desirable to leave religion to be taught to the child by his mother. One must admit that religious instruction in Indian schools raises questions which are vital both from the national and spiritual points of view. But it is extremely doubtful whether the mother can teach religion better at home than the teacher can at school, especially in India where female education is so backward. If religious instruction is entrusted to the right type of teachers in all the schools—teachers who are entirely free from religious and communal bias and who, while imparting instruction to boys in their own religion, will at the same time teach them to respect other religions—there is no reason why it should be a source of disturbance to national unity. It is interesting to observe that Professor Wadia's views on religious instruction were not endorsed by the Conference, which passed a resolution to the effect that provision for such instruction should exist in all schools and colleges.

Professor Wadia also dealt with the defects in the present system of education and offered valuable suggestions for removing them. He said that the inherent defect in the

that had sprung up in India. That sense of unity must be maintained at all costs. We should avoid all narrow-mindedness and aim at co-ordinating all the cultures of the world in our system of national education. The spirit of culture was the life blood of a nation and should be embraced, no matter from what direction it came. If culture could conquer the people of India, communalism would vanish from this land.

All those who have the true interests of India at heart will agree with Professor Wadia that national unity demands the development of not any particular culture, but of a culture that would be common to the different communities and would be catholic in its spirit. But Professor Wadia's opposition of the use of vernaculars as the media of instruction on the ground that it would hinder national unity is not equally convincing. He argued that India, which was the land of many vernaculars, could not be a nation without a common language and that the only common language possible was English, which 'in course of 150 years had struck its roots deep into the soil of the country'. Hindi might be the common language in Northern India, but in his opinion the people of Southern India would find it as foreign as English—nay, more difficult to learn than English. This is not really true. The vernaculars of Southern India may be different from Hindi, but they do not differ from it so widely as they do from English, which in spite of its having 'struck its roots deep into the soil of the country' is still an alien language. But the fact is that Professor Wadia has entirely misunderstood the movement for 'vernacularising education'. The object of this movement is not to make any particular vernacular the medium of instruction in the whole of India, but to impart instruction through the mother-tongue of the people. So long as boys and girls in this country are compelled to acquire knowledge in a language which is not their own, our system of education

ample justice to our past history, national characteristics, ideals and aspirations and would become international by adapting itself to the world forces which were moving and shaping humanity. Finally, he made an eloquent and emphatic appeal to teachers to be true to the Indian ideal of a teacher, which he explained as a life of simple, unostentatious service and self-less devotion to duty, its highest ambition being to give and not to take. " If we suffer from the unjust economic valuation of our work," said he, "we must think of the ancient teachers who found themselves sufficiently recompensed by the knowledge which they imparted and the veneration in which they were held." At the same time, Mr. Sen pointed out that there was another side of the question. " If teachers represent," he stated, an important and powerful force in the organisation of natural activities, economic justice certainly demands that the teachers should be put out of actual want and that proper opportunities and environment should be created for the performance of their share of national work ". Mr. Sen then showed by facts and figures how the lot of teachers in England had been improved in recent years and expressed the hope that the example set by the British Parliament would be followed by all the provincial legislatures in India.

In his able Presidential address, Professor Wadia discussed many of the problems which are at present engaging the serious attention of educationists all over India. There was, however, one idea which dominated practically the whole of his address, and that was the idea of national unity. India, he said, was full of diversities—diversities of religion, language, culture and tradition—and she needed a system of education which could co-ordinate all these diversities. His interpretation of national education was a system of education that would foster unity. English education and Western culture were responsible for the new sense of unity

The Second Annual Conference of the All-India Federation of Teachers' Associations

BY

SYED ALI AKBAR, B. A. (CANTAB).

The All-India Federation of Teachers' Association was founded in 1925 with the two-fold object of co-ordinating the activities of the various Teachers' Associations in the whole of India and acting as a vehicle of representation on International Teachers' Conferences. The 2nd Annual Conference of the Federation was held in the Wheeler Senate House at Patna on the 29th and 30th December, 1926 and was attended by delegates from all parts of India.

The Conference was a great success, upon which the energetic Secretary of the Federation Mr. D. P. Khattry, Head-Master, Pirthi Nath High School, Cawnpore and Editor of *Education* deserves to be congratulated. It was presided over by Professor A. R. Wadia of the Mysore University. In his welcome address, Mr. D. N. Sen, Principal, B. N. College, Patna drew attention mainly to four points. He dealt at first with the duties of a teacher and said that the teacher's aim should be to develop the native powers of the child. Secondly, he emphasisted the need for an educational system that would provide for the training of students for the actual requirements of life and enable them, on the completion of their studies, to earn a livelihood. Thirdly, speaking about the insistent demand for nationalising education, he remarked that what was wanted was a national system of education which would do

The young aspirant is invited to a Dinner at which are ranged all the graybeards of All Souls', observantly watching the table-manners of the novice. It is a frequent trick to serve cherrytart in order to test the candidate in the difficult art of disposing of its nuts. The examination is thus not merely a test of memory and intelligence but of social demeanour. Our Dean of Christ Church, himself a Fellow of All Souls', was renowned for his proficiency in three allied subjects, theology, music, and claret. When an American visitor, struck with the magnitude of the library at All Souls', asked the College Porter whether the Fellows at All souls' had read all those weighty volumes, the Porter replied quietly: "Sir, they don't need to read them; they are gentlemen." This naive compliment is the final tribute to true scholarship.

The Art of Teaching.

" It is only by amusing oneself that one can learn. The whole art of teaching is only the art of awakening the natural curiosity of young minds for the purpose of satisfying it afterwards, and curiosity itself can be vivid and wholesome only in proportion as the mind is contented and happy. Those acquirements crammed by force into the minds of children simply block and stifle intelligence. In order that knowledge be properly digested it must have been swallowed with a good appetite. If the child were entrusted to my care I should make her not a learned woman, for I would look to her future happiness only-but a child full of light, intelligence and full of life in whom everything beautiful in art or nature would awaken some gentle responsive thrill. I would teach her to live in sympathy with all that is beautiful—comely landscapes, the ideal scenes of poetry—and history, the emotional charm of noble music. I would make—loveable to her everything I would wish her to love ".

ANATOLE FRANCE.

The quality of these examinations, however, stands on a plane altogether different from those in India. They are a test not merely of memory but of intelligence. The student is allowed a wide choice of questions; he is required to answer not more than five or six questions out of twenty-five or thirty; and instances are not wanting in which students have secured alphas by a brilliant answer to a single question. My Tutor used to tell me that the best way of getting a First Class in the Honour School of Modern History was to show that one had a knowledge of every other school; and the questions on history bordered on several other branches of learning—sociology, literature and even science. Even the character of the Civil Service examination has changed. In the old days it was the most tremendous feat of memory: success in it was as often a tribute to Wren's coaching institution as to a student's native intelligence. Since 1921, however, the examination has been brought more into line with the Schools at Oxford or the Tripos at Cambridge; and in order to correct the deficiencies of a purely written examination the viva voce test has been introduced. This viva voce Test, meant to test "the intelligence, alertness and general intellectual outlook" of students is carried out by the simple device of a conversation between the students and the examiners on general subjects for some fifteen or twenty minutes. My own viva turned on Irish Home Rule, the Indian States and the English Theatre.

The most remarkable of all examinations, however, is the one that admits you into that great fraternity of learning, All Soul's. All Souls' College, with its twin towers dating from the Middle Ages, is the exclusive abode of post-graduate scholars. A Fellowship at All Soul's is reckoned the consummation of scholarship. But, in order to obtain this Fellowship one has to prove one's proficiency not merely in history and the Classics but in table manners.

"If Alfred the Great were living at the present day, what would he have thought of our modern social and political problems?" Like a pistol shot came the reply: "If Alfred the Great were living at the present day, he would have been too old to take any interest in politics".

The Indian student, however, cannot afford to engage in a similar contest of wits with his examiner. The consequences are far too terrible. In the educational world of India examinations are

"the one far-off divine event
To which the whole creation moves."

They are the ultimate goal of examiners, the "open sesame" to public service, the final consummation of parental dreams. It is this fateful, sacrosanct character of Indian examinations that vitiates our whole educational system. It was different in our ancient Universities; it is still different in the Universities of Oxford and Cambridge. Leacock, a Professor as well as a humourist, remarked that all that a University Degree at Oxford means is that a man has lived at Oxford for three years and managed to keep out of jail. But it is that *life* at Oxford that counts—that magnificent, many-sided life with its respect for traditions blended with its freedom from conventions, its genuine love of scholarship combined with a splendid indifference towards examinations. Examinations, indeed, exist, but have little value as passports to Goverment employment. Successful students at Oxford and Cambridge—and it is difficult not to be successful—are arranged in four classes. The famous art critic, Clutton-Brock, defined them thus: "The First class", he said, "is excessive ostentation, the second is pretentious mediocrity, the fourth is obvious failure, while the third (which is what he himself got) is the golden mean". And if one is diffident of obtaining even a Fourth Class, all one has to do is to fall ill on the day previous to the examination, and obtain a degree known as the 'Aegrotat".

"The policy of Mohamad Toghlak is a tragedy of high intentions self-defeated. Criticise". If it is Aurangzeb, the question would run. "He had pitted his conscience against the world, and the world triumphed over it. Discuss." Such questions complete the confusion of the examinee. The poor bewildered student reads such questions with perturbation and proceeds to answer in the following strain. "Henry VIII", wrote a student quoted by Lord Curzon in "A Viceroy's Notebook", "was a good-looking man, he had a red beard, he was very well-proportioned, but he had a hot temper. He was very religious and he pulled down a great deal of churches and monasteries, he built colleges with them and schools with them too, the school he called Blue-Coat school, and a College called Oxford College. He turned the monks out who were rich once but had to go into the workhouse afterwards, he married Catharine of Arrogant for 20 years. He got to know Anne Beloyn; she waited on Katharine that is how he got to know her. Anne became a Queen and Catharine was sent away. She became religious and became a monk. Henry got to hear things about Anne, and she had her head cut off, though these things were not true for she had but a little neck. Henry was left a widow, but he soon got married again, this time it was to Jane Seymour. He liked Jane Seymour, she had a son a few days after she died. So Henry was a widow again, and he married another Anne—this time Anne Cleves. This Anne he did not like, for she was floundering mare, and not pretty. So he sent her away again and gave her some gold to live upon without him, while he got married to another Katharine Howard. She was not a very good wife, so Henry got to hear things again as he did before—so she had her head cut off, and he married Katharine Parr who looked after his bad legs".

Occasionally, however, the student gets the better of the examiner. When an Oxford undergraduate was asked:

Examinations.

BY

K. P. S. MENON, M. A., (OXON), I. C. S.

AMONG the many doubtful blessings of society may be reckoned vaccinators, tax-collectors, and examiners. All these personages have two characteristics in common: they are inevitable, and they are unpopular In fact some of them compete in unpopularity with the very evils they fight against, namely smallpox, poverty, and ignorance. The fact that society cannot do without them does not invest them with glamour. At best the general attitude towards them is one of sullen acquiescence; at worst open disdain. It is said that in Oxford a student of theology was asked by his examiner to prove his proficiency in the Bible by quoting a verse from it. "Judas went and hanged himself", quoted the student. "Quote another", said the Tutor. "Go and do thou like-wise", came the answer.

This story, more apt than authentic, illustrates the attitude of students towards examinations, especially in India. Examination has been defined as a preposterous attempt to fathom the depths of human ignorance. In India it becomes a tug-of-war between examiners and examinees. But the contest is uneven. Failure to pass an examination often means a blasted career, a ruined household and a broken matrimony. This, however, does not prevent examiners from investing examinations with all the attributes of mystery and terror. Directness and simplicity are ruled out of examination papers, and questions are couched in high-sounding, highly erudite and often ambiguous language. The examiner is not content with asking the student to discuss the policy of Mohamad Toghlak: he would rather ask,

felt and experienced and to give up relying on what has been already thought and experienced. His advice to teachers is that they should exercise the utmost care is selecting the subjects for essay-writing. They should avoid abstract themes and should ask the students to write on what has really happened to them. These remarks, in our opinion, apply with equal force to composition in other languages.

Benefits of Education.

" All that education can really give is this. It can supply the opportunities of self-culture, hold forth new standards and ideals to aim at. It can bring the budding mind into contact with the formed and mature mind, shed over the young spirit the inspiring glow of some rare and beautiful intelligence. It can open to the learner the door into the vestibule of the great library of the world's wisdom. It can show him a superior intellect in the art of collecting and distilling his materials. It can suggest, explain, correct and guide in a very general and occassional way ".

FREDERICK HARRISON.

The Teacher.

" A man may be a good teacher in the sense of stirring one up at the right moment and guiding one in the right direction and say nothing in lectures which remains by one. "

PROF : DICEY.

" How shall he (the teacher) give kindling in whose own inward man there is no live coal but all is burnt out to a dead grammatical cinder ? "

CARLYLE.

" The maintenance of world-peace will depend ultimately upon the school master and university professor. "

B. C. SARKAR.

opening of the new Commercial College, Lahore, on the advantages of vocational training, as against the purely academic type of education. Both are necessary, The purely academic is undoubtedly overdone in India, but Universities working along the lines of practical research as indicated by the Viceroy, might do much to harmonise the two ideals. This would tend to popularise other than the academic type of education by giving the University hall mark to it—not forgetting the much coveted degree, of course. With research and practical work united in our highest institutions there should come definite progress in industry, commerce, agriculture etc., for these things are the life blood of a nation, just as the "Humanities" are its heart and soul, and we cannot afford to neglect them.

We heartily welcome the *Osmania Magazine*, quarterly journal of the Osmania University, the first number of which has just come out. It is bilingual, though the size of the Urdu section is more than 4 times as big as that of the English section. The editors deserve to be congratulated on the excellent get-up of the magazine. With regard to the English section, we would suggest their securing, as far as possible, original articles in preference to the reprinting of matter which has already been published elsewhere.

English Composition.

The above number of the *Osmania Magazine* contains an article by Professor E. E. Speight entitled 'Notes on Writing English,' which is of special interest and value to teachers. He complains that too often compositions written by students in India have "little relation to the life of the writer, to the fulness of his personality, to the richer moments of his experience. Too rarely do they show trust in his own judgment or imaginative power". He then proceeds to advise students to write about what they have

It may be said that this would reduce the University to something more after the style of a Technical College, but reflection should convince us, that it is only in this way that the advance in research along lines of ultimate reality in all departments of life can be made. Otherwise we shall not be able to match the results of the highly technical and patient research of other nations, who encourage their schools and colleges and use them as laboratories of research for these high purposes adapted especially to their own particular needs and environment. A good instance of this is Denmark, with its admirable system of agricultural education. A recent statement of an English educational authority also emphasises this point: "On continuous cross-fertilization between the schools and colleges on the one hand, and the commerce, industry and agriculture on the other, must we depend for the vitality of the seeds of our future progress." This is surely the great need of India, so pre-eminently an industrial and agricultural country, and destined in the future to be even more so. The Viceroy suggests that Bombay may well become a centre for textile research, Patna for mining and geology, Calcutta for the humanities, and they are most appropriate and constructive suggestions.

Thus in a sense there already seem to be signs of the emergence of individuality in our University institutions. Our own Osmania University, for instance, appears to have a distinct individuality of its own, and though it is hard at present to say what will be the ultimate trend or emphasis. it will come in good time. It is particularly well situated for linguistic studies surrounded as it is by the numerous vernaculars of India.

It is interesting to note that about the same time that Lord Irwin was criticising the tendency to estimate University education by its commercial value, Sir Malcolm Hailey, Governor of the Punjab, was speaking at the

thoughts and actions in everyday life, which it is the principal function of a University to supply."

In these words the Viceroy has set forth the great ideal that should underlie all University education, and every educationalist and student may well ponder upon them. In the light of these ideals, Lord Irwin makes two criticisms on University education in this country. First, he condemns the very prevalent and wrong attitude, so common here, of rating University education as a kind of personal commercial investment, "a turnstile leading to the avenue of Government employment," which must inevitably bring disappointment to many, and second, he comments on the lack of individuality among Indian Universities as contrasted with the Universities of England and Scotland. The truth of his first criticism we all deplore, and can only hope that utterances like Lord Irwin's will help to dispel such a false valuation.

The Viceroy's second criticism provides much food for thought. Unity of ideal does not necessarily imply uniformity of expression, and the statement is as true of Universities as of anything else. "In England and Scotland each University has its own very definite individuality and each makes its own very special contribution to the sum total of knowledge and culture, *e. g.* Bristol for Agriculture, Edinburgh for Medical research etc., while Oxford and Cambridge are assets to the whole English speaking world." Not only may English Universities be adduced, but also the progress of University education in the British Colonies, where the Universities tend to reflect the needs and environment of the community in which they are situated. We find, for instance, in one case a particular emphasis on Engineering; in another it is Agriculture that is emphasised. Indeed if they are to be true to the name ***Universitas*** which is all embracing, they necessarily fail if they do not respond to and reflect changed conditions.

We publish elsewhere an article on "Examinations" from the pen of Mr. K. P. S. Menon, I. C. S., Under-Secretary to the Hon'ble the British Resident at Hyderabad. Mr. Menon is a distinguished graduate of the Oxford University and a brilliant member of the service to which he belongs. As Chairman of the Local Fund Committee, Residency Bazaars, Mr. Menon has done very useful work in improving the facilities for education in the Residency area. He has also been very popular with the students, and the lectures which he has delivered at the Nizam College at their request, have won him the reputation of being a delightful speaker. We are sure that after reading his article on " Examinations ", everybody will agree that he is a delightful writer also. Mr. Menon has recently received his transfer orders, and when he leaves Hyderabad, we assure him that he will carry with him the best wishes of all those here who have had anything to do with him.

University Education.

H. E. the Viceroy in his address at the recent Convocation of the Delhi University made some very pertinent remarks regarding University education in general, with particular reference to Indian University education as it had come under his own observation.

"At its highest a University is the embodiment of the desire of men to pursue the truth for truth's sake and thus to lay the foundations of real knowledge. Two of the principal qualities or faculties of human nature viewed in relation to other manifestations of life are this appreciation of knowledge and power of criticism. Each postulates a sense of ultimate truth, and each impossible without some standard of truth and judgment. This sense of ultimate truth is the intellectual counterpart of the aesthetic sense of perfect beauty, or the moral sense of perfect good, and it is this standard, influencing and appraising as it does our

of English public school life. It is to be a residential school open to all classes and creeds. The medium of instruction is to be English and the study of one of the Indian vernaculars along with an oriental classical language or a modern European language is to be compulsory. The head-master and the assistant masters will be in residence, so that they may be in close touch with the boys. A monthly fee of Rs. 125/- for each student payable for 12 months will be charged. It is estimated that Rs. 30 lakhs will be required for the construction of buildings and the constitution of an endowment fund. As soon as the amount is collected, some suitable place will be chosen and a start made.

Backed, as the appeal is, by many influential men all over India, we have no doubt that it will meet with a generous response from the public and ere long the first Public school in India will come into existence. But whether the object, which those who have issued the appeal have in view, will be realised or not will depend upon two factors—one, the quality, composition and outlook of the Board of Administration that will be constituted to run the school, and secondly, the personality of the Head-Master and the quality of the members of the staff. Apart from protecting the school from the manifold dangers that beset institutions that are managed by private bodies in India, precautions will have to be taken to guard it from degenerating into and becoming, on the one hand, another ornamental institution of the type of the schools where sons of the ruling chiefs receive their educatian at present, and on the other, a mere coaching institution for such examinations as are held for purposes of recruitment to certain services. It is only when the dangers pointed out above are guarded against that the projected school has a chance of becoming a centre of true culture and sound education.

---

to the valuable advice which he gave to students. He told them to remember that, on the completion of their studies, they were expected to render practical service to their ruler, country and fellow-men He also impressed on their minds the dignity of manual labour. "Only that person can be called 'educated' in the true sense of the word", he said "who regards all kinds of labour as honourable means of livelihood." We trust that our students will take the Maharaja Bahadur's advice to heart and that they will cease to look upon Government service as the only honourable means of earning an income. But at the same time, we are of opinion that there is need to open for them other channels of employment by developing the industries of the country and extending the facilities for training in those industries.

This is not the first time that Maharaja Sir Kishen Pershad Bahadur has given evidence of his keen interest in education. As far back as the year 1919, speaking at the annual dinner of the Nizam College Old Boys' Association, he had expressed the opinion that the hour had come for the introduction of compulsory Primary education in the Hyderabad state. We feel that the appointment of such an enlightened nobleman as President of the Executive Council augurs well for the future of education in Hyderabad, and we are confident that his tenure of office will be characterised not only by the fruition of his idea regarding compulsory Primary education, but by the inauguration of many other educational reforms.

A Public School for India.

An appeal signed by several leaders of Indian opinion has been issued for the establishment of a Public school in India. The Viceroy and many Ruling Princes have extended their sympathy to the project and a strong and influential committee to collect funds has been formed. The school is to reproduce in an Indian atmosphere some of the best features

The annual prize distribution of the Chadderghat High School, Hyderabad Deccan, was held on the 26th February, 1927 under the distinguished presidency of Maharaja Sir Kishen Pershad Bahadur, Yaminus Saltanath, G. C. I. E., President of the Hyderabad Executive Council. The function was a great success, upon which we congratulate the Principal, Mr. Marmaduke Pickthall, and his staff. The able and interesting report which Mr. Pickthall read on the occasion showed that in recent years the school had made good progress in numbers and efficiency and that it had achieved great success on the athletic side. Its most pressing need, he said, was the lack of a suitable building, and he hoped that this need would be supplied soon. While making a brief survey of the history of the school, Mr. Pickthall stated that the Chaderghat High school was the oldest institution in the Dominions. This claim is not true. The oldest institution in the state is the Darul Uloom, which was founded by the late Sir Salar Jung Bahadur in 1854. The Chaderghat High School did not come into existence till 1871. In 1875 it became an English High school, and in 1880 it was affiliated to the Madras University as a second grade college under the name of the Hyderabad College. In 1881 it was made a first grade college. Mr. Pickthall's further statement that the Nizam College was an offshoot of the Chaderghat High School is correct only in the sense that when in 1887 the Hyderabad College was abolished, its college classes were transferred to the Madrasae Aliya, which had been founded in 1878 and which now became a college with the appellation of the Nizam College.

Prize Distribution of the Chaderghat High School.

After distributing the prizes, and with his usual generosity, offering extra prizes, the Maharaja Bahadur made an illuminating speech in Urdu, the full text of which is published in our Urdu section. Here we should like to draw attention only

Maharaja Sir Kishen Pershad Bahadur's Advice to students.

Editorial Notes.

WE apologise for not being able to bring out the present number of the ***Hyderabad Teacher*** in time, but the delay was unavoidable partly on account of the reconstitution of our editorial staff and partly on account of Press difficulties.

The Rev. Father Paul Ryan.

The change in our editorial staff has occurred in consequence of the sudden return of the Rev. Father Paul Ryan to England. During his short stay of 18 months in Hyderabad, Father Ryan had done much to improve the efficiency of the All Saints' Institution, of which he was the Rector. He was also an ardent member of the Hyderabad Teachers' Association, and he had, by his self-less work, genial disposition and charming manners, endeared himself to all those members with whom he had come into contact. His departure is a great loss to the Association, and therefore to give expression to this sense of loss a meeting of the Central Executive Committee was held on the 12th February, 1927, at which the following resolution was passed unanimously:—

"The members of the Central Executive Committee of the Hyderabad Teachers' Association have learned with much regret the news that the Rev. Father Paul Ryan is going back to England and they take this opportunity of placing on record their deep appreciation of the valuable services rendered by him to the Association and to the cause of education in Hyderabad."

At the same time, the Central Executive Committee elected the Rev. F. C. Philip, M. A., Principal St. George's Grammar School and Mr. Ahmed Hussain Khan, B. A., Principal, Darululoom High School as members of the editorial staff.

ERRATA.

Page	150	From bottom	6th	line	" educatian " read " education. "
,,	151	,, ,,	5th	,,	" each impossible " read " each is impossible. "
,,	154	,, top	15th	,,	" quarterly " read " a quarterly "
,,	161	,, bottom	7th	,,	"emphasisted" read "emphasised"
,,	162	,, top	16th	,,	" natural " read " national "
,,	168	,, bottom	7th	,,	" Adulte duca- " read " Adult educa- "
,,	186	,, top	20th	,,	" attendding " read " attending. "
,,	194	,, bottom	4th	,,	" effcetive " read " effective. "
,,	194	,, top	9th	,,	" at " read " after "
,,	197	,, bottom	3rd	,,	" same " read " some "
,,	202	Last line " returned " read " returned to "			
,,	205	From bottom	5th	line	" one " read " one's."
,,	210	,, ,,	2nd	,,	" Oslando " read " Orlando " ; " Fredrick " read " Frederick. "
,,	210	,, ,,	15th	,,	" does " read " did. "
,,	211	First line "by articulation" read "by better articulation."			

THE HYDERABAD TEACHER.

CONTENTS.

Hyderabad Teacher

ADVERTISEMENT RATES.

Space	Whole year			6 months			Per issue		
	Rs.	A.	P.	Rs.	A.	P.	Rs.	A.	P.
Full page	10	0	0	5	8	0	3	0	0
Half page	5	0	0	2	12	0	1	8	0
Quarter page	2	8	0	1	6	0	0	12	0
Per line	0	10	0	0	8	0	0	6	0

SUBSCRIPTION RATES.

O. S. R. 3 including postage for the Nizam's Dominions annualy.

B. G. Rs. 3 do do British India annually.

O. S. 12 As. excluding postage for the Nizam's Dominions per single coppy.

B. G. 12 As. do do British India do

Regtd. Asafia No. 47.

Vol. I.] March 1927 A. D. / Ardibehist 1336 Fasli. [No. 4.

Under the Patronage of

Nawab Masood Jung Bahadur, B.A. (Oxon.),

Director of Public Instruction.

The Hyderabad Teacher

Quarterly Magazine of The Teachers' Association Hyderabad-Deccan.

SECUNDERABAD-DECCAN

PRINTED AT THE EXCELSIOR PRESS, SECUNDERABAD.

1927.

کتب خانہ جامعہ عثمانیہ